

کلیات آغا حشر کاشمیری

4

(یہودی کی لڑکی، ترکی حور، رستم سہراب)

مرتبین
آغا جمیل کاشمیری
یعقوب یاور



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومت ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر کے پورم، نئی دہلی 110 066

کلیات آغا حشر کاشمیری

4

(یہودی کی لڑکی، ترکی حور، رستم سہراب)

مرتبین
آغا جمیل کاشمیری
یعقوب یادگار



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومت ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر کے پورم، نئی دہلی 110 066

Kulliyat-e Agha Hashr Kashmiri-4

Edited by : Agha Jameel Kashmiri

&

Yaqoob Yawar

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : اپریل، جون 2004 شک 1926

1100 پہلا ایڈیشن :

137/- قیمت :

1161 سلسلہ مطبوعات :

ISBN: 81-7587-059-1

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر کے پورم، نئی دہلی 110066

طابع: لاہوری پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی ملّز اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کما حقہ واقفیت بھی نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت قدیم اور جدید مہد کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہل فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے بلکہ زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہد حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیات آغا حشر کاشمیری اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر

فہرست

7	دیباچہ
21	1- یہودی کی لڑکی
119	2- ترکی حور
247	3- رستم سہراب

دیباچہ

ڈرامے کا تعلق تھیل اور نقالی سے ہے یہی سبب ہے کہ اس کے ابتدائی نمونے ان علاقوں میں ملتے ہیں جہاں بت پرستی عام تھی ہندوستان اور یونان ایسے ہی خطے ہیں لیکن ان دونوں علاقوں میں ڈرامے کی روایت انفرادی طور پر پروان چڑھی۔ آگے چل کر جب دونوں میں تہذیبی روابط استوار ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔ ہندوستان میں کالی داس کے ڈراموں کی فکری و فنی بلندی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ایک صدی قبل مسیح سے کافی پہلے ہوئی ہوگی۔ بدھ اقتدار میں آئے تو انھوں نے بھی اسے اپنے عقائد کی ترویج کے لیے مفید پایا۔ رفتہ رفتہ مختلف ناکم منڈلیاں وجود میں آئیں جنھوں نے اس کی شکل ایسی بدلی کہ اس کا تعلق سماج کے نچلے طبقے سے رہ گیا۔

مسلمان ہندوستان آئے تو ان کا سابقہ ڈرامے کی اسی شکل سے پڑا۔ اول تو ان کا عقیدہ ایسی چیزوں کی سرپرستی کی اجازت نہیں دیتا تھا دوسرے اس عہد میں ڈرامے شرفا کے معیار پسند سے بچنے کی چیز ہو گئے تھے۔ اس لیے اس فن کی خاطر خواہ ترقی نہ ہو سکی۔ البتہ شاہان اودھ کے آخری دور میں اس جانب توجہ دی گئی اور یہی اردو ڈرامے کے آغاز کا زمانہ ہے، جب سید آغا حسن امانت لکھنوی نے اندر سہا کی تخلیق کی جسے اسٹیج پر بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس عہد میں امانت کی نقل میں متعدد اندر سہائیں لکھی گئی۔ حتیٰ کہ یہ لفظ ڈرامے کے متبادل کے طور پر استعمال

ہونے لگا۔ یہ اندر سبائیں ملک کے مختلف حصوں میں اسٹیج کی گئیں۔

اسی زمانے میں عروس البلاد بمبئی میں بھی اردو ڈراموں کی جانب لوگوں کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ یہاں کی روایت کا سلسلہ اودھ کے بجائے انگریزی اور مراٹھی اسٹیج سے جڑا ہوا تھا۔ لوگوں کی غیر معمولی دلچسپی نے اسے ایک منافع بخش کاروبار کی شکل دے دی تھی۔ کاروبار کی مسابقت نے اسے پھیلنے، پھولنے اور نکھرنے کے وافر مواقع فراہم کئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اردو ڈراموں کے افق پر آغا حشر کاشمیری نمودار ہوئے۔

آغا حشر کی پیدائش بنارس میں 4/3 اپریل 1879 کی درمیانی شب میں ہوئی۔ ان کے اجداد کا تعلق ان کے والد آغا غنی شاہ تک کشمیر سے قائم رہا لیکن خود آغا حشر کا راست تعلق کشمیر سے نہیں تھا۔ والدین نے ان کا نام آغا محمد شاہ رکھا لیکن بعد میں انھیں شہرت آغا حشر کاشمیری کے نام سے ملی۔

جیسا کہ ان دنوں شرقا کے گھروں میں رواج تھا، آغا حشر کو عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم مولوی حافظ عبد الصمد نے دی جو اس زمانے کے مشہور معلم تھے۔ آغا صاحب کے والد انھیں عالم دین بنانا چاہتے تھے لیکن خود آغا حشر کو انگریزی تعلیم سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ خاندان کے بعض افراد کے اصرار پر ان کا داخلہ بے زائن اسکول میں کرا دیا گیا، جہاں انھوں نے درجہ چھ تک تعلیم حاصل کی۔ جب تک وہ اس اسکول میں زیر تعلیم رہے، اپنی ذہانت سے اپنے اساتذہ کا دل جیتتے رہے۔ اسی زمانے میں انھیں شاعری کا شوق ہوا اور وہ فارسی اور اردو میں شعر کہنے لگے۔

زمانہ طالب علمی میں ہی آغا حشر کو ڈرامے سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ اپنے ہم جماعتوں کو ساتھ لے کر اسکول سے متصل قبرستان میں چادریں تان کر اندر سبھا اسٹیج کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں جبل تعمیر ٹیکل کمپنی بنارس آئی۔ طلب علموں کو رعایتی دامنوں پر ٹکٹ فراہم کرنے سے انکار پر آغا حشر نے رفیع الاخبار میں اس کمپنی کے ڈراموں پر شدید نکتہ چینی کی۔

کپہنی کی طرف سے اس کا جواب شائع ہوا تو آغا حشر نے اور شدت سے حملہ کیا۔ اس اخبار بازی سے بچنے کے لیے کپہنی کے مالکوں نے حشر کو مفت ڈراما دیکھنے کی دعوت دے کر مصالحت کر لی اس طرح نہ صرف آغا حشر کو ڈراما دیکھنے کا موقع ملنے لگا بلکہ کپہنی کے ڈائریکٹر امرت لال اور ڈراما نویس مہدی حسن احسن لکھنوی سے بھی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک دن کسی بات پر احسن صاحب سے بحث ہو گئی جس کے دوران حشر نے ان سے کہہ دیا کہ جیسا ڈراما آپ لکھتے ہیں، میں ایک ہفتے میں لکھ سکتا ہوں۔ احسن صاحب جیسے پختہ کار کے سامنے ایک نوجوان کا یہ دعویٰ تعلیٰ کے مترادف تھا تاہم اسے نبھانے کے لیے آغا حشر نے نہ صرف ڈراما ”آفتاب محبت“ لکھا بلکہ دوستوں کا ایک کلب بنا کر اسے اسٹیج بھی کر دکھایا۔ یہی آغا حشر کا پہلا ڈرامہ ہے جو 1897ء میں جواہر اکسیر پریس، بنارس میں چھپ کر شائع ہوا۔

ایک طرف آغا حشر کی دلچسپیوں کا یہ حال تھا، دوسری طرف ان کے والد آبائی کاروبار میں ان کی دلچسپی نہ دیکھ کر ان کے مستقبل کی طرف سے فکر مند تھے۔ چنانچہ کافی غور و فکر کے بعد انھوں نے اپنے رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے بنارس میں میونسپل بورڈ میں ان کے لیے ایک معقول ملازمت کا انتظام کر دیا۔ اس ملازمت کے لیے کچھ زر ضمانت مطلوب تھا۔ آغا غنی شاہ بیٹے کو ساتھ لے کر میونسپلٹی گئے لیکن کسی ضروری کام کی وجہ سے مطلوبہ رقم آغا حشر کے حوالے کر کے گھر چلے آئے۔ اتفاقاً کوئی ایسی صورت پیش آئی کہ یہ رقم اس دن میونسپلٹی کے خزانے میں جمع نہ ہو سکی۔ جب آغا حشر گھر لوٹ رہے تھے تو راستے میں انھیں کچھ دوست مل گئے جن کی خاطر مدارات میں اچھی خاصی رقم خرچ ہو گئی اس کے بعد والد کی جواب طلبی کے خوف سے ان کا رخ گھر کے بجائے اسٹیشن کی جانب مڑ گیا اور وہ بمبئی جا پہنچے۔

بمبئی آغا حشر کے لیے نئی جگہ تھی۔ ان کے علم میں تھا کہ ان کے ایک دوست عبداللہ بمبئی میں رہتے ہیں۔ وہ انہی کے پاس پہنچے اور ان کے ساتھ رہنے

لگے۔ عبداللہ شاعری کے دلدادہ تھے۔ اتفاق سے اسی دن بمبئی میں کوئی مشاعرہ تھا۔ وہ آغا حشر کو لے کر اس میں شریک ہوئے۔ یہاں کسی بات پر بمبئی بیچ کے ایڈیٹر مولوی فرخ سے ان کی جھڑپ ہوگئی۔ اور یہ جھگڑا بمبئی بیچ کے صفحات تک آگیا۔ اس طرح آغا حشر شہر کے ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے ایک دوست کے اصرار پر وہ الفریڈ کمپنی کے مالک کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ سے ملے۔ کاؤس جی اس وقت چائے پی رہے تھے۔ حشر نے ان کے حسب فرمائش چائے پر ایک فی البدیہ نظم کہہ کر سنائی۔ اس کے بعد انھوں نے حشر کو دوسرے دن ملنے کے لیے کہا۔ حشر یہ سمجھے کہ کاؤس جی نے انھیں بڑے سلیقے کے ساتھ ٹال دیا ہے۔ یہ غلط فہمی دور ہونے کے بعد جب وہ کاؤس جی سے ملے تو انھیں الفریڈ کمپنی میں ڈراما نویس کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا اور ۳۵ روپیہ ماہانہ مشاہرہ ملے ہوا۔ اس کمپنی کے لیے انھوں نے سب سے پہلے مرید شک (1899) لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس کے چند ماہ بعد مار آستین (1899) تصنیف کیا۔ اس ڈرامے کو بھی اسٹیج پر غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

حشر کی مقبولیت بڑی تو مختلف ڈراما کمپنیوں کی طرف سے انھیں ملازمت کی پیش کش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر نو روز بی پری کی کمپنی کی ملازمت قبول کر لی۔ یہاں انھوں نے اسیر حرص 1901 لکھا۔ یہ ڈراما بھی بے حد پسند کیا گیا۔ حشر کی اس روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر کاؤس جی کھٹاؤ نے انھیں دو بارہ ساڑھے تین سو روپے ماہانہ پر اپنے یہاں بلا لیا۔ اس بار اُن کی کمپنی کے لیے انھوں نے شہید ناز 1902 لکھا جو حسب روایت کافی مقبول ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے اڈیسر بھائی ٹھوٹھی کی کمپنی کے لیے 1906 میں سفید خون اور 1907 میں صید ہوس اور سہراب جی اُگرا کی کمپنی کے لیے 1908 میں خواب ہستی اور 1909 میں خوبصورت بلا ڈرامے لکھے جنھیں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

ڈراما نویس کے طور پر بے حد مقبول ہونے کے باوجود آغا حشر اپنی موجودہ

حیثیت سے ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھے۔ انھیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی کہ مالکان کمپنی ان کی تحریروں میں اپنی صوابدید کے مطابق تحریف اور کاٹ چھانٹ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حیدر آباد کے ایک تعلقہ دار کے اشتراک سے 1909 میں انھوں نے دی گریٹ افریڈ تھیزریکل کمپنی آف حیدرآباد کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے سہراب جی آگرا کی کمپنی کے لیے لکھا گیا ڈرامہ خوبصورت بلا اسٹیج کیا۔ اس کے بعد اگلے سال 1910 میں اپنا پہلا مجلسی ڈرامہ سلور کنگ عرف نیک پروین لکھ کر پیش کیا۔ اسی سال یہودی کی لڑکی عرف مشرقی حور بھی اس کمپنی کے اسٹیج پر دکھایا گیا۔ حیدرآباد میں مقبولیت کے ڈکے بجانے کے بعد یہ کمپنی سورت ہوتی ہوئی بمبئی پہنچی اور یہیں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد آغا حشر نے 1912 میں جالندھر کے بھائی گیان سنگھ کی نو تشکیل کمپنی میں پانچ سو روپے ماہ وار پر ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ لیکن جلد ہی امرتسر میں یہ کمپنی بھی بند ہو گئی۔

1913 میں آغا حشر نے اپنے ڈراموں کی اداکارہ حور بانو سے لاہور میں شادی کر لی۔ اسی زمانے میں انھیں دہلی میں ایک عوامی استقبالیہ دیا گیا جس میں انھیں انڈین ٹیکسپر کے خطاب سے نوازا گیا۔ لاہور پہنچ کر انھوں نے اپنی دوسری کمپنی انڈین ٹیکسپر تھیزریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ یہ کمپنی مختلف شہروں کا دورہ کرتی ہوئی کلکتہ پہنچی۔ یہاں آغا حشر ریلوے پلیٹ فارم سے نیچے گر گئے جس کے نتیجے میں ان کے دائیں پیر کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ چنانچہ انھیں کافی عرصے اسپتال میں رہنا پڑا۔ اسی علالت کے دوران انھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا پہلا ہندی ڈرامہ بھگت سور داس عرف بلوا منگل 1914 لکھوایا جو ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کی ہدایت میں پہلی بار اسٹیج ہوا۔ اس کے بعد کمپنی کمرگ پور، مظفر پور اور پٹنہ ہوتی ہوئی بنارس آئی۔ قیام بنارس کے دوران آغا حشر کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جو صرف تین ماہ زندہ رہ کر لکھنؤ میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ کمپنی یوپی اور پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتی ہوئی لاہور ہوتے ہوئے سیالکوٹ پہنچی۔ یہاں آغا حشر اپنی زندگی کے ایک اور بڑے حادثے سے ہم کنار ہوئے۔ ان کی اہلیہ جن کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی ایک طویل علالت کے بعد

1918 میں لاہور میں انتقال کر گئیں۔ شریک حیات کی اس مفارقت نے آغا صاحب پر کچھ ایسے نفسیاتی اثرات مرتب کئے کہ وہ کہنی کا سارا سامان سیالکوٹ میں چھوڑ کر بتارس چلے آئے۔ اور بہت دنوں تک یہیں آرام کرتے رہے۔ بعد ازاں وہ رستم جی کی دعوت پر کلکتہ گئے اور جے ایف ٹنٹس کہنی میں ایک ہزار روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ اس کہنی کے لیے انھوں نے مشرقی ستارہ عرف شیر کی گرج لکھا (1918) چونکہ کلکتہ کے مارواڑی عوام ہندی ڈراموں کے شوقین تھے، اس لیے آغا حشر نے اس زمانے میں بطور خاص ہندی میں لکھنا شروع کیا اور مدھر مرلی (1919) بھارت رمنی (1920) ہلکیر تھ لنگا (1920) ایوم پراجن اور نوین بھارت (1921) جیسے ڈرامے لکھے اس کے بعد اردو میں ترکی حور (1922) اور ہندی میں سنسار چکر عرف پہلا پیار (1922) لکھا۔ اسی زمانے میں کلکتہ کی اشار تھیزیکل کہنی کے لیے انھوں نے بگلہ زبان میں اپرادی کے (1922) اور مصر کمادی (1922) بھی لکھے۔ اسی کے ساتھ (1919 اور 1923 کے درمیان انھوں نے ٹنٹس کہنی کی خاموش فلموں میں اپنی اداکاری کے فن کا بھی مظاہرہ کیا۔ ٹنٹس کے لیے انھوں نے ترکی حور اور سنسار چکر عرف پہلا پیار کے بعد بھیشم پرتیما (1923) اور آکھ کا نشہ (1924) لکھے جنہیں زبردست عوامی مقبولیت ملی۔

شہرت اور مقبولیت کی اس بلندی پر پہنچنے کے بعد آغا حشر کے دل میں ایک بار پھر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی کہنی قائم کریں۔ چنانچہ 1925 میں بتارس میں دی گریٹ الفرڈ تھیزیکل کہنی آف کلکتہ کی بنیاد پڑی۔ اسے لے کر آغا حشر دورے پر نکلے۔ یہ کہنی جب بہار اور یوپی کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتی ہوئی الہ آباد پہنچی تو مہاراجہ جہکھاری نے جو ان دنوں الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ آغا حشر سے سیتا بن داس کے موضوع پر ہندی میں ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ آغا حشر نے وعدہ کر لیا اور بتارس آکر اس ڈرامے کی تکمیل کی (1928) یہ ڈراما مہاراجہ کو بے حد پسند آیا چنانچہ انھوں نے اسے آٹھ ہزار روپے خرید لیا اور آغا صاحب کو مع اپنی کہنی کے جہکھاری آنے کی دعوت دی۔ وہاں انھوں نے نہ صرف آغا حشر کی

شاگردی اختیار کی بلکہ پچاس ہزار روپے کی گراں قدر رقم کے عوض ان کی کمپنی بھی خرید لی اور آغا صاحب کو ہی اس کا نگران مقرر کر دیا۔ یہاں سیتا بن واس کا پہلا دیوانگری ایڈیشن جس کی تعداد اشاعت صرف دو جلد تھی (ایک آغا حشر کے لیے اور ایک مہاراجہ چکھاری کے لیے) دس پریس چکھاری سے مئی 1929 میں شائع ہوا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد کسی بات پر خوش ہو کر مہاراجہ نے کمپنی آغا حشر کو واپس لوٹا دی اور وہیں سے یہ معمول کے دورے پر کانپور کے لیے روانہ ہو گئی۔

اسی درمیان مڈلس تھیرز لینڈ نے آغا صاحب کو کلکتے بلایا۔ چنانچہ وہ کمپنی کو آغا محمود شاہ کے حوالے کر کے کانپور ہی سے کلکتے چلے گئے۔ وہاں رہ کر انھوں نے مڈلس کی بمبئی شاخ دی امپیریل تھیریکل کمپنی آف بائیس کے لیے اردو میں رستم سہراب (1929) لکھا جو اسی سال اسٹیج کیا گیا۔ اس کے علاوہ کلکتے میں قیام کے اس زمانے میں انھوں نے مڈلس کے لیے ہندی کے تین ڈرامے دھری بالک عرف غریب کی دنیا (1929) بھارتی بالک عرف سماج کا دکار (1930) اور دل کی پیاس (1931) لکھے جو ہندی ڈرامے کی روایت میں ایک گراں قدر بلکہ انقلاب آفریں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آغا حشر نے 1931 میں مڈلس کی ملازمت چھوڑ دی اور بنارس آگئے۔ یہاں ان کے جہر میں چوٹ آگئی۔ دسکی دواؤں سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو وہ علاج کے غرض سے کلکتے پہنچے۔ اس درمیان وہ اور بھی کئی امراض میں مبتلا ہو گئے تھے چنانچہ ماہر امراض قلب ڈاکٹر سنیل بوس کا علاج شروع ہوا۔ یہ دور سخت پرہیز کا تھا۔ ان دنوں کلکتے میں بولتی فلموں کا رواج بڑھ رہا تھا۔ مڈلس تھیرز کے مینجنگ ڈائریکٹر فرام جی نے جو پانچ فلم کمپنی کے مالک بھی تھے، آغا حشر سے فلمی ڈرامہ لکھنے کی فرمائش کی۔ آغا صاحب نے ان کے لیے شیریں فرہاد لکھا جس میں ماسٹر ٹار اور مس کچن نے بنیادی کردار ادا کیے۔ اس فلم کی مقبولیت نے دوسری فلم کمپنیوں کو آغا حشر کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ چاروں طرف سے فرمائشوں کی یلغار ہونے لگی جن کی تعمیل میں انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے فلمی ڈراما عورت کا پیار لکھا جو کافی مقبول

ہوا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے فرام جی کے لیے مزید دو ڈرامے دل کی آگ (1931) اور شہید فرض (1931) لکھے جو مختلف وجوہ سے قلمائے نہیں جا سکے۔ ان کے علاوہ نیو تھیٹرز کے لیے یہودی کی لڑکی اور چنڈی داس ڈرامے لکھے ان کا تیار شدہ فلمیں کافی مقبول ہوئیں۔ اسی دوران ہڈنس نے بھگت سورتاس (1914) شرون کمار (1931) اور آنکھ کا نشہ (1924) پر ہندی میں اور ترکی حور (1922) اور قسمت کا شکار پر اردو میں فلمیں بنائیں جنھیں عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

آغا حشر کی بیماری کا سلسلہ دیرے دیرے طول پکڑتا جا رہا تھا لیکن وہ حوصلہ ہارنے والے شخص نہ تھے۔ اسی عالم میں انھوں نے 1934 میں اپنی فلم کمپنی بنائی اور رستم سہراب کو قلمانے کا ارادہ کیا۔ کرداروں کا انتخاب ہونے کے بعد ریہرسل ہو رہی تھی کہ ایک مقدمے کے سلسلے میں انھیں لاہور جانا پڑا۔ یہاں انھوں نے اپنے دوست حکیم فقیر محمد چشتی کا علاج شروع کیا اور یہیں چند دوستوں کے مشورے پر حشر کلچرز کی بنیاد ڈال کر بھیشم پٹامہ کی شوٹنگ شروع کر دی۔ اس سلسلے میں انھیں کئی بار جموں اور سری نگر کا سفر بھی کرنا پڑا۔ اس مسلسل تک دود نے ان کی صحت پر مزید برا اثر ڈالا اور مصروفیات کے سبب حکیم صاحب کا علاج بھی باقاعدگی سے جاری نہ رہ سکا۔ چنانچہ اسی بیماری میں 28 اپریل 1935 کو شام کے چھ بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ حکیم فقیر محمد چشتی نے آغا محمود شاہ کو لکھتے فون کر کے ان سے لاہور ہی میں تدفین کی اجازت لے لی اور آغا صاحب مرحوم کی وصیت کے مطابق اگلے دن یعنی ۲۹ اپریل کو دن میں میانی صاحب کے قبرستان چار برجی میں انھیں ان کی اہلیہ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس کلیات میں شامل ڈراموں کے مطالعے سے پہلے مندرجہ ذیل بنیادی باتوں کا جان لینا ضروری ہے تاکہ دوران مطالعہ پیدا ہونے والے سوالات کا تسفی بخش جواب مل سکے۔

۱۔ 'مار آستین' (1899) آغا حشر کا واحد ڈراما ہے جسے بہ ظاہر انھوں نے

اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنا کوئی ڈراما اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ برجستہ مکالمات بولتے جاتے تھے اور بہ یک وقت کئی غشی انھیں قلم بند کرتے رہتے تھے۔ منشیوں کے لکھے ہوئے ان مسودوں کو وہ شاید ہمیشہ دیکھتے بھی نہیں تھے۔ اور ان منشیوں کی اردو بس واجبی سی تھی اور املا ناقص۔ چنانچہ ان مسودوں میں جگہ جگہ املا کی غلطیاں موجود ہیں، جنہیں مرتبین نے درست کیا ہے۔ آغا حشر کی نظر میں ان مسودوں کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ حکومت کی طرف سے سسر کے لیے مقرر حاکم مجاز کہانی کو سمجھ لے کہ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے اور کردار ادا کرنے والے ایکٹر ان کی مدد سے اپنے مکالمے یاد کر لیں۔ انھوں نے ان مسودوں کی تیاری کے دوران کبھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ ان کا استعمال انھیں شائع کرنے کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ آغا حشر چونکہ اپنے بیش تر ڈراموں کے ہدایت کار بھی خود ہی ہوتے تھے اس لیے اکثر حالات میں انھیں مسودوں میں ہدایات اور مناظر کی تفصیل تحریر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ جن ڈراموں میں ہدایات موجود نہ تھیں، ان میں مرتبین نے ان کا اضافہ کیا ہے۔ جہاں ایسا کیا گیا ہے، اس کی نشان دہی کردی گئی ہے۔

۳۔ ایک ہی ڈرامے کے ایک سے زائد مسودے موجود ہونے کا سبب یہ ہے کہ کسی بھی شہر یا ریاست میں ڈراما اسٹیج کرنے سے پہلے اس شہر یا ریاست کے حاکم مجاز سے اسے سسر کرانا ضروری ہوتا تھا۔ اس غرض سے ہر بار ڈرامے کی نئی نقل تیار کر کے حکام کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ جہاں سے مسودے پر checked and found nothing objectionable کا نوٹ لکھوا لینے کے بعد ہی اسے اسٹیج کیا جاسکتا تھا۔ بیش تر مسودوں پر یہ نوٹ موجود ہے۔

۴۔ عوامی مقبولیت حاصل کر لینے والے کسی ڈرامے کے چند شکمل ہو جانے کے

بعد اس میں نیا پن پیدا کرنے اور ناظرین کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کی غرض سے اس میں کبھی بعض نئے مناظر جوڑ دیے جاتے تھے اور کبھی بعض مناظر نکال دیے جاتے تھے۔ ان مناظر کو ڈرامے سے نکال دینے کا سبب ان کی خامیاں یا کمزوریاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایسا محض تبدیلی یا نیا پن پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ آغا حشر کبھی یہ کام ڈراما کہنیوں کے مالکان کی فرمائش پر کرتے تھے اور کبھی اپنے طور پر۔ اپنے طور پر عموماً اس وقت جب وہ خود ہی کہنی کے مالک بھی ہوتے تھے۔

۵۔ آغا حشر کا مرکز نگاہ (Target) وہ عام لوگ تھے جو اپنا پیسہ خرچ کر کے ان کے ڈرامے دیکھنے آتے تھے، وہ نہیں جو ادب کو فن لطیف کی حیثیت سے قبول کر کے اپنے اپنے گمروں میں اس کا لطف لینے کے عادی تھے۔ ڈراموں کی تخلیق کے دوران ادب ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے ان کی پوری توجہ ڈرامے کو دیکھے جانے اور ان ناخواندہ اور کم سواد ناظرین کے نقطہ نظر سے پسندیدہ اور دلچسپ بنانے پر صرف ہوتی تھی، جن کے لیے یہ ایک سہل الحصول اور سستا وسیلہ تفریح تھا۔ شعر و سخن کے شائقین اور ادب کے سنجیدہ قارئین کی خاطر اس کی ٹوک پلک سنوارنے سے انھیں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ تھیٹر دیکھنے آنے والوں کی اکثریت پہلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور انہی کی پسند پر مالی اعتبار سے کسی ڈرامے کی کامیابی کا دار و مدار ہوتا تھا۔ ناقدین کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ ڈراموں میں اپنی بھرپور ادبی صلاحیت کا استعمال نہیں کر سکے۔

۶۔ اکثر ایک ہی ڈرامے کے دو مسودوں میں کرداروں کے نام بدلے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات کرداروں کے ناموں کے ساتھ ساتھ مقامات کے نام بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ’آنکھ کا نشہ‘ (1924) کے ایک مسودے میں کردار کالی داس، گوری ناتھ، سوہن اور کاٹنی ہیں۔ اس کا پس منظر بنارس ہے۔ جب کہ اسی ڈرامے کے ایک دوسرے مسودے میں

کرداروں کے نام جمل کشور، بنی پرساد، مادھو اور کام لا ہیں اور اس کا پس منظر کلکتہ ہے۔ ان صورتوں میں مرتبین نے بعد میں لکھے جانے والے مسودوں کو بنیاد بنایا ہے۔

۷۔ کلیات کی ترتیب میں مسودوں میں مستعمل قدیم املا کو جدید املا میں بدل دیا گیا ہے۔

۸۔ ایک ڈرامے کے ایک سے زائد ناموں سے موسوم ہونے کا سبب یہ ہے کہ آغا حشر ڈرامے میں معمولی تبدیلیاں پیدا کر کے عوام کو باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ ڈراما اس ڈرامے سے مختلف ہے جو وہ پہلے کسی اور نام سے دیکھ چکے ہیں۔ تاکہ وہ لوگ بھی اسے دوبارہ دیکھنے آئیں جو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اس طرح کی تبدیلی صرف آغا حشر نے نہیں کی ہے بلکہ اس مہم کی تمام ڈراما کمپنیاں بھی کرتی تھیں۔

۹۔ آغا حشر کی ہندی اپنے معاصر اردو فن کاروں کے مقابلے میں کافی بہتر تھی۔ لیکن اردو ان کی فطری اور مادری زبان تھی۔ چنانچہ ان کے ہندی ڈراموں کو پڑھتے وقت بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہندی میں مکالمے لکھواتے لکھواتے ایک بہ یک اردو بولنے لگتے تھے۔ پھر جیسے ہی انھیں خیال آتا تھا کہ جو ڈراما لکھوایا جا رہا ہے وہ اردو میں نہیں ہندی میں ہے تو وہ پھر ہندی کی طرف آجاتے تھے۔ لیکن یا تو اپنی عدم فرصتی کے باعث یا محض تسال کی بنا پر اتنی اردو رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ وہ مکمل ڈراما پہلے اردو میں لکھاتے رہے ہوں گے اور بعد میں اس کا ہندی میں ترجمہ کرتے ہوں گے۔ اس کا امکان کم ہے کیوں کہ ایسا ہوتا تو بے خیالی میں جہاں وہ فارسی آمیز اردو لکھوا گئے ہیں اسے درست ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے غالب امکان اسی بات کا ہی ہے کہ وہ فی البدیہہ اور براہ راست ہندی میں ہی ڈراما لکھواتے تھے۔ یہ بات تو اب سب ہی جانتے ہیں کہ وہ ڈرامے ٹہل ٹہل کر خشیوں کو لکھوایا

کرتے تھے۔

۱۰۔ آغا حشر کے ڈرامے بلا اجازت چھاپنے والے پبلشروں نے ان ڈراموں کے ساتھ بڑی بدسلوکی کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ جو مکالمے یا حصے ان کی سمجھ میں نہیں آئے، ان کو اپنی طرف سے لکھ دیا ہے بلکہ اکثر ان کے ہندی ڈراموں کو کسی اچھے ہندی جاننے والے سے مشکل اور سنسکرت آمیز ہندی میں منتقل کروا کر چھاپا ہے۔ اس تعلق سے بنارس کے ٹھاکر پرساد اینڈ سنز کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو آغا حشر کی ناک کے نیچے یہ کام دھڑلے سے کر رہے تھے۔ آغا حشر نے ذاتی طور پر کبھی اس جانب توجہ نہیں دی۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آغا حشر کے جعلی ایڈیشن چھاپنے والے پبلشرز اپنے منشیوں کو آغا حشر کے لکھے ڈرامے دیکھنے کے لیے بھیجا کرتے تھے، جہاں سے وہ اس کے مکالمات نوٹ کر لاتے تھے۔ یہ کام ایک ساتھ ایک سے زائد منشیوں سے کروایا جاتا تھا۔ بعد میں ان کی تحریروں کو ترتیب دے کر اور جو حصے ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے ان میں حسب ضرورت اصلاح کر کے یا انھیں اپنی طرف سے ازسرنو لکھ کر ڈراما شائع کر دیا جاتا تھا۔ اصلاح و ترمیم کا یہ کام عموماً وہی منشی انجام دیتے تھے جنھیں نمائش کے دوران ان ڈراموں کی نقل کے کام پر مامور کیا جاتا تھا۔

۱۱۔ آغا حشر نے اپنے ہندی ڈراموں کے لیے جو گانے لکھے ہیں ان میں بیش تر فارسی وزن اور بحروں کا استعمال کیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں انھوں نے لوک گیتوں، دھوئیں یا موسیقی کی لوک دھنوں کو اپنایا ہے وہاں فطری طور پر عروسی ڈھانچہ بھی ہندوستانی ہو گیا ہے۔ انھوں نے بعض ہندی الفاظ کو ان کے رائج عوامی تلفظ کے مطابق استعمال کیا ہے۔

۱۲۔ یہ معاصر ماحول میں رچی بسی انگریزی زبان کے اثرات کا نتیجہ ہے یا پھر شعوری طور پر ایسا کیا گیا ہے کہ عمومی بات چیت کے مکالموں میں آغا حشر

نے حال استمراری (Present Imperfect) کی بجائے حال قریب (Present Indefinite) کا استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اردو میں انگریزی کے اس صیغے (Tense) کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ اردو میں عام طور پر 'وہ جاتا ہے' کے بدلے 'وہ جا رہا ہے' کا حیرانہ بیان زیادہ مقبول ہے۔ اور جب 'وہ جاتا ہے' کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے عادت کے اظہار کا کام لیا جاتا ہے۔ یعنی ایسی جگہوں پر اس کا مفہوم 'وہ جایا کرتا ہے' ہو جاتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ آغا حشر نے ڈرامے میں ایک مصنوعی فضا قائم کرنے کے لیے یہ انداز بیان اختیار کیا ہو۔

اس کلیات کی ترتیب کے دوران ہمیں مسلسل اردو کے معتبر محقق پروفیسر حنیف نقوی صاحب، سابق صدر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کی رہنمائی حاصل رہی ہے۔ ہم ان کے احسان مند ہیں۔ اگر ان کی خاص توجہ نہ ہوتی تو شاید یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ ہی نہ پاتا۔ مسودوں کی تلاش، چھان بین اور انھیں ایک دوسرے سے مربوط کرنے میں خانوادہ حشر کی تیسری نسل سے تعلق رکھنے والے جناب آغا نہال احمد شاہ کاشمیری نے جس طرح ہماری مدد کی ہے، اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

آغا حشر نے اردو ڈرامے کو کیا دیا اس کا تجزیہ خاطر خواہ طریقے سے نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے ڈراموں کی اشاعت یا مسودوں کے تحفظ میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وہ اسٹیج کے عاشق تھے اور ہر ڈرامے کو اسٹیج تک پہنچا کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بازاری و کاروباری نوعیت کی بعض غیر مصدقہ اشاعتوں سے قطع نظر یہ ڈرامے اپنی اصل شکل میں کبھی منظر عام پر نہیں آ سکے۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ نئی دہلی انھیں باضابطہ طور پر شائع کر رہی ہے تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو ڈرامے کو آغا حشر

کی دین پر خاطر خواہ گفتگو ہو سکے گی۔ اس کام کے لیے کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر
محمد حید اللہ بھٹ صاحب اور دیگر اراکین بالخصوص ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ اور ڈاکٹر
رحیل صدیقی کا مشکور ہوں کہ انہوں نے ہر طرح سے تعاون کیا۔

مرتبین

پٹارس

31 اکتوبر 2003

یہودی کی لڑکی

یہودی کی لڑکی (1910-11)

یہ ڈراما بھی آغا حشر نے 1910 اور 1911 کی درمیانی مدت میں اپنی کہنی 'دی گریت الفرید کہنی حیدرآباد' کے لیے لکھا تھا۔ چنانچہ یہ پہلی بار اسی کے اسٹیج پر پیش ہوا۔ بعد میں اسے مختلف اوقات میں 'مشرقی ستار' اور 'دفا کی پتلی' کے نام سے بھی اسٹیج کیا گیا۔ یہ ان کے چند مقبول ترین ڈراموں میں سے ایک ہے، جس پر بعد میں فلم بھی بنی۔ اس ڈرامے میں انھوں نے رومنوں کے ان مظالم کی داستان بیان کی ہے جو انھوں نے یہودیوں کے ساتھ روا رکھے تھے۔ اس موضوع پر دیگر معاصر کہنیوں کے ڈراما نویسوں نے بھی ڈرامے لکھے لیکن وہ 'یہودی کی لڑکی' کی مقبولیت کو نہ پہنچ سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ناظرین بیروں ملکوں کے رہن سہن اور وہاں کے لمبوسات کو اسٹیج پر دیکھنے کے شوقین تھے اور ہر ڈراما کہنی ان کی اس خواہش کی تکمیل کا خیال رکھ رہی تھی۔

اس ڈرامے کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے آغا حشر نے اس کا دوسرا حصہ 'مشرقی حور عرف شیر کی گرج' کے نام سے لکھا تھا، جو مکمل شکل میں دستیاب نہیں ہے۔ ان کے ذخیرے میں اس کا ایک ناقص مسودہ موجود ہے جو الگ الگ کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے مکالمات کی شکل میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرچے مختلف کرداروں کو ان کے مکالمات یاد کرانے کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ چونکہ ان منتشر اجزا کو خستہ مصنف کے مطابق ترتیب دینے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی، اس لیے یہ ڈراما اس کلیات میں شامل نہیں ہے۔

’مہودی کی لڑکی‘ کی ترتیب میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ اور چار مسودے پیش نظر رہے ہیں۔ مطبوعہ نسخہ نرائن دت سہگل، لاہور کا شائع کردہ ہے۔ اس پر سال طباعت درج نہیں۔ اس میں کچھ کرداروں کے نام بھی بدلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ’آکٹویا‘ کا نام ’ڈیزہ‘ اور ’حتا‘ کا نام ’راجیل‘ ہے، جس کی تائید کسی قلمی نسخے سے نہیں ہوتی۔ ممکن ہے یہ ڈراما شروع میں ان ناموں کے ساتھ بھی کھیلا گیا ہو اور بعد میں کسی مصلحت کی بنا پر بعض نام تبدیل کر دیے گئے ہوں۔ مطبوعہ نسخہ کل 100 صفحات پر مشتمل ہے۔

مسودات میں سے پہلا مسودہ مجلد رجسٹر کی شکل میں ہے اس میں کل 95 صفحات ہیں۔ اس کے سرورق پر کاتب کا نام محمد رفیع اور سنہ 1915 لکھا ہوا ہے۔ یہ مسودہ کھل اور صاف ستھرا ہے اور اسے ہی مشمولہ ڈرامے کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ دوسرا مسودہ بھی رجسٹر سائز میں مجلد ہے۔ اسے منظور احمد عظیم آبادی نے بھاگل پور میں 9 فروری 1926 کو کھل کیا ہے۔ اس پر سنسر کے دستخط ہیں اور تاریخ 29 مئی 1928 لکھی ہوئی ہے۔ ترتیب کے دوران اس مسودے سے بھی جا بہ جا مدد لی گئی ہے۔ اس رجسٹر کی ابتدا میں ڈرامے میں کردار ادا کرنے والے ایکٹروں کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ تیسرا مسودہ بہت خراب حالت میں ہے۔ یہ بھی رجسٹر سائز میں ہے اور اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے سب سے قدیم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں نہ تو سنہ تحریر درج ہے اور نہ کاتب کا نام۔ البتہ کہیں کہیں پنل سے اصلاح کی گئی ہے جو غالباً خود آغا حشر کے ہاتھ کی ہے۔ یہ نامکمل بھی ہے۔ اس میں پہلے ایکٹ کا پہلا سین نہیں ہے۔ یہ کل 63 صفحات پر مشتمل ہے۔ چوتھا مسودہ مجلد کاپی کی سائز میں ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد 126 صفحات ہے۔ ملا فلف اور خط مبتدیانہ ہے۔ علاوہ بریں اس پر نہ تو تاریخ تحریر درج ہے اور نہ کاتب کا نام۔

کردار

مرد

- 1- مارٹس رومن شہزادہ
- 2- بروٹس مذہبی رہنما
- 3- جیرا ایک بوڑھا یہودی
- 4- بادشاہ رومن بادشاہ
- 5- کرامت نصیبن کا شوہر
- 6- سرخاب نرگس کا باپ
- 7- شمشاد نرگس کا عاشق
- 8- رحیم، کریم سرخاب کے ملازم
- 9- منوا کرامت کا نوکر

خواتین

- 1- کا مارٹس کی معشوقہ
- 2- آکٹیویا رومن شہزادی اور مارٹس کی معیتر
- 3- جونا آکٹیویا کی ملازمہ
- 4- نرگس شمشاد کی معشوقہ
- 5- نصیبن کرامت کی بیوی

پہلا ایکٹ - پہلا سین

محل

(سہیلیوں کا حمد گانا)

والی تو جگ کا ہے۔
جل میں تھل میں تیرے نور کی تجلی دیکھی
میرے والی۔ ڈالی ڈالی۔
کویلا گن بھری۔ تو جگ...
برگ و بار، کوسار، ہرا بھرا پھولن کے بن میں ہے۔
صف کے تن میں ہے، حشر کے من میں ہے۔ تو جگ...
(سہیلیوں کا جانا اور آکٹیویا کا آنا)

آکٹیویا : (گانا) مانو برہا ستاوے۔ جی چراوے پر یا۔
ہاں مانو..... ہاں مانو.....
ترجی نجریا کی ماری رے کٹاری پیا۔
لاگی تو ہے پریم کی کٹاری۔
کاری کاری پیا۔
گھائل کیو تن من سب جان۔
بار بار بے شمار، حال راز۔

روئے اٹھیاں۔ مانو برہا۔۔۔

مرٹے تیرے لیے اور تجھے دھیان نہیں
غیر کا درد نہ ہو جس کو وہ انسان نہیں
او ستم گار، جفاکار نہ ٹھکرا دل کو
توڑنا کھل ہے پر جوڑنا آسان نہیں

مارٹس : آکٹیویا۔ تم اور یہاں؟
آکٹیویا : ۔

جو نظراب ہے وہ پہلے تری بے دید نہ تھی
اس طرح آنکھ بدل لے گا یہ اُمید نہ تھی

آخر اس بے رخی کا سبب؟

مارٹس : کوئی نہیں۔

آکٹیویا : اس ناراضگی کا باعث؟

مارٹس : کچھ نہیں۔

آکٹیویا : تو پھر کیا ہو گیا؟

مارٹس : سودا ہو گیا۔

آکٹیویا : ہوش و حواس کدھر گئے؟

مارٹس : مرحوم آرزوؤں کے ساتھ وہ بھی مر گئے۔

آکٹیویا : تو کیا اب مجھے تم سے کوئی آس نہیں؟

مارٹس : آس دلانے والی چیز ہی میرے پاس نہیں۔

آکٹیویا : میرے پیارے وہ کیا؟

مارٹس : دل۔ ۔

میں دل کو روؤں گا اور روئے گا دل عمر بھر مجھ کو
نہ میری ہے خبر دل کو نہ دل کی ہے خبر مجھ کو

پہلا ایکٹ - دوسرا سین

یہودیوں کا محلہ

(حآ کا گاتے ہوئے آتا)

تیر قضا کا نشانہ کوئی ہو مرغ بیل نہ ہو۔
 ظالم یہ تیغِ نظر کے ہیں چمکے۔
 ترجمہ نگاہیں نہ ہوں۔ کسی کی ترجمہ.... تیر قضا...
 دیکھا نہ مڑ کر شہیدوں کو اپنے۔
 آنکھوں سا قاتل نہ ہو۔ تیری ان آنکھوں۔ تیر قضا...
 نیوں کے سیناں ہیں چھیت چھیاں۔
 آوے نہیں نیند۔ پڑے نہیں چھیاں۔ تیر قضا...
 (مارکس کا یہودیوں کے لباس میں آتا)

مارکس : پیاری حآ۔ میری یہ خواہش ہے کہ تم چہرے پر نقاب ڈالے بغیر گھر سے باہر نہ نکلا کرو۔

حآ : اس کی وجہ؟

مارکس : وجہ یہ ہے کہ جس طرح بارش سے دھلے ہوئے شفاف آسمان پر شفق کی سرخی شہابِ پاشی کرتی ہوئی حدِ نظریک بھیل جاتی ہے تو تمام دنیا بے پایاں مستی میں ڈوبی ہوئی پُر شوق نگاہوں سے اس کی دھڑکیوں پر قربان ہونے لگتی ہے۔ اسی

یہودی کی لڑکی

طرح جب تمہارے گلابی گالوں کے عکس سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگانے اور
ہنسنے لگتا ہے تو قدرت کی مخلوق ہی نہیں خود قدرت بھی حسیں پیدا سے دیکھنے لگتی
ہے۔

ہے نظر کاتب کی اپنے ہاتھ کی تحریر پر
خود مُصور بھی مٹا جاتا ہے اس تصویر پر

خا : تو میرے پیارے۔ تم رشک کرتے ہو؟
مارکس : رشک؟ میں اُس لباس پر رشک کرتا ہوں جو تمہارے خوبصورت جسم کو اپنی
آغوش میں لیے رہتا ہے۔ میں اس گلے کے ہار پر رشک کرتا ہوں جو اس
دلغریب سینے کے ابعاد کو ہر وقت بوسے دیا کرتا ہے۔ میں اس ہوا کے
جھونکے پر رشک کرتا ہوں، جو ان لہراتی ہوئی ناگوں کے پاس سے غڑ
ہو کے لٹکتا ہے۔ یہاں تک کہ میں تمہارے سائے سے رشک کرتا ہوں جو
ان قدموں سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

بندگی ہے عقلی سب آزماتے ہیں نصیب اپنا
جسے میں دیکھتا ہوں اس کو پاتا ہوں رقیب اپنا
جو حسرت ہے تو یہ حسرت نہ ہوتی تو مقابل میں
تھمیں آنکھوں میں رکھ لوں اور ان آنکھوں کو اس دل میں

(دونوں کامل کر گانا)

سمند ناز پر کھولے ہوئے وہ بال پھرتے ہیں
بچے کب طائرِ دل جب ہوا میں جاں پھرتے ہیں

پھول سے گالوں پہ۔ ناگن سے بالوں پہ۔

ہوں میں فدا۔ اے دل ربا۔

حتواری چالوں کی۔ گھونگر سے بالوں کی۔

زنجیر کی ہوں میں اسیر۔

اسیر پنجہ عہد شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے
کسی کے درد محبت نے عمر بھر کے لیے
خدا سے مانگ لیا انتخاب کر کے مجھے

ابرو کٹاری۔ سینے پہ ماری۔

تغ دو دھاری جان۔ پھول سے.....

(دونوں کا گاتے ہوئے جانا۔ رومن سرداروں کا داخل ہونا)

سپاہی ۱: تو کیا آپ اس مشرقی ستارہ کو/روم کی کلیو پیٹرا کا خطاب دیتے ہیں؟
کیثیش: ہاں۔ اور اس خطاب پر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے۔ اُس کے حسنِ خدا داد
کی داد دینے میں بخل سے کام لے رہا ہوں۔

سپاہی ۲: جب تو اُس کے حُسن کی غلامی کرنے کے لیے رومن سوراؤں میں سے
بہت سے بیزر و اینونو پیدا ہو جائیں گے۔

سرदार: دیکھو دیکھو وہ کافر ادا یہودن اسی طرف آ رہی ہے۔

کیثیش: قسم ہے رومن خون کی۔ میں اس روم کی سب سے زیادہ حسین دوشیزہ کا
ایک بوسہ لیے بغیر کبھی یہاں سے نہ جاؤں گا۔

سپاہی ۳: بوسہ؟

کیثیش: ہاں۔

سپاہی ۱: اس کی مرضی کے خلاف؟

کیثیش: ہاں۔ ہاں۔

سپاہی ۳: جبراً؟

کیثیش: بے شک۔ ہم کون ہیں؟

سپاہی ۲: معزز رومن۔

کیثیش: اور یہودی کون ہیں؟

سپاہی ۳: رومنوں کے ادنیٰ غلام۔

یہودی کی لڑکی

کیشیش : تو بس پس و پیش بیکار ہے۔ غلام اور غلام کے مال پر آقا کو ہر طرح کا اختیار ہے۔

(خا کا آتا)

خا : (پھول سے مخاطب ہو کر)۔

فدا ہوں جس طرح اُس گل پہ تجھ پر بھی فدا ہوتی
جو تجھ میں اُس کی رنگت، اس کی بو، اس کی ادا ہوتی

کیشیش :

فقط یہ پھول ہی کیا مستحق ہے مہربانی کا
ادھر بھی اک اچھتی سی نظر، صدقہ جوانی کا

خا : جناب آپ کون ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں؟

کیشیش : میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ پھول زیادہ نظر فریب ہے یا یہ؟ یہ زیادہ خوبصورت
ہے یا یہ؟ اس کی پگھڑیوں کو دیکھ کر طبیعت لپچاتی ہے یا ان پگھڑیوں کو؟ اس
کو چھاتی سے لگانے کو دل چاہتا ہے یا اس کو؟۔

زمیں سے تا بہ فلک، لالہ زار کس سے ہے

بہار کس سے ہے کیف بہار کس سے ہے

خا : صاحب آپ ہوش میں ہیں؟

کیشیش :

رحم کرتی ہیں کہیں، یہ زکس سے نوش بھی
اک نظر میں دل بھی چھینا ساتھ دل کے ہوش بھی
راہ چلتوں پر یہ نادرک افقی اچھی نہیں
کہہ دہ ان آنکھوں سے ایسی رہزنی اچھی نہیں

خا : بس بس۔ ایک غیرت دار شریف زادی اس سے زیادہ اپنی توہین برداشت
نہیں کر سکتی۔

کیفیش ن

مست سے نشاط بھی ہیں باغ باغ بھی
آنکھیں بھی شاد کام ہوئیں اور دماغ بھی
منت پذیر حسن خدا داد کیجیے
یہ ہونٹ رہ گئے ہیں انھیں شاد کیجیے

(کاکا کو پکڑ لینا)

کاکا : چھوڑ دے۔ چھوڑ دے بے رحم موزی مجھے چھوڑ دے۔
کیفیش ن

صرف کر دے زہ، جتنا بھی پرو بازو میں ہے
چھٹ چکا وہ صید جو صیاد کے قابو میں ہے
کاکا : دوڑو۔ بچاؤ۔ یہ کمینہ میری عزت پر حملہ کرتا ہے۔

(مارکس کا یہودی کے لباس میں آنا)

مارکس : خبردار۔ او بد معاش پانچی۔ اگر ایک انچ بھی آگے بڑھا تو یہ بالشت بھر کی
چھری قبضے تک سینے میں اتار دوں گا۔
کیفیش : تو کون؟

مارکس : تجھ پر لعنت بھیجے والی زبان، تجھے سزا دینے والا ہاتھ۔

پانچی ہو تم کہ پاس شرافت نہیں تمہیں
نکوار ہانڈے کی بھی غیرت نہیں تمہیں
ہو دم تو آؤ ساتھ مرے ہم نبرد ہو
عورت سے جگ، کون کہے گا کہ مرد ہو

کیفیش : حقیر ہستی۔ کیا تو رومن قوم کے معزز نوجوان کا مقابلہ کرنے آیا ہے؟
مارکس : معزز؟ ایسی کینی حرکتیں اور معزز؟ جب تمہارا دل، تمہارا خیال، تمہاری ہر چیز
ذلیل ہے تو پھر تمہارے معزز ہونے کی کیا دلیل ہے؟

یہودی کی لڑکی

کہیں اعزاز ہوتے ہیں جہاں میں ان قرینوں کے
جو عادت ہے رذیلوں کی جو کچھ ہیں کینوں کے
معزز وہ ہے جس کے قول اچھے ہوں، عمل اچھے
درخت اچھا وہی کہلائے گا جس کے ہوں پھل اچھے

کیشیش : بس خاموش۔ شاید تیرے دل میں اپنی زندگی کا پیار نہیں ہے۔ کیا تو رومن
قوم کے غرور، غصہ اور ہیبت ناک انتقام سے خبردار نہیں ہے؟
مارکس : ذلیل غلام۔ تو اپنے پاجیانہ خیالات کے اظہار میں تمام رومن قوم کو کیوں
شامل کرتا ہے؟۔

یہ طرز زیت ہے ان کی نہ یہ قرینہ ہے
وہ سب کہنے نہیں صرف تو کہینہ ہے
کیشیش : بس یہ اپنی بدزبانی سے اپنے موت کے فتوے پر مہر کر چکا۔ سپاہیوں باندھ لو
اس باغی کو۔

مارکس : بدبخت، نامراد۔ بھالے نیچے جھکا دو۔

کیشیش : کس کے حکم سے؟

مارکس : میرے حکم سے۔

کیشیش : تو کون؟

مارکس : دیکھ۔

(مارکس کا سینہ کھول کر نشان شاعی دکھاتا)

کیشیش : کون شہزادہ مارکس؟ آپ؟

مارکس : پُپ۔

(سپاہیوں کا بھالے جھکا دینا اور حنا کا مارکس سے لپٹ جانا)

پہلا ایکٹ - تیسرا سین

راستہ

(برٹس کا اپنے سرداروں کے ساتھ آنا)

برٹس : جاو اس ذلیل کتے سے کہو کہ فوراً حاضر ہو۔ اگر حکم سننے کے بعد آنے میں عذر کرے تو داڑھی سے پکڑ کر منہ پر تھوکتے اور پیٹھ پر لاتیں مارتے یہاں لے آؤ۔

سردار : مقدس باپ۔ تلواری کی حکومت ہی بہترین حکومت ہے۔ نرمی برتنے سے حاکم وقت کا رعب و داب جاتا رہتا ہے۔ اور محکوم قوم کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ان سرکش یہودیوں کا صرف یہی علاج ہے کہ ایک پوری اور آخری ضرب لگا کر ان کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جائے۔ ڈسنے سے پہلے ان آستین کے سانپوں کا زہر نچوڑ دیا جائے۔

برٹس : بھول گئے۔ بھول گئے۔ یہ محسن کش، احسان فراموش، وہ دن بھول گئے۔ جب فرعون کی زمین پر مصریوں کے ہاتھوں سے کوڑے کھاتے تھے، جب باہل کی گلیوں میں بخت نصر کی قوم کے ہاتھوں غلام بنا کر دو دو پیسے کو بیچے جاتے تھے۔

انھیں پناہ دی، ان کے دکھوں کو دور کیا
سلوک ان سے کیے، یہ بڑا قصور کیا

(ایک سپاہی کا ایک یہودی شخص غورا کو لیے ہوئے آنا)

یہودی کی لڑکی

سپاہی ۲: آگے بڑھ اور جھک ان قدموں کے آگے۔

عزرا: جھکوں؟ کس کے آگے، ان قدموں کے آگے؟ جن قدموں نے اس سر سے بھی زیادہ سفید اور بوڑھے سروں کو ٹھوکریں ماری ہیں۔ جنہوں نے اپنی جوتی کی ٹوک کی ضربوں سے ہماری مظلوم قوم کے کلیجے میں چھریاں اتاری ہیں؟۔

قیامتیں ہوں کہ آفتیں ہوں، جہان جائے کہ جان جائے
مگر یہ ممکن نہیں ہے ہرگز کہ اُس کے بندے کی آن جائے
اُسی کی چوکھٹ پہ ہوں گے سجدے، جدھر وہ ہوگا ادھر جھکے گا
بجز خدا کے کسی کے آگے نہ دل جھکا ہے نہ سر جھکے گا

برٹس: بے ادب گستاخ سُن کہ تجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟ تو یہودی قوم کا سرغنہ ہے۔ اس لیے میں اپنا حکم تیری زبان سے تیری قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ ان سے کہہ دے کہ روم کا مذہبی پیشوا یہودیوں کو عطا کی ہوئی مذہبی آزادی آج بطور جرمانہ ضبط کرتا ہے۔

عزرا: کیوں؟

برٹس: کیونکہ وہ میرے حکم کے مطابق اپنی مذہبی ریسیں پوشیدگی اور خاموشی کے ساتھ ادا نہیں کرتے اور اس دلیری کو پڑوس میں رہنے والے رومن اپنے دیوتاؤں کی ہنک سمجھتے ہیں۔

عزرا: تو کیا ہم اس زبان کو کاٹ کر پھینک دیں جو راحت میں اظہارِ شکر اور معصیت میں طلبِ رحم کے لیے اپنے خالق و مالک کا نام لیتی ہے؟ یہودی قوم اس خلافِ مذہب حکم کو کبھی نہ مانے گی۔

برٹس: تب میں تمام یہودی قوم کو باغی اور تجھے باغیوں کا سردار قرار دے کر خوفناک سزا دوں گا۔ احمق کیا تو میرے حکم سے سرکشی کر کے اپنے اور اپنی قوم کے لیے کوئی بہتری کی امید رکھتا ہے؟

عزرا: اب ہمارے لیے صرف آسمان میں امید باقی رہ گئی ہے۔ جہاں نہ تمہاری حیوانی تہذیب ہے، نہ تمہارا ظالمانہ قانون ہے، نہ تمہاری شیطانی سلطنت ہے۔

وہیں پر اب تسلی خانماں برباد پائیں گے
وہیں اس بے کسی و بے بسی کی داد پائیں گے
لبو ان آستیں کا گواہی دے رہا ہوگا
ادھر مظلوم، ادھر ظالم، مقابل، میں خدا ہوگا

بروٹس : مفسد، ملعون۔ ہمارے عقیدوں، رسموں اور مذہبی تہواروں کے ساتھ علانیہ نفرت کا اظہار کرنا اور پھر دنیا کے سامنے اپنی بے گناہی آشکار کرنا۔ کتو۔ ہم جانتے تو تمہیں آزادی اور زندگی کبھی نہ دیتے۔

عزرا : اس ملک روم میں آزادی اور زندگی یہ دونوں چیزیں کسی قیمت پر ملی ہیں اور نہ مل سکتی ہیں۔ جس طرح کوئی گناہ یا شرم کا کام کرتا ہو۔ اسی طرح اپنے خالق و مالک کی عبادت اور اپنے مذہبی اور رسم و رواج کو چھپانا، تمہاری قوم کے ذلیل سے ذلیل آدمی کے سامنے بید کی طرح تھڑانا۔ اپنی قوم کی دولت، عزت، عصمت کو لٹتے ہوئے دیکھنا اور کلیجہ موس کر رہ جانا۔ اس کا نام آزادی اور زندگی ہے۔ نہیں یہ حالت زندگی کے لیے دائمی لعنت اور ابدی شرمندگی ہے۔

فجر زیت کے چن چن کے ثمر توڑے ہیں
تم نے دل توڑے ہیں ہم سب کے جگر توڑے ہیں
تم ہو وہ پیکر بیداد و تعصب جس نے
سینکڑوں اکھوں ہی اللہ کے گھر توڑے ہیں

بروٹس : اگر تیرے خدا کو تجھے اس دنیا میں آزاد اور معزز رکھنا منظور ہوتا تو یہودیوں کی ذلیل قوم میں تجھے پیدا ہی نہ کرتا۔

عزرا : یہودی قوم اور ذلیل؟ کیوں؟ وجہ؟ کیا یہودی اس لیے ذلیل ہیں کہ تمہارے جیسے لاد مذہب، بے اصول، متعصب خود غرض، بے رحم، جفا شعار اور بدکار نہیں ہیں۔ کیا اس لیے ذلیل ہیں کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کو لوٹنے، روندنے اور ذلیل حالت کو پہنچانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کیا اس لیے ذلیل ہیں

یہودی کی لڑکی

کہ وہ ایک خدا، ایک شریعت اور ایک قانون کو مانتے ہیں۔ کیا اس لیے ذلیل ہیں کہ جس طرح وہ اپنی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں اسی طرح دوسرے کے دکھ کو بھی دکھ جانتے ہیں۔

اگرچہ خاک بسر اور شکستہ پر ہیں ہم
خراب، خستہ و برباد، در بدر ہیں ہم
مگر خلیق، وفا دوست، خوش سیر ہیں ہم
فراخ مشرب و ذی علم، ذی ہنر ہیں ہم
جو تم شریف تو تم سے شریف تر ہیں ہم

برٹس : تودہ ملامت۔ تو رومن قوم کے سلوک کے لیے اسے طزم ٹھہراتا ہے مگر اپنے گریباں میں منہ ڈال کر اپنے دل سے پوچھ کہ تیری ملعون اور سرکش قوم نے اپنے خدا، اپنی کتاب اور اپنے نبیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟
عزرا : کیا کیا؟

برٹس : تم نے، ہاں تم نے ابراہیم اور موسیٰ کے خدا کو ٹھٹھوں میں اڑایا۔ اپنی کتاب توریت کے احکام کو جھٹلایا۔ اپنے ہم قوم مریم کے بیٹے مسیح کو سولی پر چڑھایا۔

کیوں کبھی اس کا کبھی اُس کا گلا کرتا ہے
جو بھی کرتا ہے ترے ساتھ خدا کرتا ہے
رنگ لائے ستم و جور، بد افعال ترے
ویسا ہی حال ہوا جیسے تھے اعمال ترے

عزرا : اگر یہودی قوم کے ذلت و بربادی کا حال معلوم ہو گیا ہے تو ہماری پہلی حالت سے موجودہ حالت کا مقابلہ کر کے مستقبل کے فیصلے سے لرزو اور اپنے طریق حکومت اور طرز عمل کی اصلاح کرو۔

مہمل نہیں اگرچہ کلام ادق ہوں میں
میری سنو زمانے کی آواز حق ہوں میں

جس میں لکھے ہیں رازِ نہاں وہ ورق ہوں میں
مجھ کو پڑھو کتابِ فنا کا سبق ہوں میں
عبرت کدہ بنا ہوں عروج و زوال کا
آئینہ ہوں زمانہ ماضی و حال کا

بروٹس : اگر رومن قوم سے نفرت کا خیال دل سے نہ جائے گا تو جس طرح تیرا
ماضی حال پر رو رہا ہے اسی طرح تیرا حال تیرے اور تیری قوم کے مستقبل
پر آنسو بہائے گا۔

ہماری تیغِ غضب اور ترا گلو ہوگا
نہ تیری قوم ہی ہوگی کہیں، نہ تو ہوگا

عزرا : جاؤ جاؤ۔ جب تک خدا اپنی زمین پر ہم کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اُس وقت
تک تمام دنیا کی طاقتیں بھی مل کر ہماری قومیت کو نیست و نابود نہیں
کر سکتیں۔

ممکن نہیں لگائے کوئی نابکار ہاتھ
دشمن کے گریں دو تو ہیں اس کے ہزار ہاتھ

بروٹس : یہ جواب؟

عزرا : ہاں۔

بروٹس : ان دیکھے خدا پر اتنا بھروسہ؟

عزرا : ارے ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔

بروٹس : تیرا مغرورِ حلم میرے تحمل کا منہ چڑھا رہا ہے۔ اچھا جاؤ (سپاہیوں سے) جلتی
ہوئی مشعلیں اور بربادی کو ساتھ لے کر یہودیوں کے محلے میں جاؤ۔ ان کی
سرکشیوں کا آج ہی انھیں مزہ چکھا دو۔ ان کے باغ، محل، دوکان، سامان
سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دو۔

آتش فشانوں سے زمیں شعلہ زار ہو
ہر در پہ ایک لاش ہو ہر گھر مزار ہو

یہودی کی لڑکی

عزرا : ارے نہیں نہیں۔ تمہارا مجرم، تمہارے گھوڑے کی ٹاپوں سے پامال ہونے والا مٹی کا ڈھیر، تمہارے گرسنے غصے کا لذیذ لقمہ صرف میں ہوں۔ مجھے سولی پر چڑھا دو۔ زندہ آگ میں جلا دو۔ اس تھڑی دار بوڑھے جسم سے بوٹیاں تراش تراش کر اپنے شکاری کتوں کو کھلا دو۔ مگر میری بے کس، مظلوم قوم پر برداشت سے زیادہ ظلم نہ کرو۔

سبھی مجرم نہیں، ہیں چند بد، تو لاکھ اچھے بھی
 کرو رحم، اُن میں بیوائیں بھی ہیں، بوڑھے بھی، بچے بھی
 بروٹس : ہاں اور آج ان سب کو آگ اور موت کے حوالے کیا جائے گا۔

سامنے شعلوں کے رونا بے گناہی قوم کی
 (جاؤ!) تو بھی ساتھ جا، دیکھ اب تباہی قوم کی
 عزرا : سمجھ گیا۔ میری ہی بھول تھی جو رحم کی بھیک مانگنے کے لیے دوزخ کا دروازہ کھٹکنا رہا تھا۔ مغرور رومنوں۔ تاریخ ایک مرتبہ ضرور اپنے کو دہراتی ہے۔ اس لیے سنو، اور یاد رکھو۔ جس طرح مصر، بابل، نینوا، کارتھج اور اسیریا کی ظالم اور سرکش قومیں دنیا کے جسم پر پھوڑے کی طرح پیدا ہو کر خدائی نشتر سے نیست و نابود ہو گئیں اسی طرح تمہاری رومن قوم اور رومی سلطنت کا بھی زوال ہوگا۔ آنے والے وقت کی ٹھوکروں سے تمہارا غرور بھی ضرور پامال ہوگا۔

کہاں تک مضحکہ کرتے رہو گے، بے ادب اس کا
 کبھی تم کو نہ چھوڑے گا ستم گارو غضب اس کا

پہلا ایکٹ - چوتھا سین

یہودی محلہ

آوازیں : آگ لگی۔ آگ لگی۔ بھاگو۔ بھاگو۔

(رومن سپاہی ہاتھوں میں مشعلیں لیے ہوئے محلے کے مکانوں میں
آگ لگا رہے ہیں۔ بچے، بوڑھے، جوان، سب واویلا مچاتے
ہیں۔ رومن سپاہیوں کے یہودیوں پر مظالم، عذرا کا داخلہ۔ حکم کو
چینٹا چلاتا دیکھ کر عذرا ہل پر چڑھتا اور اسے ساتھ لے کر نیچے
آتا ہے۔ شعلے زیادہ بھڑک اٹھتے ہیں)

پہلا ایکٹ - پانچواں سین

مکان

(نصیبن کا گاتے ہوئے آتا)

دیکھو موئے کھوسٹ کا جھوٹا یہ پیار۔

کھانے کو مانگو تو جوتی چیزار۔

نہ پیسہ پاس ہے۔ بڑا دل اُداس ہے۔

کھوسٹ سے ہوں بیزار۔ ہاں رے موئے...

میرے نازک بدن پر۔ عارض بھین پر۔

ایسے موئے کو کروں میں غار۔

لوں چیزار۔ ماروں چار۔ روئے زار زار۔

موئے کھوسٹ پہ اللہ کی مار۔ دیکھو موئے.....

نصیبن : صورت گوری۔ نصیب کالا۔ گھوڑی قسمت نے ایسے بدبخت کے پالے ڈالا۔

کہ کھانے کو کیسے تو کرتا ہے حیلہ حوالہ۔ گھڑو تو جوتا وہ بھی سادہ نہیں نعل

والا۔ موئے کی آنکھوں میں پڑ جائے جالا۔ ڈس جائے ناگ کالا۔ مرتا بھی

نہیں ہے رڈالا۔ جس سے چھوٹ جائے میرا پالا۔

(کرامت کا آتا)

کرامت : بس بس۔ کتنی دعائیں دوگی میری خالہ۔

نصیبن : ارے موئے۔

کرامت : ارے موٹی۔

نصیبن : ارے میں پوچھتی ہوں کہ تو کہیں جا کر نوکری کیوں نہیں کرتا؟

کرامت : ہیں نوکری۔ کیا کوئی میرے باوا کا نوکر ہے جو مجھے نوکری دے گا؟ بیوی وہ دن گئے جب ایک کماتا تھا اور دس کھاتے تھے۔ اب تو ایک کا پیٹ بھرنا بھی محال ہے۔ بڑی نوکری تو مگنی جہنم میں۔ اگر جوتا صاف کرنے کی نوکری مانگتے جاؤ تو کہتے ہیں پہلے بی اے کلاس کا سرٹیفکیٹ دکھاؤ۔ میں تو آج کل کیسا بنانا سیکھ رہا ہوں۔

نصیبن : ارے بے وقوف یہ کیا کس جانور کا نام ہے؟

کرامت : جانور کا نام نہیں ہے۔ یہ ہے ایک قسم کا علم۔ پیاری تھوڑے دنوں میں تمہارے ناک، کان، ہاتھ، پاؤں سب سونے سے پیلے ہو جائیں گے۔

نصیبن : یہ مانا جب باوا مرے گا تو تیل بنے گا۔ مگر یہاں تو گھر میں پاؤ بھر آتا بھی نہیں ہے۔ آج کا دن کیسے کٹے گا؟

کرامت : پھر دینی بیہودہ جھگڑا نکالا۔

نصیبن : موئے جھگڑا کیا۔ کھانے کو لاتا ہے یا جوتیاں کھاتا ہے؟

کرامت : دیکھو بیوی میں پٹھان آدمی ہوں۔ بہت جلد غصے میں آجاؤں گا۔ اور اس وقت بھوکا بھی ہوں۔ بگڑ گیا تو ناک ہی چبا جاؤں گا۔

نصیبن : چل چل بڑا آیا ہے ناک کاٹنے والا۔ تو کوئی رستم ہے یا اسفندیار کا سالا؟

کرامت : میں سفید دیو کا بہنوئی ہوں۔

نصیبن : تو میں لال دیو کی خالہ ہوں۔

کرامت : کیا کشتی لڑے گی؟ ایسے جوتے لگاؤں گا کہ سر کی دھول جھڑے گی۔ چپ بیٹھ۔

نصیبن : کیوں چپ بیٹھوں۔ تو ایک کہے گا۔ میں تجھے دس سناؤں گی۔

کرامت : او میرے باپ کے غصے۔ کم الاٹک۔

نصیبن : ارے دیکھی چہار۔ باپ تو تیرا مر گیا۔ اب اپنی اماں کو پکار۔

کرامت : شیطان کی نانی، نہیں چھوڑتی بدزبانی؟

(نصیب کرامت کو مارتی ہے اور خود ہی چلاتی ہے)

نصیب : ارے کوئی آؤ۔ یہ مجھے مارتا ہے، میری جان بچاؤ۔

(کریم اور رحیم کا آنا)

دونوں : کیا ہے۔ کیا ہے؟

کریم : یہ کیا ستم نظر آتا ہے؟ اے کم بخت مرد ہو کر عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔

کرامت : پھر تجھے کیا۔ تو کیا کوئی خدائی فوجدار ہے؟

رحیم : اے بے غیرت مرد ہو کر عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اوپر سے ڈراتا ہے۔

نصیب : تم کون۔ ہمارا دل ہے مار کھانے کو۔ تم کیوں آئے بچانے کو؟

کریم : ارے یار۔ یہ عورت تو گلے پڑو ہے۔

نصیب : عورت کا بچہ۔ نکل جا۔ نہیں تو کھا جاؤں گی کچا۔ لو پیارے دس پانچ ہاتھ اور

لگاؤ۔

کریم : ہاں استاد۔ دس دس یہ کہتی ہے اور دس دس ہم دونوں کی طرف سے

لگاؤ۔

کرامت : واہ میں اپنی اکلوتی بیوی کو کیوں ماروں۔ یہ تو مجھے اپنی بہن سے زیادہ پیاری

ہے۔

نصیب : میاں میں تمہاری باتوں کا بُرا کیوں مانوں۔ تم تو مجھے بھائی سے زیادہ

پیارے ہو۔

کریم : لو چلو۔ یہ بہن اور یہ بھائی۔ پھر ہم تم کون؟

نصیب : اُتو، گدھے، سودائی۔

کرامت : نہیں نکلتے ناسرائی۔

(کرامت اندر جاتا ہے)

رحیم : ارے یہاں کہاں لے آیا؟

کریم : ابے لنگڑے تو ہی تو لایا۔ بیگم معاف کرنا۔ ہم تو ایک تجربہ کار حکیم کی

کلیات آغاشر کاشمیری - جلد چہارم

تلاش میں آئے تھے ادھر سے تمہارا غل سنا تو جان بچانے کو چلے آئے۔
 نصیبین : ٹھیک ہے۔ اب میں اس موئے کی حجامت کراتی ہوں۔ (جاتے ہوئے رحیم
 کریم کو آواز دیتے ہوئے) اجی میاں۔ اجی او صاحب۔ ابھی آپ نے حکیم
 کا ذکر کیا تھا؟

دونوں : جی ہاں۔ جی ہاں۔
 نصیبین : بھلا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ آپ بے کھٹکے ان کو لے جایئے۔ ان کی
 کیا بات ہے۔ واقعی ان کا علاج کرامات ہے۔
 کریم : بیگم یہ تو کوئی اول نمبر کا گھاسلیٹ معلوم ہوتا ہے۔
 نصیبین : اجی توبہ کرو۔ ورنہ بخشے نہ جاؤ گے۔ انھوں نے صورت ہی ایسی پائی ہے اور
 ایک بات اور سن لو۔ یہ جب تک مار نہیں کھائیں گے، حکیم ہونے کا اقرار نہ
 کریں گے۔

کریم : پھر اس کا کیا علاج؟
 نصیبین : اجی سر کے رستے سے جوتوں کا کچر پلاؤ۔
 رحیم : دیکھنا پھر بُرا نہ ماننا۔ تم ان کی بیوی ہو۔
 نصیبین : کون بیوی ہے۔ میں تو ان کو دگی سے میاں کہتی ہوں۔
 (کرامت ڈنڈا لے کر آتا ہے اور کریم و رحیم کو مارتا ہے)

کرامت : ایک۔ دو۔ تین۔
 کریم : بس حکیم صاحب بس کیجیے۔ ورنہ آپ کا ہاتھ دکھ جائے گا۔ پھر نسخہ کس طرح
 لکھیے گا؟

کرامت : پاگل بے وقوف۔
 رحیم : نہ پاگل ہے اور نہ بے وقوف۔ وہ تو گوئی ہو گئی ہے۔
 کرامت : میں کوئی حکیم و حکیم نہیں ہوں۔ پوچھ لو میری بیوی سے۔
 نصیبین : بیوی کون؟ بس بس حکیم صاحب میری دگی نہ کیجیے۔ میں تمہاری بیوی نہیں
 ہوں۔ میرا میاں تو چار مہینے ہوئے گذر گیا۔ پیسے سے مر گیا۔

کرامت : اری او ہیضہ کی خالہ۔

کریم : بس بس حکیم صاحب۔ یہ کیا گزبڑ گھوٹالا۔

کرامت : ارے تم لوگوں کو دگی سوچتی ہے۔ یہاں پالی پوسی بیوی ہاتھ سے جاتی ہے۔

رجیم : اجی حکیم صاحب۔ انعام پائیے گا تو اور پٹاخہ سی بیوی بیاہ لائیے گا۔

کرامت : ایسے حکیم پر شیطان کی مار۔

کریم : تو پھر بس لگاؤ یار۔

رجیم : (مارتا) ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔

کرامت : ارے باوا۔ میں حکیم۔ میرا باپ حکیم، میرا دادا حکیم۔ بلکہ سارا خاندان حکیم۔

کریم : ہاں۔ اب کیسے قبول۔

کرامت : ہاں۔ میں بھولا۔ چلیے اب چلنے کو تیار ہوں۔

رجیم : اچھا تو لیجیے نذرانہ فیس مریضہ کو دیکھنے کے بعد ملے گی۔ ہم ابھی سواری

لاتے ہیں۔ اور آپ کو لے جاتے ہیں۔

(دونوں کا جانا)

کرامت : واہ واہ۔ حکیم بننے میں تو بڑا فائدہ ہے۔ مگر مار مار کر حکیم بنانا کہاں کا قاعدہ

ہے؟

نصیمین : کیا ہوا مار کھائی۔ رقم تو آئی۔

کرامت : ہاں سچ کہتی ہو میری لگائی۔ مگر ٹھہر تو میری بیوی نہیں ہے۔

نصیمین : کون کہتا ہے۔ پیارے میں تمہاری بیوی تمہارے باپ کی بیوی۔

کرامت : تو پھر اپنے بھائیوں کے سامنے کیوں کرتی تھی؟

نصیمین : وہ تو میں دگی کرتی تھی۔

(دونوں کا گانا)

بوڑھے غزے نہ ہم کو دکھاؤ۔ شرماؤ چلے جاؤ۔

بیاری ملکو، نہ ہاتھ میرا جھکو، گلے سے لگ جاؤ۔

جارے سیلانی۔ باتیں دیوانی۔ نہ کر مستانی۔
 یاں سے سکو۔ بوڑھے غمزے...
 میری جان دجگر۔ تجھ پہ صدقے قمر۔ کلکتہ والی گوہر۔
 میں موڑ میں تجھ کو بٹھاؤں گا۔ ہم ہم۔
 تھیر میں ناک دکھاؤں گا۔
 دس مور۔ نو مور۔
 اور تجھے کارڈن کی ہوا کھلاؤں گا۔
 باتوں میں گھاتوں میں۔ مجھ کو پھنساتے ہو۔
 جاؤ جی جاؤ کیا گڑیا سمجھتے ہو۔
 صبح سے بیٹھا تھا تیری راہ میں۔
 در سے سر کو پٹکو۔ بوڑھے غمزے...

(شمشاد کا آنا)

شمشاد : جناب حکیم صاحب۔ آداب۔ تسلیم۔ کورنش۔
 کرامت : آئیے حکیم صاحب۔ آئیے حکیم صاحب۔
 شمشاد : جناب میں حکیم نہیں ہوں۔
 کرامت : نہیں جناب۔ یہ آپ کی خاکساری ہے۔ آپ حکیم ضرور ہیں۔
 شمشاد : واللہ۔ جناب میں حکیم نہیں ہوں۔
 کرامت : نہیں ہو تو کون ہو؟
 شمشاد : میں نے ٹھیک سنا تھا کہ یہ پاگل بھی ہے۔ جناب آپ یقین کیجیے کہ میں
 حکیم نہیں ہوں۔
 کرامت : کیوں نہیں ہو۔ ضرور ہو۔

(کرامت شمشاد کو پیٹتا ہے)

شمشاد : اجی ہوں میں حکیم ہوں۔

کرامت : اب آیا سیدھے راستے پر، نامعقول۔

شمشاد : کیا جناب آپ گھونے سے حکمت پڑھاتے ہیں؟

کرامت : جی ہاں۔ جب سے پلیگ میں حکیم مر گئے ہیں۔ مار مار کر حکیم بناتے ہیں؟

شمشاد : خوب۔

کرامت : ابے مجھے جی اسی طرح حکیم بنایا ہے۔ اب بتاؤ تو یہاں کیوں آیا ہے؟

شمشاد : جناب آپ جس لڑکی کا علاج کرنے جاتے ہیں وہ کوئی گونگی نہیں ہے۔ اصل

بات یہ ہے کہ وہ مجھ پر مرتی ہے۔

کرامت : ابے تجھ پر۔ تجھ پر۔ اس جھڑوس شکل پر؟

نصہین : میاں آپ سے اچھی ہے۔

کرامت : چپ بدتمیز۔

شمشاد : اُس کا باپ اس کی مرضی کے خلاف دوسری جگہ شادی کرنے کو تیار ہے۔

نصہین : میں سمجھی یہ گزید گھونٹالا۔ شادی رک جائے اسی لیے اس نے گونگی کا سواگ

نکالا؟

شمشاد : جی ہاں بیگم۔ یہی بات ہے۔

کرامت : ابے بیگم کے بچے اپنی ماں سے کیا کہتا ہے۔ باپ سے بات کر۔

شمشاد : اتنی مہربانی فرمائیے کہ مجھے اپنا نوکر یا دوست یا اور کچھ بنا کر کسی بہانے

سے ساتھ لے جائیے۔

کرامت : ابے میں لے جاؤں۔ تو نے مجھے کوئی ملاؤ خاں دلال جانا ہے۔

شمشاد : لیجیے آپ کا نذرانہ۔

کرامت : اچھا منظور۔ چل ہو جا کا فور۔ لو یہودی اب کھاؤ خنجن اور موتی چور۔

نصہین : اے میرے حکیم تیرا سارا پلیگ دور۔

(سب کا گانا)

مار کھائی حکمت آئی

چلیے چلیے جناب۔ ابھی آیا شباب۔ مار...

کلیات آقا حشر کاشمیری - جلد چہارم

لائے ہیں ٹٹو میاں۔ ٹٹھرو بجر بٹو میاں۔ جاو نکٹھو میاں۔ میں ہارا۔
خوب مارا۔ بھوت اتارا۔ آؤ آؤ جلدی آؤ۔

جا ائے جان۔ ہٹ ٹاوان۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ آہا ہا ہا ہا۔ مار....
جاو حکمت دکھاؤ۔ اور پیسے ٹھک لاؤ، میں ریشم کی ساڑی بناؤں گی۔
اور گوٹے کی انگلیا سلاؤں گی۔

یہ ہے کتنی سی بات۔ سنائی گھات۔ وہ ماری لات۔ مار....

پہلا ایکٹ - چھٹا سین

عزرا کا مکان

(حنا اور مارٹس آتے ہیں)

مارٹس : میری جان حنا اگر ایک کنگال مفلس آدمی کو، اس ملک روم کے قیصر کا تخت و تاج مل جاتا یا ایک دنیا سے ناراض فلسفی کو اس دنیا میں ہمیشہ زندہ اور خوش رہنے کا راز معلوم ہو جاتا تو اسے بھی اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی خوشی مجھے تمہارے ان دل بڑھانے والے لفظوں سے حاصل ہوئی ہے۔

اب سمجھتا ہے یہ قطرہ بھی کہ دریا ہو گیا
روح کو ان پیارے لفظوں سے نشہ سا ہو گیا
آرئی ہیں شادیاں شور مبارکباد ہے
دل مرا اب ایک شہر تہنیت آباد ہے

حنا : میں حیران ہوں کہ اس روز ان انسان نما درندوں کے زور کس قوت نے گھٹا دیے۔ تم میں وہ کون سی چھپی ہوئی طاقت ہے جسے دیکھتے ہی ظالم رومنوں نے اپنے خونی برجھے اور مغرور سرزمین کی طرف جھکا دیے۔

دریا کا جوش رک گیا، طوفان تھم گیا
جو تھا جہاں لرز کے اسی جا پہ جم گیا

مارٹس : پیاری حنا۔ جس طرح اکثر لوگ سانپ اور بچھو کا منتر جانتے ہیں، اسی طرح ان رومنوں پر قابو پانے کے لیے میرے پاس بھی ایک طلسم ہے۔

مجھ پہ ہے قابو ترا اور ان پہ ہے قابو مرا
ایک ساں جس پُ اثر گیسو ترے، جادو مرا
حکا: مگر دیکھنا پیارے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو، کچھ ان کا اثر ہو جائے
اس وفا اور محبت کو نظر ہو جائے
سبق آموز وفا زکس جادو نہ رہے
پھول رہ جائے مگر پھول میں خوشبو نہ رہے

مارکس: پیاری حکا۔ اگر کچھ سنانے ہی کو جی چاہتا ہے تو جی بھر کر سنا لو۔ مگر قال بد
منہ سے نہ نکالو۔

دُر یکتا تمھاری چاہ، یہ جان صدف ہوگی
یہی راحت، یہی عزت، یہی وجہ شرف ہوگی
محبت کی ٹٹہیں مرتے دم تک دیکھ لینا تم
کہ پھٹی بھی پھرے گی تو تمھاری ہی طرف ہوگی

(عزرا کا اندر آنا)

عزرا: ظالم، بے دین، یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ حکا۔ حکا۔
حکا: حکم پیارے آتا۔

عزرا: رومنوں کے بادشاہ کی بھیجی اور ولی عہد سلطنت کی مہکیتر شہزادی آکٹیویا اس
طرف سے گزر رہی تھی۔ اتفاقاً ایک ستون سے ٹکرا کر اس کے رتھ کا پیہہ
چور چور ہو گیا۔ اور اس کا شاعی غرور اپنی غریب رعیت سے پناہ اور مدد
مانگنے کے لیے مجبور ہو گیا۔

مارکس: تو کیا وہ آپ کے یہاں قیام کرنا چاہتی ہے؟

عزرا: ہاں۔ دوسری سواری کے آنے یا پہلی کے درست ہو جانے تک۔ وہ پاک قوم
کی لڑکی ایک ناپاک یہودی کے گھر میں ٹھہرنا چاہتی ہے۔

جو دور رہتے تھے آنے لگے قریب مرے
زہے نصیب تمھارے، زہے نصیب مرے

حنا : تو ابا جان جائیے۔ مہمان بن کر آنا چاہتی ہے تو ضرور بلا لائیے۔
مارٹس : (خود کلامی) آکٹیویا اور عذرا کے گھر میں۔ کیا اپنی مگتیر کی موجودگی میں میرا
راز راز رہ سکے گا۔ (مخاطب ہو کر) ہاں۔ کیا میں ہٹ جاؤں؟
عذرا : کیوں؟
مارٹس : شاید شہزادی ایک غیر شخص کی موجودگی پسند نہ کرے۔
عذرا : تبھی اس ناخواندہ مہمان کے آنے کے بعد تمھاری مدد کی ضرورت
ہوگی۔

(جانا)

مارٹس : (خود کلامی) ۔

یہ بھی دیوانی مری اور وہ بھی دیوانی مری
دیکھیے کیا آفتیں لاتی ہے نادانی مری
چغلیاں کھائے گا گھبرائے ہوئے چہرے کا رنگ
کھول دے گی بھید دونوں پر پریشانی مری
(آکٹیویا کا عذرا کے ساتھ اندر آتا)

آکٹیویا : ہاں عذرا۔ گاڑی کے اتفاقہ ٹوٹ جانے سے مجھے قدرے تکلیف تو ہوئی۔ تا
ہم اس تکلیف میں بھی اپنے لیے ایک طرف کی خوشی محسوس کرتی ہوں۔ اگر
یہ ناشدنی واقعہ پیش نہ آتا تو مجھے اپنے چچا کی ایک وفادار رعیت کے جوہر
پہچاننے اور یہودی قوم کی اخلاقی خوبیوں کو جاننے کا کبھی موقع نہ ملتا۔
عذرا : میں اس نوازش کا ممنون ہوں۔ اگر حضور کے ہم قوم، ہمارے آقا، ہماری جان
و مال کے مالک معزز رومن بھی اپنی رعایا کے ساتھ یہی برتاؤ رکھیں تو میں
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی حکومت چاند اور سورج کی عمر پا سکتی ہے۔

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

آکیویا : (مارکس کو دیکھ کر خود کلامی) تعجب، حیرت۔ کس قدر لمبی جلتی صورت۔ ایک قلم کی دو تصویریں۔ یہودی فریم میں رومن تصویر؟
حنا : (خود کلامی) یہ میرے پیارے کو اس قدر حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہے؟
مارکس : (خود کلامی) ۔

آج توقیر مگنی، بات مگنی، شان مگنی
کچھ بتائے نہ بنے گی، جو وہ پہچان مگنی

آکیویا : عذرا۔ یہ نوجوان شخص کون ہے؟
عذرا : حضور۔ یہ میرے ایک ہم مذہب کی آنکھ کا تارا ہے۔ اور مجھے اولاد سے بھی زیادہ پیارا ہے۔

آکیویا : کیوں جوتا۔ کیا یہ چہرہ دیکھنے والے کے دل میں حیرت پیدا نہیں کرتا؟
جوتا : جی ہاں۔ اگر یہ آدمی یہودی کے لباس میں نہ ہوتا تو میں ضرور شہزادہ مارکس سمجھ کر دو زانو ہو کر اس کے دامن کو بوسہ دیتی۔
عذرا : حضور۔ میں تھوڑی دیر کی غیر حاضری کی معافی چاہتا ہوں۔
آکیویا : خوشی کے ساتھ۔

مارکس : ضرورت ہو تو میں بھی ساتھ چلوں؟
عذرا : ٹھہرو۔ کیا انگاروں کے فرش پر کھڑے ہو؟

(عذرا اور حنا کا جانا)

مارکس : (خود کلامی) ۔

یہ کہاں سے آگئی حیران کرنے کے لیے
اور دروازے نہ تھے کیا اس کو مرنے کے لیے

آکیویا : جوتا۔ میں اس نوجوان یہودی سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے کہہ کہ میرے نزدیک آئے۔
جوتا : ذرا قریب آنا بھائی۔

مارکس : (سائڈ میں) لیجیے۔ مصیبت کفن پھاڑ کر چلائی۔

جونا : اجی نزدیک آؤ۔

مارکس : (سائڈ میں) بی۔ بی۔ جی۔ اس گنہگار چوہے پر رحم فرماؤ۔

جونا : اجی آگے بڑھو..... ہیں پھر رک گئے..... یا حواس؟

مارکس : (خود کلامی) شہزادے صاحب چلیے آگے۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔

آکٹیویا : اس سے پوچھ۔ کہ تمہارا نام کیا ہے؟

جونا : شہزادی صاحبہ دریافت فرماتی ہیں کہ تمہارا نام کیا ہے؟ — کیا گونگے ہو —

میں تمہارا نام پوچھتی ہوں — کیا کہا — کچھ نہیں۔ — حضور ان کا نام 'کچھ نہیں' ہے۔

آکٹیویا : پوچھ۔ کس ملک کے رہنے والے ہو؟

جونا : تمہارا وطن کون سا ہے؟ — اجی اڑھائی سیر کا سر ہلتا ہے ذرا سی زبان نہیں

بلتی۔ نہیں سمجھ — میں پوچھتی ہوں کہاں سے آئے ہو؟ کیا آسمان سے؟

— حضور ان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ یہ چھٹلے سال کی برسات میں اولوں کے

ساتھ زمین پر ٹپک پڑے ہیں۔

آکٹیویا : جونا۔ میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کبھی حیرت زدہ نہیں ہوئی جتنی آج

اس کی اور اپنے پیارے کی ملتی جلتی صورت دیکھ کر ہوئی ہوں۔ —

دل پوچھ رہا ہے آنکھوں سے، یہ بہتر یا وہ اعلیٰ ہے

قدرت نے ایک ہی سانچے میں کیا دو سکوں کو ڈھالا ہے

(عزرا اور حنا کا دوبارہ آنا)

حنا : (خود کلامی) —

آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں ہونٹوں پہ اگرچہ تالا ہے

جس چاند کی میں دیوانی ہوں کیا یہ بھی اسی کا ہالا ہے

عزرا : (خود کلامی) —

اس کے بھی رنگ عجب سے ہیں اس کا بھی طور نرالا ہے
ہے یہ بھی چپ اور یہ بھی چپ کچھ دال میں کالا کالا ہے

(سپاہی کا آنا)

سپاہی : حضور عالیہ۔ سواری تیار ہے۔ صرف حضور کا انتظار ہے۔
آکٹیویا : اچھا عررا۔ میں نے تمہیں بہت تکلیف دی۔ اگر پھر کبھی اس طرف سے
گذری تو ضرور تم سے ملنے کی خوشی حاصل کروں گی۔
عررا : حضور کی رعیت نوازی سے مجھے ایسی ہی امید ہے۔

(آکٹیویا، جوتا اور سپاہی کا جانا)

مارکس : (خود کلامی) ۔

میں تو سمجھتا تھا، کہ پوری آج رسوائی ہوئی
خیر گذری، ٹل گئی، سر سے بلا آئی ہوئی

حنا : (خود کلامی) ۔

رنگ فق، منہ زرد، بھڑائی ہوئی آواز ہے
اس پریشانی کے پردے میں یقیناً راز ہے

(مخاطب ہو کر) کیا اس رومن شہزادی کو جانتے ہو؟

مارکس : اتنا ہی جتنا کہ تم جانتی ہو۔

حنا : یہ شہزادی تم سے واقف ہے؟

مارکس : اتنا ہی جتنا وہ تم سے واقف ہے۔

حنا : ہوں۔ اس روز رومن سرداروں کا ایک بیک تمہارے آگے جھک جانا، آج

شہزادی آکٹیویا کا تمہیں دیکھ کر حیرت میں آنا ظاہر کرتا ہے کہ تم پر اندھا
بھروسا عقل کا قصور ہے۔ تمہارا رومنوں سے کوئی نہ کوئی پوشیدہ تعلق ضرور

ہے۔

مارکس : پیاری حنا۔ اس بات کا جواب دینے کی نہ مجھ میں جرأت ہے اور نہ میں

اس کی ابھی ضرورت سمجھتا ہوں۔ ۔

یہ قصہ طول ہے، سننا کبھی، فی الحال جانے دو
تصمیم معلوم ہو جائے گا سب کچھ، وقت آنے دو

(حنا کا گانا)

تو پہ میں واری پیا۔ چھین لیا ہے جیا۔ پریم کا مارا موہے بان۔
رنگ رنگیلے، چھیل چھیلے۔

ہو تم پر دل جانی۔ آرام زندگانی، یہ اٹھتی جوانی۔ تو پہ میں....

نٹ کھٹ دل لینے والے۔ کیسے ہو بھولے بھالے۔

نیناں یہ کالے کالے۔ پی کر مدھ کے پیالے۔

جھومت جیسے متوالے۔ ابرو یہ برجھی بھالے۔

جس سے جینے کے لالے ہیں۔ تو پہ میں....

(دونوں کا جانا)

پہلا ایکٹ - ساتواں سین

مکان

(نرگس کا گاتے ہوئے آنا)

کیا قاتل نے دل پہ نگاہوں کا دار۔

میری ہائے۔ جان جائے۔

پیا پیارے نے پریم کی ماری کٹار۔ کیا قاتل....

گالوں پہ لالی۔ کانوں میں بالی۔

سو ہے سر پہ ڈوپٹہ گل انار۔ کیا قاتل.....

مرے جوین پہ لاکھوں چھائی بہار۔

کون دیکھے پیا بن نکھار۔

چھپلا آؤ۔ من لبھاؤ۔ جاؤں میں ٹار۔ کیا قاتل....

نرگس : زہر، آگ، سمندر، ڈکھ، بیماری یہ سب آدمی کے دشمن ہیں۔ مگر جس دشمن کا

کوئی علاج نہ ہو وہ عشق ہے۔ مَوا عشق اگر تلوار ہو تو اس کے روکنے کے

لیے ڈھال بتائے۔ درد ہو تو دوا کھائے۔ پلگ ہو تو شہر سے بھاگ جائے۔

مگر یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اس کا علاج کیا کیا جائے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دل

موسا کرو اور موئے کے نام کو کوسا کرو۔ میں نے اس عشق کی بدولت یہ سو

انگ رچایا ہے۔ اپنے پیارے سے ملنے کے لیے اپنے آپ کو گونگا بنایا ہے۔

جان دی کتنوں نے اس مٹھی کے پالے پڑ کر

یا خدا ناس ہو یہ عشق مَوا سڑ سڑ کر

یہودی کی لڑکی

(نرس کا جانا اور سرخاب، کریم، رحیم اور کرامت کا باری باری سے آنا)

سرخاب : اے کریم۔ تو نے عجیب اُس حکیم کا حال بیان کیا ہے۔
کریم : مگر حضور علاج میں یکتائے زمانہ ہے۔ اس نکلنے کی تانی کی قسم بقراط کا
بنا ہے۔
رحیم : لیجیے حکیم صاحب بھی آگئے۔

(کرامت اور شمشاد کا آنا)

سرخاب : آئیے حکیم صاحب۔
کرامت : خوش رہو۔
سرخاب : آداب۔
کرامت : جیتے رہو۔ مرد تو بخشنے جاؤ۔ اگر جنت کے اسپتال میں جگہ نہ ملے تو جہنم
کے قرنطینہ میں جگہ پاؤ۔
سرخاب : (سانڈ میں) واقعی کچھ سڑی معلوم ہوتا ہے۔
کرامت : کیوں حکیم صاحب ٹھیک ہے نا؟
سرخاب : جناب میں کوئی حکیم نہیں ہوں۔
کرامت : جناب آپ ضرور حکیم ہیں۔
سرخاب : آپ کی قسم میں حکیم نہیں ہوں۔
کرامت : آپ کے باپ کی قسم آپ حکیم ہیں (مارتا ہے) آپ کو کہنا پڑے گا کہ میں
حکیم ہوں۔

سرخاب : اے کریم تو کس فخر کو بلا لایا۔
کریم : میں نے ان کے جھک پنے کا حال آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔
سرخاب : ایسے مٹھلی کی ایسی تھپی۔ نکال دے ایسے پاگل حکیم کو، مجھے ضرورت نہیں
ہے۔

کرامت : ہیں۔ حکیم سے یہ گستاخی۔ لا میرے آنے کی فیس، تیرے ریس کی ایسی
تھپی۔

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

کریم : معاف کیجیے گا۔ آپ کو حکیم ہو کر اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے۔

کرامت : درست ہے۔ کیوں جناب آپ کی طبیعت کچھ سُست ہے؟

کریم : نہیں نہیں۔ بہت اچھی ہے۔

کرامت : آپ اچھے ہیں یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔

کریم : کیوں اس کا مطلب؟

کرامت : اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے چہرے کا رنگ.....

سرخاب :کچھ نرالا ہے۔

کرامت : کیونکہ آپ کو کل یا پرسوں....

سرخاب :بخار آنے والا ہے۔

کرامت : اتنی نہیں پلگ ہونے والا ہے۔

کریم : ہیں۔ حکیم صاحب اس کا کچھ علاج؟

کرامت : علاج؟ اذھ ہوں۔

سرخاب : کیا کہا حکیم صاحب۔ کچھ بولے۔

کرامت : ارے میرے گھمبارے باپ۔ تم تو گھاس کاٹتے کاٹتے ہو گئے فوت۔ اب

علاج کیا بتاؤں۔ آئی موت۔

سب : موت؟

سرخاب : (روتے ہوئے) حکیم صاحب موت؟

کرامت : ہاں روؤ۔ اچھی طرح روؤ۔ اس کی قسمت پر روؤ۔ اور میری حالت پر روؤ۔

سرخاب : کیوں کیوں۔ حکیم صاحب آپ کی حالت پر کیوں روئیں۔

کرامت : اس لیے کہ مجھے زبردستی حکیم بتلائے ہیں۔

سرخاب : عجیب دگی باز شخص معلوم ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کیا آپ میری لڑکی کا علاج

نہیں کرنا چاہتے؟

کرامت : جی کیوں نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کا گھر بھر بیمار ہو جائے تو سب کا

علاج کروں۔

(نرگس کا آنا)

سرخاب : لہجے حکیم صاحب بھی لڑکی ہے۔ جو آج چار دن سے گونگی ہو گئی ہے۔
 کرامت : کیوں لڑکی تیرا کیا حال ہے؟
 نرگس : ایں ایں ایں۔
 کرامت : بھئی یہ تو سرگم گاتی ہے۔ جی آپ کی بولی میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔
 نرگس : نی نی نی۔
 کرامت : لو نکھاد کے سر شروع ہو گئے۔ لڑکی تیرا کیا حال ہے؟
 سرخاب : اجی حکیم صاحب جواب کس طرح دے۔ اس کی زبان تو بند ہے۔
 کرامت : زبان بند ہے تو اتنا بول دے کہ میں گونگی ہوں۔
 سرخاب : آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ علاج کی طرف توجہ فرمائیے۔
 کرامت : اچھا تو آپ دوسرے کمرے میں چل کر غپ شب اڑائیے۔ میرا شاگرد اس کا علاج کرتا ہے۔
 سرخاب : آئیے آئیے۔ تشریف لائیے۔

(سب کا جانا)

شمشاد : لو حکیم اب تو زبان کھولو۔
 نرگس : آں آں آں۔
 شمشاد : اجی آں آں چھوڑ کر صاف بولو۔
 نرگس : ای ای ای۔
 شمشاد : بس حکیموں سے دل کا مرض نہ چھپاؤ۔ آنکھ سے آنکھ ملاؤ۔
 نرگس : کون؟ میرا شمشاد پیارا۔
 شمشاد : واللہ۔ تم نے غضب کی چال نکالی۔ دل آرا۔

(کریم کا دوسرے کمرے سے جھانکنا)

کریم : ہیں یہ دال میں کالا (چھپکنا)

زرگس : اجی کل سے میری کتیا کو زکام ہو گیا ہے۔

(سرخاب کا آنا)

سرخاب : کیوں بے رذالے۔ یہ طور نکالے۔ تو میری لڑکی کا علاج کر رہا ہے۔

شمشاد : احسان ماننے صاحب۔ میں نے آپ کی گونگی لڑکی کو بولنا سکھا دیا۔

سرخاب : بڑی مہربانی۔ جتنی رہے تیری ثانی۔ مگر ہاں مجھے کچھ گڑبڑ گھٹلا نظر آتا ہے۔

یہ حکیم کے لباس میں کوئی اور معلوم ہوتا ہے۔ کیوں جناب آپ ایک مہربانی فرمائیں گے۔ مجھے اپنا نام بتائیں گے۔

شمشاد : جی میرا نام۔ میرا نام ہے نام.....

سرخاب : سمجھا سمجھا۔ یہ کوئی حکیم و حکیم نہیں ہے۔ یہ ہے مردود شمشاد۔

شمشاد : جی ہاں۔ بندہ ہی ہے آپ کا ہونے والا داماد۔

سرخاب : چل داماد کا بچہ۔ ورنہ کھا جاؤں گا کچا۔

زرگس : میری بیٹی ابا جان۔

شمشاد : پہلے میری بیٹی نیک فرجام۔

سرخاب : چپ رہو بد لگام۔ ایک ایک کہو۔ ایک ایک کی سنوں گا اور ایک ایک کو

جواب دوں گا۔

شمشاد : اچھا تو پہلے میری بیٹی حضور عالی۔

زرگس : جی پہلے میری بیٹی جناب عالی۔

سرخاب : پھر وہی نالائق۔

شمشاد : اصل حال یہ ہے۔

زرگس : باعث طال یہ ہے۔

سرخاب : نہیں مانتے بد زبانو۔

زرگس : اچھا میری بات مانو۔

سرخاب : اچھا تو ہی بک مردار۔

شمشاد : میں کہتا ہوں سرکار۔ میں آپ کی لڑکی کا عاشق ہوں۔

یہودی کی لڑکی

سرخاب : عاشق عاشق۔ ابے تو کس سے پوچھ کر عاشق ہوا؟
شمشاد : جناب ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر مرتے ہیں۔

سرخاب : پیار، عشق، مرنا۔ ارے کم بخت کیا تمام دنیا مر گئی تھی۔ تجھے میری لڑکی ہی مرنے کو تھی۔

نرگس : ابا جان ہم پر رحم فرمائیے۔ ورنہ میں زہر کھالوں گی۔ اپنی جان دے دوں گی۔
سرخاب : واہ بھی۔ یہ کلجک کا زمانہ ہے۔ جوان لڑکیاں عشق کرتی ہیں۔ نوجوانوں پر مرتی ہیں۔

شمشاد : ہونے والے سر صاحب۔ اب بات کو زیادہ طول نہ دیجیے۔ مجھے اپنی دامادی میں قبول کیجیے۔

(کرامت کا آنا)

کرامت : بس اب قصہ تمام کیجیے۔ نکاح کا انتظام کیجیے۔
سرخاب : واہ حکیم صاحب واہ۔ آپ نے خوب میری بیٹی کا علاج فرمایا کہ اس کو عشق کے جال میں پھنسیا۔ اچھا تو اب آپ ہی قاضی بن جائیے اور نکاح پڑھائیے۔

کرامت : لائیے نذرانہ دلوائیے۔
سرخاب : لیجیے اب ہلایے ہونٹ۔ یہ حاضر ہے سو روپے کا نوٹ۔
کرامت : مگر یہ تو جعلی معلوم ہوتا ہے۔
شمشاد : اجی حکیم صاحب۔ آپ نے کون سی محنت کر کے کمایا ہے۔ مفت ہاتھ آیا ہے۔ اب دیر نہ لگائیے۔ نکاح پڑھائیے۔ اور میری طرف سے یہ بیس روپیہ کا نوٹ قبول فرمائیے۔

کرامت : (ہاتھ ملا کر)۔

پیازم ٹائٹ کرٹیم کرٹلا۔ سپاٹم سپٹم گھوٹیم گھوٹلا
روٹل کے چھے رہیں بہن بھیل۔ نکاح ختم شد لاؤ پنجم روٹیا

(سب کا مل کر گانا)

رنگ رلیاں۔ کرو خوشیاں۔
مل مل شاداں۔ مل مل شاداں۔ مل مل...
ہے گل اور بلبل کا جوڑا نایاب۔ جوڑا نایاب۔ جوڑا...
ہوں اررر۔ ہوں اررر ہوں میں حیران۔
چل پرے ہٹ۔ چل پرے ہٹ۔ دور ہو شیطان۔
جاتے ہیں سب کو آداب۔ رنگ رلیاں.....

پہلا ایکٹ - آٹھواں سین

باغ

(مارکس اور عطا کا ہاتھ کرتے دکھائی دیتا)

عطا : بس بس۔ میں اب تشویش اور خوف کی حالت میں ایک نامعلوم مدت تک رہتا نہیں چاہتی۔

مارکس : دماغ خیال کا اور خیال لفظوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ مجھے جواب دینے کے لیے کچھ مدت دو۔

عطا : بس آج ہی یا کبھی نہیں۔ میرا دل اس کانٹے کی چیم کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ رنج جائے یہ تکلیف و اضطراب مئے
کہو کہو کہ کسی طرح یہ عذاب مئے

مارکس : تو پیاری عطا۔ حقیقت کے چہرے سے نقاب دور ہوتی ہے۔ دیکھو اصلیت کی بھیاں کھل دیکھ کر خوفزدہ نہ ہونا۔ نفرت نہ کرنا۔ میں آج تک یہودی کے لباس میں ایک دھوکے باز عاشق کا پارٹ کر رہا تھا۔ آہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اچھا سوچ یہ ہے کہ۔

ہر اک گمان الگ ہے ہر اک یقین الگ
تمہارا دین الگ ہے ہمارا دین الگ

عطا : تو کیا تم ہمارے ہم مذہب نہیں ہو؟

کلیات آفاشر کا شمیری - جلد چہارم

مارکس : نہیں۔ میں تمہارے مذہب کے دشمنوں کی ڈالی ہوئی بنیاد ہوں۔ یعنی رومن خون اور رومن باپ کی اولاد ہوں۔

حکا : تم یہودی نہیں ہو؟

مارکس : نہیں۔

حکا : تو پھر تمہیں یہودی بننے کو کس نے کہا؟

مارکس : تمہاری محبت نے۔

حکا : تمہیں ایک یہودی لڑکی کے ساتھ محبت کرنے کی جرأت کس نے دلائی؟

مارکس : تمہاری صورت نے۔

حکا : آف نور میں نار۔ گل میں خار۔ شربت میں کف مار۔ زہریلا سانپ اور گلے کا ہار۔

کیوں الجھتا اپنا دامن، گر نہ پھنستی بھول میں

مجھ کو کیا معلوم تھا کاٹنا چٹھا ہے بھول میں

میری بربادی کا آخر کچھ سبب بتلا مجھے

کیا خطا تھی میری تو نے کیوں دیا دھوکا مجھے

مارکس : حکا۔ زندگی سے زیادہ عزیز حکا۔

عطیہ ہے یہ نیرنگ طلسم آب و گل تیرا

یہ جسم ان رومنوں کا ہو تو ہو لیکن ہے دل تیرا

یہودی ہوں کہ رومن ہوں۔ میں نوری ہوں کہ تاری ہوں

کوئی ہوں کچھ ہوں لیکن تیری صورت کا پجاری ہوں

حکا : بس بے درد بس۔ ایک دغا باز رومن ایک معصوم یہودی لڑکی کے چہرے کی

طرف دیکھنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

مارکس : تو کیا تم میری مجبور یوں کا خیال کر کے میرا گناہ نہیں معاف کر سکتیں؟

حکا : نہیں۔

مارکس : میری نہیں ہو سکتیں؟

حنا : نہیں۔

مارٹس : کیا اپنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھ میں نہیں دے سکتیں؟

حنا : نہیں۔

مارٹس : تو کیا اپنا دل مجھ سے پھیر لوگی؟

حنا : آہ کاش یہ ممکن ہوتا۔ مگر نہیں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں ہو سکتا۔

بے وفا دنیا کی اب تک جانتا رہیں نہیں

دل کے میں بس میں ہوں لیکن دل مرے بس میں نہیں

(عمر کا آنا اور محب کر دونوں کی باتیں سننا)

مارٹس : تو پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے کیوں انکار ہے؟

حنا : اس لیے کہ اس دل پر میرا قبضہ ہے مگر اس ہاتھ پر میرے باپ کا اختیار ہے۔

مارٹس : مگر تمہارا باپ جو اپنے قوی رسم و رواج کا سخت پابند ہے وہ خوشی سے اپنی لڑکی کا ہاتھ ایک رومن کے ہاتھ میں دینا کیونکر گوارا کرے گا؟

حنا : تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں؟

مارٹس : تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے بھاگ کر کسی دوسرے ملک میں پوشیدہ طور سے اپنا نکاح پڑھائیں گے اور پھر ایک جان دو قالب بن کر لوٹ آئیں گے۔

حنا : اس خفیہ شادی کو میرا باپ کیونکر منظور کرے گا؟

مارٹس : جب عقد ہو گیا تو اُسے مجبوراً قبول کرنا ہوگا۔

ہے ایسا کون رد کر دے جو قسمت کے نوشتے کو

کوئی طاقت نہیں جو توڑ دے اس پاک رشتے کو

حنا : یا خدا۔ یہ تو مجھے بھاگنے کو کہتا ہے۔ اب میں۔ پھر...

مارٹس : یہ کیا؟ تم کانپ رہی ہو؟ حنا کل کا سیکھ آج کے فیصلے پر موقوف ہے۔

تھیں ہو آرزو اپنی، تھیں ہو بس خوشی اپنی
تمھاری ایک ہاں پر منحصر ہے زندگی اپنی
امیدیں جی انھیں وہ لفظ منہ سے میری جاں کہہ دو
میں صدقے پیارے ہونوں کے لب نازک سے ہاں کہہ دو
حنا : نہیں بے درد۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

بنوں گی خاک، مٹا دوں گی اپنے آپ کو میں
مگر نہ دی نہ دعا دوں گی اپنے باپ کو میں
مارکس : اگر تھیں انکار ہے تو پھر میرا اس دنیا میں جینا بیکار ہے۔
مری خوشی مری راحت تری نہیں تک تھی
سمجھ گیا کہ میری زندگی یہیں تک تھی
اسی طرح سے بس اب یہ عذاب کم ہوگا
نہ دم رہے گا نہ اس دم کے ساتھ غم ہوگا
(اپنے آپ کو خنجر مارنے کی کوشش کرتا ہے)

حنا : ٹھہرو۔ پیارے ٹھہرو۔
مارکس : بس ہاں یا نہیں۔ ایک لفظ۔
حنا : تھوڑی دیر۔ غور کرنے کے لیے، تھوڑی دیر۔
مارکس : ایک منٹ نہیں۔
حنا : آہ...
مارکس : بس کہو کہ مجھے منظور ہے۔
حنا : لے چل خوبصورت جادوگر، لے چل۔ حنا اس دل سے مجبور ہے۔

تیری ہوں، تیرے ساتھ ہوں، دیتی ہوں زباں میں
اب سایہ کے مانند جہاں تو ہے وہاں میں
مارکس : تو اپنے باپ کو خبر ہونے سے پہلے یہاں سے نکل چلو۔

جیسے یہ جسم و روح ہیں ویسے ہی ساتھ دو
لو آؤ اب چلو، مرے ہاتھوں میں ہاتھ دو

(دونوں جانا چاہتے ہیں کہ عذرا سامنے آجاتا ہے)

عذرا : ٹھہرو۔ کہاں جاتے ہو؟ کہاں بھاگ کر بچنا چاہتے ہو؟ ۔

یہ پھانس اس زندگی میں چھ کے مشکل سے نکلتی ہے
ڈرو اس بد دعا سے جو جلے دل سے نکلتی ہے
تمھاری آرزو دنیا سے خالی ہاتھ جائے گی
جہاں جاؤ گے میری بد دعا بھی ساتھ جائے گی

حنا : رحم۔ پیارے ابا ہم گنہگاروں پر رحم۔

عذرا : رحم۔ ایسے نابکار پر؟ رحم تجھ جیسی نابھار پر؟ کیا اسی دن کے لیے میں نے
تجھے پالا تھا؟ اور کیوں او رومن قوم کے نبس کتے۔ جس نے ہمیشہ محبت سے
تیری پیٹھ کو تھپتھپایا۔ جس نے تجھے شریف اور وفادار سمجھ کر تیرے منہ پر ٹھوکر
مارنے کے بدلے تجھے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھایا۔ اسی محسن کے کلیجے میں
اپنے زہری دانت گڑونے کے لیے تیار ہوا۔ ۔

قہر خدا سے گڑ نہ گیا، تو زمین میں
کیا بے وفائی جرم نہیں تیرے دین میں
وہ بات کی نہ تھی جو، گمان و یقین میں
اک سانپ گویا پالا تھا اس آستین میں
کیا جانتا تھا مہر کے پردے میں قہر ہے
آب بقا میں سمجھا ہوں جس کو وہ زہر ہے

حنا : ابا۔ پیارے ابا۔ بے شک ہم دونوں محبت کرنے کے مجرم ہیں۔ مگر ہمارا جرم
گناہ کی آلودگی سے پاک ہے۔ اس لیے ہم سے نفرت کرنا انصاف کے
خلاف ہے۔

مارگس : ۔

ہے پاک گناہوں سے ہماری یہ خطا بھی
غارت ہوں، اگر ہم کو بدی نے ہو چھوا بھی
ہم چشمہ الفت میں ہیں مانند کنول کے
جو پانی کے اندر بھی ہے پانی سے جدا بھی

عزرا : تو کیا تم محبت کرنے کے سوا اور ہر طرح بے قصور ہو۔ چاند کی طرح اس
زمین کی برائیوں سے دور ہو؟
مارگس : ہاں بزرگ عزرا۔ ایسا ہی ہے۔ ۔

پرداز کی طاقت تھی مگر پر نہیں نکلے
اخلاق کے قانون سے باہر نہیں نکلے
یہ قلب و جگر پاک ہیں، یہ دیدہ تر پاک
اللہ ہے شاہد کہ ہے دل پاک نظر پاک

عزرا : افسوس۔ میں نے کیا سوچ رکھا تھا اور یہاں کیا واقعہ رو بہ کار ہے۔ سچ ہے
جس طرح دریا کی رو کے سامنے ایک تنکا بے بس ہے۔ اسی طرح تقدیر
کے آگے تدبیر ناچار ہے۔ ۔

مجھ کو ہے خیال اور انھیں مد نظر اور
آرمان طبیعت میں ادھر اور ادھر اور

حکا : ۔ پیارے ہا۔

عزرا : سالومن۔ غیر قوموں کے خون سے سینی ہوئی سرزمین ظلم پر حُسن کا قلعہ نہیں
ہے۔ روم کے محفل افروز کنواریوں کی موجودگی میں حکا کو دل دینے کا
باعث؟

مارگس : اس کی دلفریب صورت۔ اور صورت سے زیادہ اس کی سیرت۔

عزرا : تو کیا تم اسے عزیز رکھو گے؟

مارگس : اپنی جان کی طرح۔

عزرا : اس کی عزت کرو گے؟

مارٹس : اپنے ایمان کی طرح۔

عزرا : اس کی حفاظت کرو گے؟

مارٹس : اپنی آبرو اور شان کی طرح۔

عزرا : اچھا تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں اور خوشی سے اس کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں دیتا ہوں آگے بڑھو۔ دو زانو ہو — نہیں سنا۔ دو زانو ہو۔

مارٹس : کیا آپ مجھ سے کوئی مزید اقرار کرانا چاہتے ہیں؟

عزرا : ہاں۔ بغیر مذہب بدلے۔ ایک رومن۔ یہودی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔

اس لیے سب سے پیش تر تمہیں اسرائیلی عقاید کی تعلیم دے کر اپنے مذہب میں لاؤں گا اور پھر موسوی شریعت کے مطابق تم دونوں کا ہاتھ ملا کر باپ کے فرض سے ادا ہو جاؤں گا۔

مارٹس : تو کیا مجھ کو خطائے محبت کے جرمانے میں اپنا مذہب دینا ہوگا؟

عزرا : ہاں۔ اگر تم سچے ہو، ایمان دار ہو، اپنے دل کی انگوٹھی کا ٹھکانہ بنانے کے لیے اس ہیرے کو خریدنا چاہتے ہو۔ تو اس کی قیمت صرف تمھارا مذہب ہے۔

حکا : پیارے۔ میرے پیارے۔

سوچ میں کیوں پڑ گئے آخر ہو کوئی بات بھی

ہاں کہو، مل جائے تاکہ دل کی صورت ہاتھ بھی

مارٹس۔

کس کو چاہوں، کس کو چھوڑوں نکلتا میں جان ہے

اک طرف یہ حور ہے اور اک طرف ایمان ہے

عزرا : جواب دو۔ کیا خیال ہے؟

مارٹس : میں حکا کو چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر اپنا مذہب چھوڑنا محال ہے۔

عزرا : تو پھر نہیں؟

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

مارکس : نہیں۔

عزرا : انکار؟

مارکس : لاچار۔

عزرا : دوری؟

مارکس : مجبوری۔

ساری دنیا سے زیادہ یہ شکر لب مجھ کو
اور اس سے ہے زیادہ مرا مذہب مجھ کو
ایسی شے سہل میں انسان نہیں دے سکتا
جان دے سکتا ہے، ایمان نہیں دے سکتا

عزرا : تب کیا۔ رومن قوم کے ذلیل کتے۔ کیا تو معصومیت کے معبد میں گناہوں
کی بدبو پھیلانے۔ فسق و فجور کا جال بچھا کر ایک بھولی بھالی لڑکی کو حرام
کاری کا راستہ بتانے آیا تھا۔

رسائی کی پیدا میرے گھر میں، عزیز، ہمدرد و یار بن کر
مگر یہ ٹھانے ہوئے تھا دل میں کہ باغ اجاڑے بہار بن کر
دعا اور اس سے دعا، بھروسا کیا تھا جس نے مدام تجھ پر
زمیں سے نفریں، فلک سے لعنت، پڑے گی ہر صبح و شام تجھ پر

حکا : پیارے۔ میرے پیارے۔ یہ کیا؟

ہم وہی اور تم وہی پھر یک بیک کیا ہو گیا
با وفا دل آج کیوں بے درد ایسا ہو گیا
جان لو دل کی گلی کی قدر اب بھی جان لو
یہ نہ میں کہنے کو رہ جاؤں کہ دھوکا ہو گیا

مارکس : میری قوت فیصلہ بیکار ہو گئی۔ میرے چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ اب
مجھے جانے دو۔

عزرا : ٹھہرو۔ ایک یہودی جس کے سر کے بال تمہاری قوم کے ظلم سہتے سہتے سفید

یہودی کی لڑکی

ہو گئے ہیں۔ جانے سے پہلے اس کے جلے اور دکھے دل سے نکلے الفاظ سنتے جاؤ۔ جس قہار و جبار کے بڑے جلال نام کی قسمیں کھا کھا کر تم نے مجھے اور اسے دھوکا دیا ہے۔ جس حاضر و ناظر ہستی کو گواہ کر کے ایک معصوم و بیشیزہ کو ٹھگا ہے، وہ بے کس نواز، وہ منصف، وہ مستم حقیقی خدا تمہیں بغیر سزا دیے کبھی نہ چھوڑے گا۔ جس بے رحمی سے تم نے اس غریب کا دل توڑا ہے۔ اسی بے دردی سے وہ تمہارا غرور توڑے گا۔

کزحمو، تڑپو، جلو، دل چور چور اور آنکھ بڑے نم ہو
خدا کی نعمتیں ہوں، جاؤ، تم ہو، اور جہنم ہو
(پردہ)

دوسرا ایکٹ - پہلا سین

شای محل

(مارکس اور آکٹیویا کا آتا)

مارکس : پیاری آکٹیویا۔ احق، شرابی اور پاگل، ان میں سے کوئی جرم کرے تو درگزر کی جاسکتی ہے مگر جس گناہ میں عقل تمیز اور ارادہ شامل ہو اس سے چشم پوشی نہیں ہو سکتی۔ میں کس منہ سے معذرت پیش کروں؟۔

ہے زباں بھی بند، لب ہائے خن پرداز بھی
دم بخود ہے نطق بھی اور نطق کا اعجاز بھی
ہونٹ تک آتے حجاب آتا ہے لفظِ عذر کو
چھپ کے بیٹھی ہے گلے میں، شرم سے آواز بھی

آکٹیویا : میرے دل کے مالک۔ انسان اور غلطی ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ جو گناہ نہیں کرتا وہ بے شک سزاوار توصیف ہے۔ مگر جو گناہ کر کے تادم ہوتا ہے اور تلافی کرتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف ہے۔

مارکس : تب تم میری گزشتہ بے اعتنائیوں کو معاف کرتی ہو؟
آکٹیویا : میرے پیارے بار بار معافی کا لفظ دُہرا کر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو؟۔

رحم اور درگزر بھی ہو عفو سزا بھی ہو
سو بار میں معاف کروں پر خطا بھی ہو
قبضہ ہے دل پہ، جان پہ، عقل و تمیز پہ
آقا کو اختیار ہے اپنی کنیر پہ

(آکٹیویا کا جانا)

مارکس : (خود کلامی) دعا باز مارکس۔ بے وفا رومن۔ تو کتنا ذلیل شخص ہے؟ کہ زبان سے آکٹیویا کے ساتھ محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ مگر تیرا دل ابھی تک خدا کو پیار کر رہا ہے۔ کیا ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرے گا؟ کیا ایک شریف یہود کی زندگی اس رومن شہزادی کا بھی حال و مستقبل تباہ کرے گا؟ ۔

بس اب بھی باز آ، وہ کام کیوں بے دین کرتا ہے
کہ جس پر خود ترا دل تجھ کو سو نظرین کرتا ہے

(جانا چاہتا ہے کہ خدا آتی ہے)

خدا : ٹھہرو۔ ۔

جاتے کہاں ہو مجھ کو ٹھکانے لگا کے جاؤ
مارا ہے جس کو اس کا جنازہ اٹھا کے جاؤ

مارکس : خدا۔ تم اور یہاں؟

خدا : ہاں۔

مارکس : کیوں آئیں۔ کس کے پاس آئیں؟

خدا : اپنے صیاد کے پاس۔ قتل کر کے بھول جانے والے جلاد کے پاس۔ ۔

بے کس پہ ستم حد سے گذر کر نہیں کرتا
اس طرح کلیجہ کوئی پتھر نہیں کرتا
دنیا میں ہیں صیاد بھی، جلاد بھی، لیکن
جو تو نے کیا کوئی ستم مگر نہیں کرتا

مارکس : خدا۔ جب تک ستار کے تار آپس میں ملے رہتے ہیں، تبھی تک ان میں سے

ایک دل بھانے والا سر بلا نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ تمہارے باپ کی
ضد نے ٹھوکر مار کر اُس محبت کے ساز کا تار تار الگ کر دیا ہے۔ اس
ٹوٹے ہوئے ساز سے دوبارہ محبت کا زحرمہ پیدا ہونا محال ہے۔ پہلے میرا

کچھ خیال تھا اور اب کچھ اور خیال ہے۔۔

اب نہ وہ بات رہی اور نہ وہ جوش مجھے
تم بھی اب میری طرح کر دو فراموش مجھے

حکا : اگر یہی ارادہ تھا۔ آئندہ چل کر دھوکا ہی دینا تھا۔ تو ایک بھولی بھالی معصوم لڑکی کو جو جوان ہو کر بھی، محبت کیا ہے؟ محبت کیوں کرنی چاہیے؟ محبت کس سے کرنی چاہیے؟ ان باتوں سے مطلق خبردار نہ تھی۔ کیوں اس انہلی نا سمجھ کو دوزانو بیٹھ کر، آنسو بہا کر، گڑگڑا کر، قسمیں کھا کر اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلایا؟ کیوں اپنے ہونٹوں سے اس کی زندگی کے آب حیات میں زہر ٹپکایا؟ آہ۔۔

تھیں ہو، پھونک ڈالا ساتھ دل کے، جان و تن جس نے
بگاڑا ہے یہ مگر جس نے، اُجاڑا ہے جن جس نے
تم اپنا ظلم اس آنکھ، اس دلِ رنجور سے دیکھو
ہمارا گھر جلع، اور تم تماشا دور سے دیکھو

مارٹس : حکا۔ تمہارا حُسن، نیکی، عصمت، شرافت، ابھی تک یہ تمام چیزیں پاک امانت کی طرح اچھوتی ہیں۔ اس لیے بد بخت عورت، قسمت اور اپنے باپ کے فیصلے پر صبر کرو۔ کیونکہ اس مجبورانہ جدائی کے، یہی دونوں ذمہ دار ہیں۔ جاؤ۔ مجھ سے اچھے اور مجھ سے زیادہ قابل لوگ تمہاری قدر کرنے کو تیار ہیں۔۔

بدلا جو میں نے تم بھی بدل ڈالو طور کو
جو دل مجھے دیا تھا وہ دے ڈالو اور کو

حکا : یہ تم جیسے بے دید اور طوطا چشم مردوں کا شیوہ ہے۔ جس طرح ایک سچا خدا پرست انسان، دوسرے خدا کی خدائی کا اقرار نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک وفادار اور شریف عورت بھی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو پیار نہیں کر سکتی۔۔

عمر بھر کو تجھ پہ صدقے جان میری ہو چکی
تو نہ ہو میرا، مگر میں دل سے تیری ہو چکی

مارٹس : خا۔ تم آج سے پہلے مجھے کیا سمجھتی تھیں؟

خا : ایک نیک یہودی۔

مارٹس : اور اب کیا سمجھتی ہو؟

خا : ایک بے وفا رومن۔

مارٹس : لیکن میں نہ وہ تھا نہ یہ ہوں۔

خا : تو پھر۔

مارٹس : میں سلطنت روم کا ولی عہد یعنی اس ملک کا ہونے والا شہریار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنا مذہب تبدیل کرنے سے لاچار ہوں۔

خا : تم ولی عہد ہو؟ اس ملک کے ہونے والے بادشاہ ہو؟

مارٹس : ہاں۔ اب تم ہی منصف ہو۔ اگر میں تمہارے باپ کی شرط منظور کر لیتا تو مجھے مذہب کے ساتھ سلطنت کی امید بھی چھوڑ دینی پڑتی۔

خا : تو کیا سلطنت سچی محبت سے زیادہ قیمتی ہے۔ شامی تخت عورت کے پاک دل سے زیادہ مقدس ہے۔ غلاموں اور درباریوں کا شور تہائی میں گونجتی ہوئی پیار کی راگنی سے زیادہ میٹھا ہے۔ شہزادے صاحب۔ اگر مرد کو دنیا میں عورت کی سچی محبت مل جائے تو اسے سلطنت کیا بہشت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

مارٹس : جو ہو چکا اُس کا باعث مجبوری ہو یا بھول۔ لیکن اب میں دوبارہ وہ خواب نہیں دیکھ سکتا۔

خا : کیوں؟

مارٹس : کیونکہ کل شہزادی آکٹیویا سے میری شادی ہونے والی ہے۔

خا : شادی؟

مارٹس : ہاں۔

خا : کان مجھے دھوکا تو نہیں دیتے، اپنے لفظوں کو پھر دہراؤ۔ شہزادی آکٹیویا سے

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

تمہاری شادی ہوگی؟

مارٹس : ہاں۔ ہاں۔

حنا : ظالم بے درد۔ تو کیا اسے بھی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر مجھ ناشاد و نامراد کی طرح اُس غریب کی جوانی اور زندگی کو بھی خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ اُس منحوس دن کا سورج کبھی طلوع نہ ہوگا میں تیرے بھولے شکار کو ہوشیار کردوں گی کہ تو فریبی ہے، جھوٹا ہے، دغا باز ہے۔ یہ شادی ایک عورت کی زندگی کا انجام اور دوسری عورت کی تباہی کا آغاز ہے۔

مارٹس : مگر یہ شادی کل کے دن مقرر ہو چکی ہے اور کل کا دن مقدر کے فیصلے کی طرح اٹل ہے۔

حنا : تو مقدر کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ شادی ہرگز نہ ہوگی۔

مارٹس : ضرور ہوگی۔

حنا : کبھی نہ ہوگی۔

مارٹس : کل ہی ہوگی۔

حنا : قیامت تک نہ ہوگی۔

مارٹس : میں جو کہتا ہوں۔

حنا : میں جو کہتی ہوں۔

مارٹس : اس شادی کو کون روک سکتا ہے؟

حنا : میں۔ میں عہرا یہودی کی لڑکی ہوں۔

مارٹس : کون؟ تو؟

حنا : ہاں میں۔ پھر کہتی ہوں کہ میں اور میرے ساتھ روم کا قانون۔ روم کا

رواج۔ روم کا بادشاہ، میں ان سب کو مجبور کروں گی کہ اس دغا باز کی امیدوں

کو خاک میں ملا دیا جائے۔ اس بد انجام شادی کے گھروندے کو ٹھوکروں سے

ڈھا دیا جائے۔

مارٹس : یہ ناممکن ہے۔

حنا : اگر یہ ناممکن ہے تو میں یہ سمجھوں گی کہ ظالموں اور موزیوں کے لیے میدان

یہودی کی لڑکی

صاف ہے۔ روم میں نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ قانون ہے، نہ انصاف ہے۔
باطن میں بزدلے ہیں بظاہر دلیر ہیں
یہ دور سے ڈرانے کو مٹی کے شیر ہیں
مارکس : ہنس۔

(گٹا کا گانا)

جو طیب اپنا تھا دل اُس کا کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ، عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے
کیسے بے دردی کے پالے پڑے ہیں۔
فرقت میں جینے کے لالے پڑے ہیں۔
ظالم نگاہوں کی بیداد دیکھو۔
چتون کے سینے پہ بھالے پڑے ہیں۔

دل لگاتا ہے دگی دل کی
اب رلانے لگی ہنسی دل کی
شمع رو دیکھ حال پروانہ
بری ہوتی ہے نو لگی دل کی
ظالم محبت نے آگ لگادی۔

جل جل کے اس دل میں چھالے پڑے ہیں۔
کیسے بے دردی کے پالے پڑے ہیں۔

(جاتا)

دوسرا ایکٹ - دوسرا سین

دربار

(سہیلیوں کا ناچتے گاتے دکھائی دینا)

دختر رز کے کنز جھکاؤ۔
قلقلینا کا ساغر چکاؤ۔
باقی رہے نہ قطرہ بھی ایک۔
بھر بھر ساغر دلیر پو اب مل کر دلیر خوشتر۔ دختر رز...
کاری کاری گھٹا ہے چھائی۔
باد صبا مڑدہ یہ لائی۔
آب تاب کی بر سے گی بارش۔
میکھوں کے لیے آج عید پو شوق سے۔
بھر بھر ساغر دلیر پو اب مل کر دلیر خوشتر۔ دختر رز.....

سردار ۱:

لپک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جمبول رہی ہے خوشی کے جمبولوں میں

سردار ۲:

ہوائے عیش نے پھیلائی نکبت شادی
اڑا ہے مشک کھن خاک کے گبولوں میں

یہودی کی لڑکی

چوہدار : دولت و اقبال پائندہ، رعایائے روم کے رواج قدیم کے مطابق اس شہر کا مشہور سوداگر عہرا یہودی اپنی قوم کی طرف سے عقیدت مندانہ نذرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا ہے اور عالی مرتبت شہزادی سے شرفِ حضوری کی اجازت چاہتا ہے۔

آکٹیویا : کون آیا ہے؟ عہرا۔ وہ یہودیوں میں سب سے زیادہ شریف و معزز بوڑھا۔ میں اسے دیکھ کر ضرور خوش ہوں گی۔ حاضر کرو۔

مارٹس : (خود کلامی) عہرا اور یہاں؟ اگر مجھے پہچان کر، غم و غصہ میں دل کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کا کوئی شرارہ منہ سے نکل جائے گا تو چشمِ زدن میں یہ جلسہ شادی انصاف کی عدالت سے بدل جائے گا۔

برٹس : (خود کلامی) دیوتا خیر کریں۔ یہ نحوست کی نشانی، مصیبت کا پیش خیمہ اس ہنسی خوشی کے جلے میں کہاں سے نازل ہوا؟ — (مخاطب ہو کر) شہزادی رواج کی سرپرستی جلے سے باہر بھی ہو سکتی ہے۔ حکم دیجیے کہ نذرانہ لے کر اس نامبارک عبرانی کو دروازے ہی سے واپس کر دیا جائے۔

آکٹیویا : بزرگ باپ۔ ایک بے ضرر یہودی سے اتنی نفرت؟ کیا وہ کوئی چور یا خونی ہے؟

برٹس : وہ ایک کافر نعمت۔ سنگ دل۔ زر پرست۔ دیوتاؤں کی راہدہ اور دنیا کی مردود کی ہوئی قوم کا ایک شخص ہے۔ اس لیے اس مبارک جلے میں اس کا شریک ہونا سخت بدشگونی ہے۔

آکٹیویا : مگر اُس کی موجودگی سے ہمارا کیا نقصان ہو سکتا ہے؟

برٹس : راتوں کو ایک کونے میں بیٹھ کر رونے والا کتا کیا نقصان پہنچاتا ہے جو فوراً محلہ سے مار کر بھاگ دیا جاتا ہے۔ مکان کی چھت پر بیٹھ کر غم زدہ آواز میں بولنے والا الو کیا تکلیف دیتا ہے جو فوراً بانس اور ڈھیلوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ جس طرح یہ دونوں اپنی موجودگی سے نحوست پھیلاتے ہیں۔ اسی طرح یہ نجس یہودی بھی جہاں جاتے ہیں کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔

(عمر کا داخلہ)

آکٹیویا: عہدِ خوش آمدی۔ تمہیں اس خوشی کے جلے میں دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔

عمر: معزز شہزادی۔ سلطنت آپ کے گھر میں موجود ہے۔ زرین لباس آپ کے گوشہ خانے میں بھرے پڑے ہیں۔ زر و جواہر آپ کی ٹھوکروں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس کی آپ کو پرواہ و ضرورت ہو۔ اس لیے میں اپنی اور اپنے قوم کی طرف سے ان کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعاؤں کا لازوال تحفہ پیش کرتا ہوں۔ اسے قبول فرمائیے۔

آکٹیویا: میں اس تحفے کو تمام دنیا کے خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہوں۔
عمر: اس فراخ مشربی و بے تعصبی کے صلے میں اُس آسمانی خدا کی بہترین برکتیں آپ پر سایہ گستر ہوں۔ اور اُس بلعونِ رومن پر جس نے میری بھولی بچی کی راحت و زندگی تباہ کر دی، بدترین عذاب نازل ہو۔

برٹس: عزیز شہزادی۔ اگر اس نجس یہودی کی موجودگی ضروری ہے تو پہلے اسے مندر میں بھیج کر پاک بنایا جائے۔ اس کے بعد شادی کے جلے میں بلایا جائے اور شرکائے جلسہ کی روحیں اس کی پرچائیں پڑنے سے گندی نہ ہو جائیں۔ اس لیے احتیاطاً دور بٹھایا جائے۔

عمر: عالی مرتبت۔ دینی سردار۔ جس طرح رومن قوم اپنے بادشاہ کی وفادار ہے اسی طرح یہودی قوم بھی اس کی دعا گزار و تابع دار ہے۔ جس طرح وہ شای قانون اور شای حکموں کا ادب کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ جس طرح وہ بادشاہ کے خیر خواہوں کو اچھا اور بدخواہوں کو برا سمجھتے ہیں اسی طرح ہم بھی اس کے دوستوں سے محبت اور دشمنوں سے نفرت کرتے ہیں۔ جب ہر مذہب و ملت اور دینیت کے ہر چھوٹے بڑے پر بادشاہ کی مساوی نظر التفات ہے تو محض مذہبی تعصب کی بنا پر اس کی شریف

یہودی کی لڑکی

رعایا کو سر دربار ذلیل کرنا، کتقی شرم کی بات ہے۔

برٹس : ذلیل کو ذلیل کہنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ کیا تم یہودیوں نے اپنی کینہ پروری، اپنی بے رحمی، اپنی سود خوری سے رومن قوم کے سر پر مصیبت نہیں ڈھائی ہے؟

عزرا : اگر ہم واقعی ایسے ہیں تو ہمیں ایسا بے رحم بنانے والے تم اور تمہاری ظالم قوم ہے۔ جب تم ہمارے مذہب کو ذلیل سمجھو گے۔ ہمارے رسم و رواج کی تحقیر کرو گے۔ ہمیں کتا سمجھ کر ٹھوکر مارو گے تو یقیناً ہمارے دل میں بھی انتقام کا سویا ہوا جذبہ بیدار ہوگا۔ جب ایک غریب بھی اپنے ستانے والے پر الٹ کر حملہ کرتا ہے تو دل اور کلیجہ رکھنے والا انسان کیوں نہ بدلہ لینے کے لیے تیار ہوگا؟

برٹس : جھوٹے۔ اگر ہم واقعی ایسے ہوتے تو تم ہماری سلطنت میں رہنے بھی نہ پاتے۔

عزرا : کیوں نہیں۔ یہ سورج جو ہمیں روشنی پہنچاتا ہے، دریا جو ہمیں پانی پلاتے ہیں۔ زمین جو ہمارے لیے غذا اگاتی ہے۔ غرض قدرت کی ہر قوت جو ہماری خدمت بجالاتی ہے۔ ان سب کی ہمدردی کا سبب تمہاری ہی مہربانی ہے۔ تمہاری ہی وجہ سے ہماری زندگی ہے۔

برٹس : تو کہہ سکتا ہے کہ یہودی قوم کے ساتھ ہم نے کون سا بُرا سلوک کیا ہے؟

عزرا : یہ مجھ سے نہیں اپنے بے رحم دل سے پوچھو۔ اپنے خون بھرے ہاتھوں سے پوچھو۔ اپنی چھریوں اور خنجروں سے پوچھو۔ کیا ہزاروں یہودیوں کو، صرف اس تصور پر کہ وہ ابراہیم اور یعقوب کے خدا کو کیوں پوجتے ہیں، سخت سے سخت عذاب کے ساتھ قتل نہیں کرایا۔ کیا سینکڑوں اسرائیلی بچوں کو یتیم اور ہزاروں عورتوں کو بیوہ نہیں بنایا۔ کیا ہماری قوم کے مظلوموں اور بے کسوں سے تم نے اپنا قید خانہ نہیں بسایا؟ اگر یہی اچھا سلوک اور یہی اچھا کام ہے تو پھر مجھے بتاؤ کہ ناانسانی اور ظلم کس چیز کا نام ہے؟ ۔

تم ستم کرتے رہے اور ہم ستم دیکھا کیے
 خانماں برباد ہو کر رنج و غم دیکھا کیے
 سر ہوئے تیغِ عداوت سے قلم، دیکھا کیے
 تم نے کیس لاکھوں جفائیں اور ہم دیکھا کیے
 بغض کا ہم پر مگر الٹا اثر ہوتا گیا
 چھانٹنے سے نخلِ قوی بار در ہوتا گیا

سردار: نا عاقبت اندیش یہودی خاموش رہ۔ کیا زندگی سے ناامید ہے؟ (بروٹس سے
 مخاطب ہو کر) بزرگ باپ۔ ایک فرسودہ حواس بوڑھے کو اپنا مخاطب بنانا آپ
 کے رتبہ اور شان سے بعید ہے۔

بادشاہ: میں بھی اس رائے کو پسند کر کے آپ کو اس کی امتحانہ جرأت سے چشم پوشی
 کرنے اور اس یہودی کو خاموش رہنے کا حکم دیتا ہوں.... انیسے اور میرے
 عزیز بچوں کو شادی کی برکت دیجیے۔

(بروٹس کا اٹھ کر مارکس اور آکئیویا کا ہاتھ ملانا)

بروٹس: ۔

خوش اور ایک دوسرے پر مہربان رہو
 دنیا میں باہراد رہو شادماں رہو

(حکا کا آنا)

حکا: ٹھہرو۔ جب تک انصاف کی عدالت میں۔ بادشاہ عادل کے رو برو ایک بادشاہ
 کی عرضی پیش ہو کر دعا بازی کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو لے۔ اُس وقت تک
 ٹھہرو۔

بادشاہ: یہ کون؟

بروٹس: تو کون؟

مارکس: ۔ (خود کلامی)

یہودی کی لڑکی

باعث تکلیف راحت میں گراں جانی ہوئی۔
سن رہا ہوں صاف اک آواز پہچانی ہوئی

عزرا : حکا۔ تو یہاں کیوں آئی؟

حکا : انصاف کے لیے۔

عزرا : کیا تجھے یقین ہے کہ ایک رومن شہزادے کے برخلاف ایک یہودی لڑکی کی فریاد سنی جائے گی؟

حکا : اگر اس دربار کا دعویٰ ہے کہ یہاں امیر و غریب دونوں کا یکساں انصاف ہوتا ہے۔ تو اس دعوے کی شرم رکھنے کے لیے اسے میری فریاد سننی پڑے گی۔

بادشاہ : اجنبی لڑکی۔ صاف لفظوں میں حال بیان کر۔ اگر تو مظلوم ہے تو تیرا حریف چاہے شاعی نسل ہی کا آدمی کیوں نہ ہو۔ مگر انصاف ضرور تیری طرفداری کرے گا۔ بول۔ کس کی ستائی ہے؟ اور کس کے خلاف فریاد لائی ہے؟

حکا : مجھے ستانے والا، دین و دنیا سے مٹانے والا۔

جفا پیشہ، وفا دشمن، ستم گر کون ہے؟ یہ ہے۔

شکایت جس کی کرتا ہے مقدر کون ہے؟ یہ ہے۔

آکٹیویا : کون؟ شہزادہ مارٹس؟

بادشاہ : ولی عہد سلطنت؟

حکا : بھئی۔ بھئی۔

اسی کے دم سے خزاں باغ کی بہار ہوئی

بھئی ہے، جس سے مری زندگی یہ خواہ ہوئی

بادشاہ : مارٹس۔ سنتا ہے؟ اس الزام کا تیرے پاس کیا جواب ہے؟

مارٹس :۔

ستائی مسمیٰ ہے، بُرا کہہ رہی ہے

یہ جو کہہ رہی ہے بجا کہہ رہی یہ

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

آکٹیویا : دیوانی عورت۔ الزام لگانے سے پہلے انجام سوچ لے۔
حکا : بچے۔ بچے۔ شہزادی صاحبہ۔ اس خوبصورت سانپ کے زہر سے بچے۔

بے رحم ہے یہ رحم سر مو نہیں رکھتا
یہ روح میں درد آنکھ میں آنسو نہیں رکھتا
آزاد ہے جذبات پہ قابو نہیں رکھتا
انسان ہے، انسان کی مگر خو نہیں رکھتا
یہ پھول ہے وہ جو خوشبو نہیں رکھتا

آکٹیویا : بس بس خاموش۔ میں اپنے پیارے کی نسبت ایسا کوئی لفظ سننا نہیں چاہتی۔
جس سے اس کی توہین ہو۔
حکا : شہزادی۔

سراسر مکہ، سر تا پا دعا، نا آشنا ہے یہ
مری آنکھوں سے دیکھو تم تو ہو معلوم کیا یہ
کنواری رہنا بہتر جاچے اس عقد ہونے سے
وفا کی ہے عبث اُنید مٹی کے کھلونے سے

برٹس : عالم پناہ۔ اگر آپ میری نصیحت قبول فرمائیں تو میں یہ کہوں گا کہ عورت کے
بیان پر کبھی یقین نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ عورتیں شیطان کے کتب سے تعلیم
پاکر نکلی ہیں۔ اس لیے ان سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔

جفا سے انس کریں اور وفا سے عار کریں
جگر پہ ضرب لگائیں تو دل پہ وار کریں
جو شرمناک عمل ہو ہزار بار کریں
یہ بے گناہ کو، دم میں گناہ گار کریں
ہزار مکر کے پہلو نکلتے بات سے ہیں
جہاں میں جتنے ہیں فتنے سب ان کی ذات سے ہیں

عزرا : سریرِ آراءِ عدالت، سلطنت کا ایک معزز رکن ہو کر انصاف کے راستے میں

یہودی کی لڑکی

روڑا اٹکانا، دباؤ ڈال کر شای انصاف اور شای رائے کو ایک مظلوم فریادی کے خلاف بنانا۔ کیا ان جیسے مقدس اور مذہبی پیشوا کو سزاوار ہے۔ کیا سلطان عادل کا انصاف مظلوموں کا سرپرست ہونے کے بدلے ظالموں کا طرفدار ہے؟

بادشاہ : نہیں عبرانی کبھی نہیں۔ جس طرح آفتاب کی روشنی، امیر کے محل اور غریب کے جھونپڑے میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ اسی طرح میں بھی انصاف کے وقت ادنیٰ اور اعلیٰ سب کو یکساں جانتا ہوں۔ اپنی ذمہ داری اور اپنا فرض اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

عزرا : بس تو پھر جھگڑا صاف ہے۔ آج کے روز آپ کے لیے صرف ایک ہی کام ہے اور وہ ان دونوں کا انصاف ہے۔

بادشاہ : میں انصاف کو استعمال کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کر دوں گا۔

حنا : خدا آپ کو مظلوموں کی حفاظت کے لیے قیامت تک زندہ رکھے۔ فرمائیے۔

آپ کی رعایا میں سے اگر کوئی شخص شادی کا وعدہ کر کے کسی عورت کو اپنی محبت میں گرفتار کرے اور اس کے کنوارے ہونٹوں اور گالوں کو ناپاک بنانے کے بعد اسے چھوڑ کر کسی دوسری عورت کو اپنی دغا بازی کا شکار کرے۔ تو حضور والا کا قانون اس کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے؟

بادشاہ : موت۔ بغیر رحم کے موت۔

عزرا : بس تو ہو چکا۔ فیصلہ ہو چکا۔ آپ شای نام کی عزت ہیں۔ تخت سلطنت کے

اہل ہیں۔ قلم اٹھائیے اور ولی عہد کے سزائے موت کے کاغذ پر دستخط فرمائیے۔

بادشاہ : مگر مجھے پہلے اس کا گناہ تو معلوم ہونا چاہیے؟

حنا : یہ آپ کی عزت اور شہرت کو برباد کرنے والا۔ اس ملک کی غریب لڑکیوں

کے سر پر تباہی لا رہا ہے۔ اس نے شادی کا وعدہ کر کے پہلے مجھے دھوکا دیا اور اب شہزادی آکٹیویا کو اپنی پر فریب محبت کے پھندے میں پھنسا رہا

ہے۔

مجھ کو نہ کیا تو اسے کیا شاد کرے گا

اس کو بھی مری طرح سے برباد کرے گا

بادشاہ : مارگس۔ سنتا ہے۔ اٹھ کھڑا ہو۔ اس کا جواب دے۔ ورنہ بدترین قسم کی
مزائے موت تیرے لیے تیار ہے۔

مارگس : بے شک غلام اس کا خطاوار ہے۔ اور عاجزی کے ساتھ حضور والا سے رحم کا
امیدوار ہے۔

بادشاہ : رحم یہ کر سکتی ہے میں نہیں کر سکتا۔

بروٹس : خاقانِ عالم۔

بادشاہ : بس۔

بروٹس : عالی جاہ۔

بادشاہ : کچھ نہیں۔

بروٹس : یہ نہ ہونا چاہیے۔

بادشاہ : یہ ضرور ہوگا۔

بروٹس : میری یہ عرض ہے کہ قانون گمراہوں کے واسطے ہے۔ نہ کہ بادشاہوں کے
واسطے۔

بادشاہ : اگر بادشاہ گمراہ ہے تو اُسے بھی قانون کی رسی میں جکڑا جائے گا۔ اگر شہزادہ
چور ہے تو چوری کی علت میں ضرور پکڑا جائے گا۔

بروٹس : میں پھر کہتا ہوں کہ عام رعیت سے ایک شہزادہ زیادہ قابلِ توقیر ہے۔ جس
ہتھیار سے غلام پر ضرب لگائی جائے اسی ہتھیار سے آقا کو قتل کرنا رتبہ اور
شان کی تحقیر ہے۔

بادشاہ : مگر انصاف کی لکوار آقا اور غلام دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔

یہاں تمیز نہ آقا میں ہے نہ بندے میں

کہ صاف دونوں کی گردن ہے ایک پھندے میں

بروٹس : عشق کا جوش ایک طرح کا جنون ہوتا ہے۔

یہودی کی لڑکی

حنا : اس خوشامد بازی سے انصاف کا خون ہوتا ہے۔
بروٹس : اری چپ چپ.... تو ایک ٹھکے کنال یہودی کی ذلیل چھوڑی اور خاندانِ شاہی کی توہین کا ارادہ۔ ایک ٹنگ و تادم آوارہ لڑکی اور چراغِ سلطنت کے بجھانے پر آمادہ۔

حنا : تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیروں کے سر تو تاج زر کے لیے ہیں اور غریبوں کے سر امیروں کی ٹھوکروں کے لیے ہیں۔
بروٹس : بے شک۔

عزرا : واہ رے مذہب۔ اور واہ رے مذہبی پیشوا۔

تمہارا غم ہے غمِ مفلس کا غم بس اک کہانی ہے
تمہارا عیش ہے عیش اور ہمارا عیش فانی ہے
یہاں بچپن بڑھاپا واں بڑھاپا بھی جوانی ہے
تمہارا خون ہے خون اور ہمارا خون پانی ہے
یہ نخوت اور یہ زر کیا لے کے اپنے ساتھ جائے گا
یہیں رہ جائے گا سب یاں سے خالی ہاتھ جائے گا

حنا : عادل سلطان۔ اب مجھے انصاف ملنے میں کیا دیر ہے؟ اگر آپ نے ابھی تک نہ سنا ہو تو میں اس سے بھی زیادہ بلند آواز سے انصاف انصاف پکار سکتی ہوں۔

بادشاہ : اُف کیا کروں۔ اور کیا نہ کروں؟

گھڑی شادی کی جو شاد آئی تھی ناشاد جاتی ہے
ادھر انصاف جاتا ہے ادھر اولاد جاتی ہے
اندھیرے میں پڑا تھا کیا خبر تھی مجھ کو اس دن کی
جوانی اس کی اور محنت مری برباد جاتی ہے

عزرا : عادل بادشاہ۔ کیا بیٹے کی محبت اور انصاف میں جگہ ہو رہی ہے؟

بادشاہ : ہاں۔ مگر فتح انصاف ہی کو ملے گی۔

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

حک : تو پھر انصاف ملنا چاہیے۔

بادشاہ : ضرور ملے گا۔

حک : آپ سے؟

بادشاہ : ہاں مجھ سے۔

حک : کہاں؟

بادشاہ : یہاں۔

حک : کب؟

بادشاہ : اسی وقت۔ بڑھو اے شاہی حکم کے پرستار۔ اس ناخلف کو حراست میں لے

لو اور کل مذہبی عدالت میں انصاف کے لیے پیش کرو۔

بروٹس : حضور والا۔

بادشاہ : خبردار۔ جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔

(موسیقی)

دوسرا ایکٹ - تیسرا سین

کرامت کا مکان

(نہین کا داخل ہونا)

نہین : توبہ توبہ۔ منوا۔ ارے منوا۔ بولتا کیوں نہیں۔ کیا کر رہا ہے؟ کہاں مر رہا ہے؟

منوا : سرکار حاضر ہوں میں۔ سرکار..... سرکار.....

نہین : کیوں رے موئے حرام خور۔ سو آوازوں پر ایک جواب۔ تیرا خانہ خراب۔ تانا شاہ کا پوتا ہے یا نادر شاہ کا نواسا؟

منوا : آپ تو مفت خفا ہوتی ہیں۔ ناحق گالیاں دیتی ہیں۔

نہین : ارے موئے بد ذات ہم مفت خفا ہوتے ہیں۔ ناحق گالیاں دیتے ہیں۔ کیا تو تنخواہ نہیں پاتا؟

منوا : تو کیا میں گالیاں کھانے کی بھی تنخواہ پاتا ہوں؟ میں نے ہاتھ بیچا ہے یا ذات؟

نہین : ہائے ہائے۔ جی چاہتا ہے موئے کو پھانسی لگا دوں پھانسی۔

منوا : اب میں سمجھا۔ شاید ہائی کورٹ کے اختیارات بھی آپ اپنے ساتھ جہیز میں لائی ہیں۔

نہین : کیوں رے گستاخ نفر۔ پھر کھایا تیرا سر۔ لوں جوتا۔ کروں مرمت؟

منوا : خبردار وہیں ٹھہر جانا۔ قدم آگے بڑھایا تو تم جانا۔ زبان سنبھالو۔ اپنی نوکری بھاڑ میں ڈالو۔

(منوا کا جانا)

نصیبن : موے نوکروں پر اسی طرح رعب و داب قائم رکھنا چاہیے۔ بلکہ نوکروں پر ہی کیا منحصر ہے، تمام مردوں سے اسی طرح پیش آنا چاہیے۔ ورنہ مرد کی ذات ذرا سامنہ لگانے سے سر چڑھ جاتی ہے۔ عورت کو لازم ہے کہ مرد کی ڈور کبھی ڈھیلی نہ چھوڑے۔ ان سے ذرا دب کر نہ رہے۔ مرد ایک کہے تو عورت دس سنائے۔ اگر مرد ہاتھ اٹھائے تو عورت بھی اپنا جھل فریب دکھائے۔ روئے چلائے، دہائی چچائے اور کچھ بس نہ چلے تو دانت ہی کاٹ کھائے۔ میں اپنی تمام بہنوں کو صلاح دیتی ہوں کہ مرد سے ہرگز دب کر نہ رہیں۔ کیونکہ ہم عورتوں کو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے اور مردوں کو کنٹرکٹر سے بنوایا ہے۔ مردوں کا فرض ہے کہ عورتوں کا ہاتھ دبائیں پاؤں دبائیں۔ بستر بچھائیں۔ کھانا کھلائیں اور ہاں میں ہاں ملائیں۔ بس اور کیا۔

(نصیبن کا جانا اور کرامت کا آنا)

کرامت : جان بچی اور لاکھوں پائے۔ یارو ہماری نامراد بیوی نے مار تو ضرور کھلوائی مگر ساتھ ہی ساتھ رقم بھی دلوائی۔ زبردستی کا حکیم بننے یا بے ایمانی کرنے میں بڑا ہی مزا ہے۔ خدا بخشے ہمارے ابا جان جہنم مکان بھی یہی فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں جو بے ایمانی کے غبارے اڑائے گا وہی تر نوالے کھائے گا۔ کیا کریں ایسا کام کرنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر بزرگوں کی نصیحت پر عمل کرنا بھی عین سعادت مندی ہے۔ اس لیے میں نے بھی اب یہی راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اے امانت، بر تو لعنت، از تو رنجے یافتم
اے خیانت، بر تو رحمت، از تو گنجے یافتم

منوا : ارے او بیٹا منوا۔

منوا : سرکار حاضر ہوں میں۔ سرکار... سرکار...

بیوی کی لڑکی

کرامت : کیوں بیٹا یہ تو بتا کہ آج کل ہماری بیوی کے حراج کا قہر مائٹر کتنی ڈگری پر ہے۔

منوا : سرکار۔ ان کے حراج کا قوام ہمیشہ کڑا ہی رہا کرتا ہے۔ آج صبح ہی صبح وہ گالیوں کا تار بندھا وہ گالیوں کا تار بندھا کہ الاماں۔ الاماں۔ میرا جی تو اس نوکری سے بالکل بیزار ہو گیا ہے۔

کرامت : ٹھہر جا بچ کیوں گھبراتا ہے۔ اس شیطان زادی کو ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سمجھانے سے سمجھ جائے گی۔ مگر لوہے سے نرمی اور برف سے گرمی کی امید فضول ہے۔ اس نے تو جھوٹ موٹ بیوی ہونے سے انکار کیا تھا۔ مگر میں سچ سچ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کی فکر کر رہا ہوں۔ اچھا دیکھ اس سے بدلہ لینے کی ترکیب تجھے بتاتا ہوں۔

(دونوں کاٹا پھوی کرتے ہیں کہ نصیبن آ جاتی ہے)

نصیبن : کیوں جی یہ کیا کاٹا پھوی ہو رہی ہے؟

کرامت : جی جی کچھ نہیں۔

نصیبن : جی کچھ نہیں۔ دیکھو میں تم دونوں کے کان اچھی طرح کھولے دیتی ہوں۔ آئندہ میرے گھر میں یہ کھسر پھسر نہ ہونے پائے۔

کرامت : اجی کھسر پھسر کیسی۔ یہ تو ذرا مشورہ ہو رہا تھا۔

نصیبن : مشورہ۔ مشورہ بیوی سے کرتے ہیں یا خدمت گار سے؟ دو نکلے کے نفرے کو یار غار بناؤ گے تو خطا پاؤ گے۔ جوتیاں مار کر نکالو۔ موئے کتے کے منہ پر خاک ڈالو۔

منوا : دیکھیے دیکھیے کتیا مجھے کتا بنا رہی ہے۔

نصیبن : ارے تو کھڑا کھڑا سنا ہے اور کچھ نہیں بولتا؟

کرامت : مگر میں کیا بولوں اپنا سر؟

نصیبن : تو سنا نہیں ہے بڑھے جھڑوس؟

کرامت : کیا ہے بیوی فانوس۔

کلیات آغاشر کا میری - جلد چہارم

نصیبن : موئے بے حیا، دیکھ یہ کیا ہو رہا ہے؟

کرامت : ہو کیا رہا ہے۔ میری عزت کا نلام؟

منوا : جو بڑھے سو پائے۔

نصیبن : ہمت تجھے خدا خاک میں ملائے۔

منوا : دیکھیے سرکار۔

نصیبن : تیرے سر پر خدا کی مار۔

کرامت : یہ کیا۔ منوا کی خطا اور ہم کو سزا؟

نصیبن : چل موئے مشعلی۔ ایک مداری ایک ڈلہی۔

کرامت : تم تو یوں ہی خالی خالی خفا ہو رہی ہو۔

نصیبن : بیٹا خالی بھرے کے بھروسے نہ رہنا۔ مارے جوتیوں کے بیجا بھا دوں گی۔

میاں اور نوکر دونوں کو مزا چکھا دوں گی۔

کرامت : یا اللہ جو کوئی میری حالت دیکھ کر بنے خدا کرے وہ بھی اسی آفت میں پھنسنے۔

نصیبن : ذرا موئے کو دیکھ تو سہی۔ صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل۔ خدا تجھے

غارت کرے۔ نیست و نابود کرے۔ الہی مجھ کو راغز کر دے راغز۔

کرامت : (خود کلامی) ٹھہر جا کیوں گھبراتی ہے۔ تو راغز ہو اس سے پہلے میں رنڈوا

ہو جاتا ہوں (مخاطب کر کے) کیوں بے منوا نہیں مانتا ہے۔ ہماری اکلوتی

بیوی کے منہ لگتا ہے۔ تو نہیں جانتا کہ ہماری بیوی کیا ہے؟ ایک کچھی کا

اوتار ہے۔ جب سے اس کا قدم گھر میں آیا ہے سارا محلہ اُجاڑ ہے۔

نصیبن : کیا کہا؟ کیا کہا؟

کرامت : ارے آباد ہے۔ آباد ہے۔ لو چلو اب میں نے اس حرام زادے کو اچھی طرح

ڈانٹ دیا ہے۔

نصیبن : نہیں ہرگز نہیں۔ اسے ابھی ابھی میرے گھر سے نکال دو۔

منوا : اؤھ۔ جیسے ان کے باپ کا گھر ہے۔ اسے نکال دو۔ اُسے نکال دو۔ نہیں

نکلتے۔

نصیبن : دیکھو دیکھو۔ موا کیا کہتا ہے؟

کرامت : کیوں بے غلام، پاجی، نافرجام، بے ایمان، کام چور، حرام خور، ہماری بیوی کو منہ چڑھاتا ہے۔ اب ذرا بھی بولا تو منہ مار کر تھپڑ توڑ دوں گا۔

نصیبن : اچھا دیکھو۔ دوسرا آدمی ملے یا نہ ملے، مگر دو دن کے اندر اسے میرے گھر سے نکال دو۔

کرامت : ابی تو بہ کرو۔ دو دن کس کے۔ میرا دم بھی ناک میں آگیا ہے۔ جب تک یہ بلا میرے گھر سے نہ جائے گی تب تک میری طبیعت چین نہ پائے گی۔

نصیبن : اور ہاں خوب یاد آیا، کیوں جی تم نے میرے گلے کے ہار کا وعدہ کیا۔ وہ اب تک نہ لائے۔

کرامت : ہاں۔ ہاں۔ ابھی لاتا ہوں۔

نصیبن : آج سے کل، کل سے پرسوں، یوں ہی نالتے جاؤ گے پرسوں؟

کرامت : پیاری خدا جانتا ہے۔ مجھے تو رات دن تیرے ہار ہی کی فکر رہتی ہے۔

نصیبن : جموٹی بات ہے۔ میرا تم پر زور ہے تو ابھی ابھی منگواؤں گی۔

کرامت : ہاں۔ ابھی ابھی آجائے گا۔ یہ دیکھو تمہارے ہار ہی کے لیے تو یہ سو روپیہ کا نوٹ لایا ہوں۔

نصیبن : کیا۔ نوٹ۔ دیکھوں دیکھوں۔ میں دیکھوں نوٹ۔“ (نوٹ دیتا ہے)

کرامت : دیکھ چکیں۔ لاؤ مجھے واپس دے دو۔

نصیبن : ابی بس جاؤ ہوا کھاؤ۔ بندی ایسی بھولی بھالی نہیں جو آیا ہوا نوٹ ہاتھ سے کھوئے گی۔

کرامت : جب ہی تو اپنی قسمت کو روئے گی۔

نصیبن : اب تو بندی خود جاتی ہے۔ سارے ہار لے کر آئے گی۔

کرامت : دیکھ یہ بات اچھی نہیں۔ دھوکا کھا جائے گی۔

نصیبن : ابی جاؤ۔ کسی اور کو بناؤ۔ میں ابھی جاتی ہوں اور ہار لے کر آتی ہوں۔

(نصیبن کا جانا)

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

کرامت : جا کم بخت۔ ہار تو تیری قسمت میں ہے۔ کیوں بچہ منوا کچھ سمجھا؟
منوا : کیا خاک سمجھا۔ آپ تو کہتے تھے میں اس کو نکالنے کی فکر میں ہوں۔ بجائے
اس کے نکالنے کے اور الٹا کھٹ سے سو روپیہ کا نوٹ اسے نکال کر دے
دیا۔

کرامت : بچہ۔ اس نوٹ کو اس کا رخصتانہ سمجھو۔ جب تک میں یہ نوٹ نہ نکالتا۔ یہ
بھی یہاں سے نہ نکلتی۔ سمجھا؟
منوا : اوں ہوں۔ میں تو کچھ نہیں سمجھا۔

کرامت : تو تو بچہ ہے۔ کیا سمجھ گا۔ حکیم بنے یا عقل آنے کے لیے ایک مدت درکار
ہے۔ اچھا تو جا دوڑ کر ایک بوتل و سکی تو لے آ..... مگر ہاں۔ ذرا سنبھال
کے۔ بغیر پرمٹ کے لائے گا نا؟ ایسا نہ ہو کہ بوتل تیرے ہاتھ میں ہو اور
تو پولیس کے ہاتھ میں۔

منوا : اجی میں کہیں ہوں مگر بوتل آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔
کرامت : شاباش۔

(منوا جاتا ہے اور گھبرایا ہوا واپس آتا ہے)

منوا : ارے میاں۔ غضب ہو گیا۔

کرامت : کیا ہوا؟

منوا : پولیس کے جوان ادھر آرہے ہیں۔

کرامت : آرہے ہیں تو آنے دے۔

منوا : ارے میاں بیگم بھی ان کے ساتھ ہیں۔

کرامت : بیگم بھی ساتھ ہیں۔ بس تو تیرے نشانے پر پڑا۔ یاروں کا ایک ہی فقرہ اسے
پاگل خانے پہنچانے کو کافی ہوگا۔ اچھا دیکھ تو ایک کام کرنا۔ فقط میری ہاں
میں ہاں ملائے جانا۔

(نصیبن کا پولیس کے ساتھ آنا)

- نصیبین : لو ان سے پوچھ لو یہ نوٹ کس کا ہے؟
- کرامت : ہاں تو کیا بتلایا تو نے۔ آلو چھ پیسے سیر۔
- جمعدار : کیوں جی یہ نوٹ تمہارا ہے؟
- کرامت : ابے ترقی ہمیشہ سڑی ہوئی لاتا ہے۔ یہ نمائز ہیں یا بندر کے گال؟
- جمعدار : اجی میں پوچھتا ہوں یہ نوٹ تمہارا ہے؟
- کرامت : اجی ہونٹ۔ ہونٹ سردی سے پھٹ گئے ہیں۔
- جمعدار : ہونٹ نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ نوٹ تمہارا ہے؟
- کرامت : کیا نوٹ۔ جناب کیا آپ مجھ سے دگلی کرتے ہیں۔ دیکھیے اگرچہ میں ایک غریب آدمی ہوں مگر کسی کا حرام مال نہیں لینا چاہتا۔ کیوں بیٹا منوا؟
- منوا : بجا ہے قبلہ۔
- نصیبین : تو کیا تم مجھے نہیں جانتے؟
- کرامت : آپ کو پہلے کہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ شاید کہیں ملے ٹیلے میں دیکھا ہو۔ کیوں بیٹا منوا؟
- منوا : ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ماہم کے عرس میں۔
- نصیبین : اگر مجھے نہیں جانتے تو یہ بھی کہہ دو کہ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔
- کرامت : کیا بیوی۔ ارے بیوی غریب دکھاری، آفت کی ماری، یا جناب باری یہ کون ہوگی لاوارث بے چاری؟
- نصیبین : تو کیا تم میرے شوہر نہیں ہو؟
- کرامت : کیا کہا شوہر؟ مائی تجھے دھوکا ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری صورت تیرے شوہر سے ملتی ہو۔ دیکھو دیکھو۔ اچھی طرح دیکھو۔ شاید تم آدمی بھول گئی ہو۔
- نصیبین : ارے مذاق 'جانے دو۔ دگلی ہو چکی۔
- کرامت : ہائی۔ ہم تجھ سے مذاق کیوں کرنے لگی۔ پرانی عورت کو تو میں ماں بہن سمجھتا ہوں۔ کیوں بیٹا منوا؟
- منوا : درست ہے قبلہ۔
- نصیبین : ارے غضب۔ کیا تم نے ابھی ابھی مجھے یہ نوٹ نہیں دیا؟

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

کرامت : جعدار صاحب۔ یہ عورت کیا کہتی ہے۔ آخر آپ کا مطلب کیا ہے؟
 جعدار : یہ عورت بازار میں جعلی نوٹ چلانے آئی۔ اس لیے سرکار کی مجرم قرار پائی۔
 کرامت : جعلی نوٹ؟
 منوا : جعلی نوٹ؟

کرامت : کیا دنیا میں ایسی ایسی بھی بے ایمانی ہونے لگی؟
 منوا : کیا عورتیں بھی یہ سب کام کرنے لگیں؟
 نصیبین : جعدار صاحب یہ جھوٹا ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں۔
 کرامت : باقی تیرے منہ کو اختیار ہے۔ تو جو چاہے کہہ دے۔ لیکن میں تو تجھے سگی بہن سمجھتا ہوں۔

نصیبین : ہاے ہاے۔ موا کیا انجان بنتا ہے۔ اپنی خالہ کو اتنی جلدی بھول گیا۔ جی چاہتا ہے کہ موئے کی بوئیاں نوچ کھاؤں۔

کرامت : جعدار صاحب۔ پکڑیے پکڑیے۔ ورنہ کسی کا خون کر دے گی۔
 جعدار : یہ دیوانی ہے اس کو باندھ لو۔ ورنہ کسی کو کاٹ کھائے گی۔
 نصیبین : جعدار صاحب۔ آپ مجھے کیوں باندھتے ہیں۔ میں کوئی دیوانی دیوانی نہیں ہوں مجھے تو اس بے ایمان کی بات پر غصہ آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ...

جعدار : بس چپ رہو۔ ہم تیرے پاگل پن کے گواہ ہیں۔
 نصیبین : موئے پاگل کہنے والے تیرا ستیاناس ہو، تیرا مردہ نکلے۔ تو ملیامیٹ ہو جائے۔
 تجھ پر کھڑی بجلی گرے۔ تجھے گہری گور میں گاڑوں۔ تیرا نام لیوا پانی دیوانہ رہے تجھے روؤں۔ تجھے جینوں، تجھے کھاؤں، تجھے چباؤں۔
 جعدار : لے جاؤ۔ لے جاؤ۔

(جعدار اور سپاہی نصیبین کو پکڑ کر لے جاتے ہیں)

کرامت : ہت تیرا ستیاناس۔ کیوں بیٹا منوا۔ دیکھا کس صفائی سے پاگل خانے پہنچا دیا۔

یہودی کی لڑکی

منوا : واقعی سرکار۔ آپ نے تو کمال کر دکھایا۔
کرامت : ابے یہ تو جو روحی۔ کبھی موقع پڑے گا تو بندہ اپنے آپ سے انکار کر دے گا۔

منوا : مگر سرکار۔ اس نے دعویٰ کیا۔ اور تحریری شہادت کا سہارا لیا تو؟
کرامت : ابے جب دعویٰ کرے گی تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو جانے دے۔
کیا ہاتھ صاف ہے، کبھی خالی گیا نہ دار
میں اپنے آپ کرتا ہوں تعریف بار بار
(کرامت کا گانا)

میں آفت کا پرکالا ہوں۔
سو حکمت فطرت والا ہوں۔
رگڑے جھگڑے کی ہنڈیا میں میں ہلدی مرچ سالہ ہوں۔
آفت کا مارا پیٹا ہوں۔ میں پھر بھی شیخ کرامت ہوں۔
لپے، شہدے، گنڈے، بدمعاشوں کا تو میں دادا ہوں۔
تم مجھ کو سانپ سمجھو۔ بھوتوں کا باپ سمجھو۔
دنیا کا باپ سمجھو۔ جو چاہو آپ سمجھو۔
میں آفت کا پرکالا ہوں۔

دوسرا ایکٹ - چوتھا سین

محل

(خا کا غزل گاتا)

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا
بت کافر ہمارا بھی خدا ہوتا تو کیا ہوتا
جب اتنی بے وفائی پر اسے دل پیار کرتا ہے
تو یا رب وہ ستم گر بادفا ہوتا تو کیا ہوتا
کوئی لذت نہیں ہے پھر بھی دنیا جان دیتی ہے
خداوند محبت میں حزا ہوتا تو کیا ہوتا
سنا ہے حشر وہ ذکر وفائے غیر کرتے تھے
جو میں بھی سچ میں کچھ بول اٹھا ہوتا تو کیا ہوتا

(آکٹیویا کا آنا)

آکٹیویا: میری پیاری بہن، اتنی سخت نہ بن۔ نرمی اور رحم جو عورت کی بہترین صفاتیں
ہیں، ان کو غصے پر قربان نہ کر۔ بُرے کے ساتھ تو بھی نرمی نہ بن۔

بے قراری تری، چاہت کا نشان دیتی ہے
بجھ گئی آگ مگر اب بھی دھواں دیتی ہے
دل میں کچھ ہونٹ پہ کچھ، رسم دعا عام نہ کر
تو بھی اس کی طرح اس عشق کو بدنام نہ کر

یہودی کی لڑکی

خا : نہیں ہرگز نہیں۔ اب اس کے لیے ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی میرے دل میں جگہ نہیں ہے۔

آکئیویا : دیکھو میں بھی تمہاری طرح ایک عورت ہوں۔ اور معزز قوم کی عورت ہوں۔ ساتھ ہی ایک بادشاہ کی بیٹی اور دوسرے بادشاہ کی بھتیجی ہوں۔ مگر اس پر بھی اس کی زندگی بھیک میں پانے کے لیے ایک فقیرنی کی طرح تمہارے سامنے دامن پھیلاتی ہوں۔

دُور یاس سے ہے اب عجیب حال مرا

فقیر جان کے پورا کرو سوال مرا

خا : بچاؤں گی۔ بچاؤں گی۔ جب تم اور یہ دل دونوں اس کی طرفداری کرتے ہیں، تو ضرور بچاؤں گی۔

جاؤ اور کہہ دو وفا کی شرط پوری کر گئی

تم رہو جیتے کہ تم پر مرنے والی مر گئی

(خا کا گانا)

پیار کر کے نہ جانا نھانا رے۔

بے وفا ہے یہ جموٹا زمانہ۔

سب ہیں مطلب کے یار۔ یہ ہیں پورے عیار۔

کسی ظالم سے دل نہ لگانا۔ پیار...

چھین ہی لیتے ہیں یہ گیسوؤں والے دل کو

کیسا برباد کیا نازوں کے پالے دل کو

کوئی کم بخت بھلا خاک سنبھالے دل کو

بے وفاؤں کے خدا پالے نہ ڈالے دل کو

سب ہیں مطلب کے یار۔ پیار...

دوسرا ایکٹ - پانچواں سین

مذہبی عدالت

(مارٹس اور خٹا کا الگ الگ گھروں میں کھڑے دکھائی دینا
ایک طرف عزرا اور دوسری طرف آکینویا کا بیٹھے ہوئے نظر آتا۔
بروٹس کا اجلاس کی کرسی پر بیٹھنا۔ چند سپاہیوں کا خٹا اور مارٹس کو
اپنی حراست میں لینا)

بروٹس : خٹا تو ہوش میں ہے؟

خٹا : ہاں۔

بروٹس : تجھ پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا گیا؟

خٹا : نہیں۔

بروٹس : تو بنا جبر و اکراہ، اپنا پہلا بیان واپس لیتی ہے؟

خٹا : بے شک۔

عزرا : خٹا۔ کیوں محبت میں اندھی بن رہی ہے؟

خٹا : اس لیے کہ کچھ بھائی نہیں دیتا۔

عزرا : کیوں اپنے ہاتھوں سے قبر تیار کر رہی ہے؟

خٹا : اس لیے کہ قبر میں جاؤں گی تو ایک بے وفا کے ظلم سے نجات پاؤں گی۔

عزرا : عدالت اس کی باتوں کا یقین نہ کرے۔ یقیناً اس پر کسی نے جادو کر دیا

ہے۔

یہودی کی لڑکی

برٹس : خٹا۔ میں روم کے قانون کے مطابق تجھ سے تیسری مرتبہ دریافت کرتا ہوں کہ تو شہزادہ مارٹس پر لگائے ہوئے تمام الزامات واپس لیتی ہے؟

خٹا : ہاں۔ لفظ بہ لفظ۔

عزرا : آہ۔ ۔

ضبط کی طاقت بھی کھو دیتی ہے اور اوسان بھی
آگنی جب ضد تو یہ آندھی بھی ہے طوفان بھی
جوش میں آگے بڑھی عورت، تو پھر رکتی نہیں
دل تو دل چاہت میں دے دیتی ہے اپنی جان بھی

برٹس : یہودی۔ چونکہ تم بھی اس دعوے کی تائید کرنے والے تھے۔ اس لیے اب تم کیا کہتے ہو؟

عزرا : جس قدر افریقہ کے بیابان میں ریت کے ذرے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ میرے پاس بولنے کے لیے الفاظ تھے لیکن اس ناعاقبت اندیش چھوڑی کی وجہ سے میں اب کچھ کہنا نہیں چاہتا اور قسمت کے فیصلے کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔
برٹس : تو اب میرا صرف اتنا فرض رہ گیا ہے کہ اپنا آخری حکم سنا دوں.... شہزادہ مارٹس آپ کو عزت و آبرو کے ساتھ رہا کیا جاتا ہے... اور خٹا اور عزرا، تمہیں ایک رومن شہزادے پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں زندہ آگ میں جلائے جانے کی سزا دی جاتی ہے۔

خٹا : سزا۔ کس کو؟ مجھ کو یا میرے باپ کو؟

برٹس : دونوں کو۔

خٹا : مگر یہ انصاف کے خلاف ہے۔

برٹس : میرا یہ فیصلہ مطلق انصاف ہے۔

خٹا : ارے نہیں نہیں۔ ۔

غارت کرو مجھے مرے پھوٹے نصیب کو
لیکن بچاؤ بخش دو بوڑھے غریب کو

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

بروٹس : قانون اپنے فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں دیکھتا.... جاؤ اور اپنی قسمت کے موجودہ فیصلے کو صبر کے ساتھ برداشت کرو۔

مارکس : بزرگ باپ۔ اپنے شہزادے اور اس ملک کے ہونے والے بادشاہ پر ایک عنایت۔

بروٹس : کیا؟

مارکس : تھوڑی شفقت۔

بروٹس : یعنی۔

مارکس : اپنی طاقت اور اثر کو کام میں لائیے۔ جس طرح ممکن ہو ان دونوں کی جان بچائیے۔

بروٹس : مگر عدالت؟

مارکس : وہ آپ کے قبضے میں ہے۔

بروٹس : قانون؟

مارکس : وہ آپ کا حکم ہے۔

بروٹس : موجودہ فیصلہ؟

مارکس : وہ آپ کی رائے ہے۔

بروٹس : بادشاہ کی مرضی؟

مارکس : وہ آپ کی مرضی میں ہے۔

بروٹس : اپنے فیصلے کی آخری سطریں لکھتے وقت جب میں نے اس یہودی دوشیزہ کے

بھولے چہرے کی طرف دیکھا تھا تو ایک نامعلوم جذبے کے اثر سے میری

اٹھکیاں تھر تھرانے لگی تھیں۔ اور اب بھی جب کہ یہ موت کی طرف جاری

ہے۔ اپنی روح میں ایک عجیب ولولہ اور اضطراب محسوس کر رہا ہوں... اچھا

آپ جانیے۔ مجھ سے جو ممکن ہوگا وہ کروں گا۔

مارکس : تو میں ان دونوں کی زندگی آپ کو بطور امانت کے سپرد کرتا ہوں۔

بروٹس : میں کوشش کروں گا کہ دیانت دار امین ثابت ہوں (مارکس جاتا ہے) خاتم

اپنے باپ کو پیار کرتی ہو؟

حنا : اپنے مذہب کی طرح۔
 بروئس : اس کی زندگی محفوظ رکھنا چاہتی ہو؟
 حنا : اپنی عصمت و عزت کی طرح۔
 بروئس : تب اس خیال پر قائم رہنا۔ (عزرا کو مخاطب کر کے) یہودی یہ تمہاری اولاد ہے؟

عزرا : بے شک۔
 بروئس : اولاد کے لیے ماں باپ اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں؟
 عزرا : یقیناً۔
 بروئس : تو اولاد کی سلامتی کے لیے تمہیں روایت پرستی کے عقائد کو نثار کرنا ہوگا۔
 جان بچانا چاہتے ہو تو اپنے بزرگوں کا مذہب چھوڑ کر تم دونوں کو رومن دین اختیار کرنا ہوگا۔

عزرا : فکر، دکھ، بیماری اور بڑھاپے کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی زندگی کی قیمت،
 مذہب سے ادا کروں؟ اس چند روزہ دنیا کے لیے ابراہیم اور موسیٰ کے خدا سے دعا کروں؟۔

اک یہودی لاکھ دکھ ہوں دین سے ملتا نہیں
 یہ ہے وہ فولاد جو بھٹی میں بھی گھٹا نہیں
 غم نہیں، کچھ بھی ہو، خوش ہوں شاد بھی ناشاد بھی
 دین پر صدقے ہوں میں بھی اور مری اولاد بھی
 بروئس : مذہبی دیوانے۔ موقع کی نزاکت پر دھیان کر۔ تعصب اور جہالت پر، اپنی
 اور اس کی زندگی نہ قربان کر۔
 عزرا : زندگی؟ زندگی دنیا کا دھوکا ہے۔ ایک بوڑھا جو اس مکار دنیا کے سینکڑوں
 دھوکے کھا چکا ہے اب اس نئے دھوکے میں کبھی نہ آئے گا۔

کوئی جیتا ہے جہاں میں جاہ و دولت کے لیے
 کوئی جیتا ہے فقط رعب و حکومت کے لیے

کوئی عزت کے لیے اور کوئی شہرت کے لیے
میں فقط جیتا ہوں اپنے دین و ملت کے لیے
ہے نجات دائمی کی، زندگی میں راہ ایک
قبر کے منہ سے بھی بولوں گا کہ ہے اللہ ایک

برٹس : عزرا بے وقوف نہ بن۔ یہ میری مہربانی ہے جو اس وقت تیری جان بچانے
کو تیار ہوں۔ ورنہ تو جانتا ہے کہ میں یہودیوں کی صورت تک سے بیزار
ہوں۔

عزرا : اور یہ اسی نفرت اور بیزاری کا نتیجہ ہے کہ قدرت نے تمہارا غرور توڑ دیا
ہے۔ تمہارا گھر بار، بیوی، بچے سب کچھ چھین کر تمہیں اس دنیا میں تنہا چلنے
اور کڑھنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

برٹس : میری پچھلی زندگی کے حالات تو کیسے جانتا ہے؟
عزرا : بیدرد رومن۔ عزرا آج سے نہیں تجھے سولہ برس سے پہچانتا ہے۔

ہم یہودی آپ کے لطف و کرم بھولے نہیں
آپ بھولے آپ کو صید ستم بھولے نہیں
دل کے داغوں کو سمجھتے ہیں نشانی آپ کی
یاد ہے ہم سب کو اک اک مہربانی آپ کی

برٹس : میں نے تیری قوم کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ اسی کی مستحق تھی۔ مگر اب
میری رحم دلی دیکھ کہ تجھے سراسر مجرم پاتا ہوں اور پھر بھی تیری جان بچاتا
ہوں۔

عزرا : جان۔ جان کی اب مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ البتہ اتنی آرزو ہے کہ مرنے سے
پہلے، ایک قافل، پُرفتن، بے رحم رومن کا سب کس بل نکال دوں۔ اس کے
چتر جیسے کلیجے میں چکیاں لے لے کر سوراخ ڈال دوں۔
میں ہنسا، اور کلیجہ تھام کر روتا ہوا تو ہو۔
مری آنکھوں میں نفرت اور تری آنکھوں میں آنسو ہو

بروٹس : میں تجھے سخت بیوقوف پاتا ہوں۔
عزرا : میں تجھے آج سے سولہ برس پہلے کا واقعہ یاد دلانا ہوں۔ جس وقت شاہ نیرو کے حکم سے شہر روما میں چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی، اُس وقت تیرے گھر میں ایک خوبصورت بیوی اور اس کی گود میں ایک چھ ماہ کی بچی تھی۔

بروٹس : اس بات کی یاد دلانے سے تیری مراد کیا ہے؟
عزرا : میں پوچھتا ہوں کہ ان دونوں کے آگ میں جل جانے کا واقعہ تو تجھے یاد ہے؟

بروٹس : ہاں۔ میں اُس منحوس دن کو، جس روز موت نے میری بیوی اور بچی کو مجھ سے جھین لیا، کبھی نہیں بھول سکتا۔

ابھی تک غم سے کڑھتا ہے، ابھی تک یاد کرتا ہے
مرا ٹوٹا ہوا دل، آج تک فریاد کرتا ہے

عزرا : نیرو کی آگ تیری بیوی کے لیے آتشیں کفن ثابت ہوئی مگر اس کے سینے سے لپٹی ہوئی تمھاری چھ ماہ کی معصوم بچی، جو مردہ لاش پر قدرت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا افسوس کا آنسو معلوم پڑتی تھی....

بروٹس : کیا وہ زندہ رہی؟

عزرا : ہاں۔

بروٹس : اور ابھی تک زندہ ہے؟

عزرا : ہاں۔

بروٹس : اسے کس نے بچایا؟

عزرا : خدا کی ذات نے۔

بروٹس : کس نے آگ سے نکالا؟

عزرا : ایک رحم دل یہودی کے ہاتھ نے۔

بروٹس : اُس کا نام؟

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

عزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروٹس : اس کا ٹھکانہ؟

عزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروٹس : اُس سے ملنے کا طریقہ؟

عزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروٹس : نہیں عزرا تجھے بتانا ہوگا۔

عزرا : ہرگز نہیں۔ یہ میرا راز ہے، جو میری جان کا دم ساز ہے۔

بروٹس : عزرا۔ عزرا۔ مجھ پر رحم کر۔

عزرا : رحم۔ رحم۔ آج یہ پہلا روز ہے کہ رحم کا لفظ تمہاری زبان سے نکلا۔

اب تو قصص معلوم ہوگا کہ رحم کی ضرورت مظلوم یہودیوں ہی کو نہیں بلکہ

ظالم رومنوں کو بھی ہوا کرتی ہے۔ ایک کنکال مفلس یہودی کے پاس رحم

کہاں سے آیا۔ جاؤ اپنے بیدرد قانون سے مانگو۔ اپنی ظالم قوم سے

طلب کرو۔ اپنے نامنصف دیوتاؤں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ۔ بھیک مانگو۔

مرگزراؤ۔

کیا کیا ہے غیب سے جو رحم کی سوغات آئے

بچ ہی بویا نہیں تو پھل کہاں سے ہاتھ آئے

بروٹس : بتادے عزرا۔ بتادے میں اپنے پچھلے قصوروں کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں

اور یہ سر جو مذہبی پیشوا کا تاج پہنے کے بعد اس ملک کے بادشاہ کے

سامنے بھی نہیں جھکا، آج تیرے قدموں پر جھکتا ہوں۔

عزرا : کیوں؟ کیا جھکا لگا؟

اپنے اوپر آئی تو بھولا سبق یاد آگیا

غیب سے گھونسا پڑا تو کیا سر چکرا گیا

بیٹھے دیتے نہ تھے کبھی بھی کل جس ناک پر

سر جھکا کر اب رگڑتے ہو اسی کو خاک پر

یہودی کی لڑکی

جس کو دھراؤں، سبق ہی ایسا سکھلایا نہیں
کیوں ترس کھاؤں میں جب تم نے ترس کھایا نہیں

بروٹس : تو انکار؟

عزرا : لاکھ بار۔

بروٹس : نہیں جواب دے گا؟

عزرا : نہیں۔

بروٹس : نہیں بتائے گا؟

عزرا : نہیں۔

بروٹس : نہیں رحم کرے گا؟

عزرا : نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔

بروٹس : اچھا نہیں تو نہیں سہی۔ اب میں زبردستی تیرے سینے سے یہ راز اگلاؤں گا۔
تیری ایک ایک ہونٹی کا قیمہ کر کے اپنے کتوں کو کھلاؤں گا۔ جاؤ۔ لے جاؤ۔

جلادو، پھونک دو، جھگڑا ہی پاک کر ڈالو
شجر کے ساتھ شمر کو بھی خاک کر ڈالو
رکھے اسے بھی وہیں، جس جگہ یہ آپ رہے
اب اس زمین پہ بٹی رہے نہ باپ رہے

حق : اے رومن سردار۔

بروٹس : مُردار۔

عزرا : خبردار۔

(پردہ)

تیسرا ایکٹ - پہلا سین

راستہ

(کتا پاہیوں کے ساتھ قید خانے کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے)

---÷---

تیسرا ایکٹ - دوسرا سین

دارالغذاب

بروئس : عزرا۔ تو دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی ہم دونوں سے مذہب، نیکی اور فراخ دلی میں افضل ہیں؟

عزرا : بے شک۔

بروئس : تو اس کا ثبوت دے۔

عزرا : کس طرح؟

بروئس : ثابت کر کہ تو درگزر اور نیکیوں کا دلدادہ ہے۔ ثابت کر کہ تیری روح میں

انتقام سے رحم کا مادہ زیادہ ہے۔

عزرا : مگر میں رحم کس پر کروں؟

بروئس : مجھ پر۔

مرہم ہے ترے پاس مرے زخم جگر کا

بتلا دے مجھے حال، میری نورِ نظر کا

عزرا : سب ہوگا۔ یہی نہیں ہوگا۔

تماشا دیکھتے تھے تم غریبوں کے ترپنے کا

پڑا ہے صبر، اب اُن بے گناہوں کے کلپنے کا

کزھو معلوم ہوتا کہ تم کیا ہے جفا کیا ہے

تصمیم بھی تو خبر ہو کہ ترپنے میں مزا کیا ہے

بروئس : عزرا جو مفلس ہے وہ دولت چاہتا ہے۔ جس کے پاس دولت ہے وہ خطاب

چاہتا ہے۔ جس کے پاس خطاب ہے وہ حکومت چاہتا ہے۔ میں تمہیں یہ تمام چیزیں بیک وقت دینے کو تیار ہوں۔ یہ سب لے لے اور اپنے دل کا راز مجھے دے دے۔

تری اُجڑی ہوئی قسمت کی دنیا پھر سے بستی ہے
بتا۔ اک ہاں سے تجھ پر دولت و عزت برتی ہے

عزرا : خود غرض رومن۔ تیرے ظلم و ستم کا کفارہ دولت سے ادا نہیں ہو سکتا۔ دولت اور خطاب زندگی کے خیالی سائے ہیں۔ اگر تو تمام دنیا کی دولت سمیٹ کر مجھے دے دے، تو بھی یہ ان آنسوؤں کی قیمت نہیں ہو سکتی جو تیرے ظلم و ستم نے مظلوموں کی آنکھوں سے نپکائے ہیں۔

تو ہی ہے، چھین لیا جس نے سکھ نصیبوں کا
تو ہی ہے، جس نے اُجاڑا چمن غریبوں کا
کبھی ہلکتے تھے وہ، آج تو ہلکتا ہے
انھیں کا خون ہے جو آنکھ سے نپکتا ہے

بروٹس : تو ظلم کر رہا ہے۔

عزرا : تجھ سے تھوڑا۔

بروٹس : تو بے رحم ہے۔

عزرا : تجھ سے کم۔

بروٹس : تو جہنم میں جائے گا۔

عزرا : تیرے بعد۔

بروٹس : تو نہیں؟

عزرا : نہیں۔

بروٹس : کب تک؟

عزرا : موت تک۔

بروٹس : اچھا تو دونوں کو حوالہ عذاب کرو۔ موت کے کڑوے پیالے کو اور زیادہ کڑوا

یہودی کی لڑکی

بنانے کے لیے، باپ سے پہلے بیٹی کو کباب کرو۔

اس طرح بھونو کہ ٹوٹے کوہِ غم گمراہ پر

لاکھ لاکھ آنسو بہائے اس کی اک اک آہ پر

خا : لبا پیارے لبا۔ مرنے سے پہلے مجھے برکت دو کہ میرے دل سے موت کا

خوف نکل جائے اور عورت کی فطرت بات پر جان دینے والے مرد کے

ارادے سے بدل جائے۔

بل نہ تیور پہ پڑے، دل نہ گھٹے، آن نہ جائے

جان اس طرح سے دوں بات رہے شان نہ جائے

کر دوں حیرت زدہ جرأت سے جفا کاروں کو

پھول سمجھوں میں، دیکھتے ہوئے انگاروں کو

عزرا : اُف۔ اس لڑکی کی محبت اور میرے ارادے میں جنگ شروع ہو گئی۔ بچاتا

ہوں تو یہودی مذہب کی برکت اور نجات سے محروم رہی جاتی ہے اور نہیں

بچاتا تو جنگل کی سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح بھاڑ میں جھونک دی جاتی ہے۔

کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

میں راہ کون سی بول اے دل شکستہ لوں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا، کدھر کا رستہ لوں

اُسے حوالے کروں، یا جفا پسندوں کو

خدا کو سوچ دوں اس کو کہ اس کے بندوں کو

برٹس : عزرا۔ دنیا کے کسی باپ کے کلیجے میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنی اولاد کی

دردناک موت اپنی آنکھ سے دیکھ سکے۔ عقل سے پھر صلاح لے۔ تو دو حرف

دے کر اس کی زندگی مجھ سے مول لے سکتا ہے۔

راز جس صندوق میں ہے بند اُس کو توڑ دے

کھول دے دل کی گرہ، یہ لب ہلا، ضد چھوڑ دے

کلیات آفاشر کاشیری - جلد چہارم

- عجرا : یہ دنیا بڑی دل چسپ اور خوب صورت ہے۔
 کا : بے شک لیکن اس وقت تک جب تک دل کے ساتھ امید و مسرت ہے۔
 عجرا : ایک جوان آدمی کو دنیا چھوڑتے وقت، بوڑھے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔
 کا : سچ ہے۔ لیکن جو انسان مصیبت کے شروع ہوتے ہی مصیبت کا خاتمہ کر دے۔ اُس کے فہم و دور اندیشی کی تعریف ہوتی ہے۔
 عجرا : اگر تو چاہے تو اس دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے۔
 کا : بغیر خوشی کے۔ بغیر امید کے۔ بغیر تمہارے؟ نہیں پیارے! تبا نہیں۔

نفرت ہے مجھ کو شہد سے اور سم قبول ہے
 یہ ہولناک موت، یہ ماتم قبول ہے
 تنہا جو ہوں، تو چھوڑ کے بھاگوں بہشت کو
 تم ساتھ ہو تو مجھ کو جہنم قبول ہے

- کا : زندگی ایک سلطنت۔ روح اس کی بادشاہ۔ اور مذہب اس بادشاہ کے سر کا تاج ہے۔ اگر زندگی کو موت کے حملے سے بچانا چاہتی ہے تو سر کا تاج اتار کر پیروں سے مل ڈال۔ اپنا مذہب اور ایمان بدل ڈال۔

دین و دنیا دونوں، منہ بھر دیتے ہیں محتاج کا
 اس کا وعدہ پر ہے کل کا، اس کا وعدہ آج کا

کا : تبا جان۔

کروں ایمان پر قربان، دنیا کی بہاروں کو
 مرے گھر میں ہے جب سورج تو کیا دیکھوں ستاروں کو
 خضر نے عمر اور قاروں نے زر پایا تو کیا پایا
 اُسے دنیا میں سب کچھ مل گیا، جس نے خدا پایا

- برونس : جب اسے تبدیل مذہب سے انکار ہے، تو دیر بیکار ہے۔ ڈال دو کڑھاؤ میں۔

عجرا : برونس۔ اس پر رحم کر۔

یہودی کی لڑکی

- بروٹس : نہیں۔
- عزرا : اسے چھوڑ دے۔
- بروٹس : ہرگز نہیں۔
- عزرا : اس کی زندگی بھیک میں دے دے۔
- بروٹس : کبھی نہیں۔ اگر اپنی اور اس کی زندگی کا پیار ہو تو وہ سوال جس کو میں دہراتے دہراتے تھک گیا ہوں اس کا جواب دینے کو تیار ہو۔
- عزرا : اچھا بتاتا ہوں۔
- بروٹس : بتاتا ہوں؟
- عزرا : ہاں۔
- بروٹس : تو بول۔
- عزرا : ایک شرط سے۔
- بروٹس : بیان کر۔
- عزرا : ان کو تاکید کر دے کہ جس وقت میں تیری لڑکی کا حال بیان کر چکوں تو پس و پیش کے خیال کو دل سے نکال دیں اور بغیر دوسرا حکم پائے اس لڑکی کو اٹھا کر تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیں۔
- بروٹس : میں اس شرط کو منظور کرتا ہوں۔
- عزرا : دل و جان سے؟
- بروٹس : دین و ایمان سے۔
- عزرا : اچھا تو سنو۔ شہر روما کے جلتے سے دو برس پہلے کا واقعہ ہے کہ تو نے محض سلام نہ کرنے کے جرم میں میری پانچ برس کی بچی کو اس کی ماں کی گود سے زبردستی چھین کر شیروں کے بچھرے میں ڈال دیا تھا۔ مگر اب ایک یہودی کا سلوک دیکھ کہ اُس وقت جب کہ ظالم نیرو کے حکم سے تمام شہر میں آگ لگی ہوئی تھی میں نے تیرے جلتے ہوئے محل میں گھس کر تیری چھ ماہ کی اکلوتی بچی کو موت کے منہ سے باہر نکالا۔ اور انتقام اور کینہ کو جس سے میرا سینہ جل رہا تھا، بھول گیا۔ اور اسے اپنی اولاد کی طرح پالا۔

کلیات آغا شہر کاٹھیری - جلد چہارم

بروٹس : تو نے نکالا؟ تو نے پالا؟

عزرا : ہاں میں نے۔ میں نے۔ ظالم رومن۔ ایک یہودی نے اور اس یہودی نے جسے تم ٹھوکریں مارتے تھے۔ جسے مٹا سمجھ کر دھکارتے تھے۔

روٹی جو اُس کے حال پہ، اُس چشمِ غم کو دیکھ
اپنے ستم کو دیکھ، ہمارے کرم کو دیکھ

بروٹس : مگر وہ کہاں ہے؟

عزرا : کیا جن آنکھوں سے خدا کی ہزاروں قوتوں کو دیکھ کر بھی اُسے شناخت نہیں کر سکتے، ان آنکھوں سے اپنی لڑکی کو بھی نہیں پہچان سکتے؟ دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ خون آپ سے آپ جوش مارے گا۔ اگر تمہارا ہی لبو ہوگا تو رگوں کے اندر سے پکارے گا۔

بروٹس : نہیں عزرا نہیں۔ تو مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ تیر و تلوار سے نہیں مار سکتا، اس لیے جھوٹی خوشی دلا کر دیوانہ بنا دینا چاہتا ہے۔

شکل دکھلا دے کہ نور آئے نجل آنکھوں میں
شوق دیدار سے کھینچ آیا ہے دل آنکھوں میں

عزرا : وہ دیکھ۔ تیرے سامنے بڑی اور خون سے بنا ہوا ایک آئینہ کھڑا ہے۔ اُسی آئینے میں تجھے، تیری کھوئی ہوئی لڑکی کی صورت نظر آئے گی۔ جو تیرے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائے گی۔

بروٹس : یہ تو ایک یہودن لڑکی ہے۔

عزرا : یہودن نہیں، رومن نژاد ہے۔ میری نہیں تیرنی اولاد ہے۔

بروٹس : میری؟

عزرا : ہاں تیری۔ یہی وہ لڑکی ہے جسے میں نے بھڑکتی ہوئی آگ سے باہر نکالا اور اپنی اولاد بنا کر ختا کے نام سے پالا۔

بروٹس : اس کا ثبوت؟

عزرا : تیرے خاندان کی یادگار یہ تعویذ و عقیق کی مالا۔

یہودی کی لڑکی

خدا کی دین ہے ملتا ہے یہ نصیبوں سے
ہے رحم سیکنا تو سیکھ ہم غریبوں سے

بروٹس : ٹھیک۔ یہ وہی مالا ہے۔ جو پیدائش کے روز نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لیے
میں نے لڑکی کے گلے میں پہنائی تھی۔ پہچان لیا۔ وہی۔ وہی.... آ... میرے
دل کا سرور... میری آنکھوں کا نور... آ۔

مٹا : ابا جان۔

عزرا : ٹھہرو۔ میرا وعدہ پورا ہو چکا۔ اب تمہارا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا۔ چلو۔
فکر و حیرت کو دل سے نکال دو۔ اور باپ کے سامنے بیٹی کو اٹھا کر تیل
کے کڑھاؤ میں ڈال دو۔

بروٹس : نہیں عزرا۔ اب یہ نہیں ہو سکتا۔

عزرا : نہیں ہو سکتا۔ کیوں نہیں ہو سکتا؟۔

جب تلک یہ جانتے تھے، غیر کی اولاد ہے
تب تلک یہ تھا زباں پر قابل بیداد ہے
جب کھلا یہ کون ہے، کیا ذات، کیا بنیاد ہے
تب یہ چلانے لگے، فریاد ہے فریاد ہے
کیا ہوئی وہ ضد، کہاں ہے زور و شتاب آپ کا
سامنے بیٹی کے ملنے دو کلیجہ باپ کا

حیرت اور خوف کی تصویریں بن کر حرکت کرنا کیوں بھول گئے؟ ثابت کرو
کہ تم زندہ ہو۔

بروٹس : نہیں عزرا نہیں۔ میری غرور کی زندگی ختم ہو گئی۔ میرے اقتدار کا سر بلند
قلعہ ایک ہی زلزلے میں ریزہ ریزہ ہو کر اپنی خاک میں کفن پوش ہو گیا۔

جب پڑی خود اپنے سر پر ضرب، عبرت ہو گئی
غیر کا بھی دکھ ہے دکھ، مجھ کو نصیحت ہو گئی

تیسرا ایکٹ - تیسرا سین

دربار

(سب کا خوشی میں بیٹھے ہوئے دکھائی دینا)

برٹس : میرے محسن عِزرا۔ میرے عزیز بھائی۔ اگرچہ محبت پدری کا کچھ اور ہی ارادہ ہے۔ مگر حکم پر مجھ سے تمہارا حق زیادہ ہے۔ اس لیے جس دین و مذہب میں اس نے پرورش پائی ہے اُسی دین و مذہب میں رہے گی۔ جس طرح آج تک تمہیں اپنا باپ کہتی رہی ہے، اُسی طرح ہمیشہ کہے گی۔

مارٹس : پیاری حکم۔ میں تمہارا گنہ گار ہوں۔ اور جو سزا تجویز کرو اس کو بخوشی برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

حکم : میں تمہیں یہی سزا دیتی ہوں کہ جس طرح مجھے دھوکا دیا ہے، اُسی طرح آئندہ کسی اور عورت کو دھوکا نہ دینا۔

آکٹیویا : پیاری بہن۔ جب تم رومن نسل اور رومن باپ کی اولاد ہو تو تمہارا بادشاہ تمہارے لیے شادی کے قانون میں ضرور ترمیم کر دے گا۔

بادشاہ : ایسا ہی ہوگا۔

آکٹیویا : اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اب جو دور تھا وہ قریب ہو۔ میری خوشی اور راحت میں تم بھی برابر کی شریک ہو۔

حکم : بس اب میں راحت، خوشی، آرام، اس جھوٹی دنیا کی کوئی چیز نہیں چاہتی..... تم دونوں جیو اور خوش رہو۔

آکٹیویا : تو بہن۔ تم اس جھوٹی دنیا میں تھا رہ کر کیونکر زندگی بسر کرو گی؟

(خا کا گانا)

اپنے مولا کی میں جوگن بنوں گی۔
 جوگن بنوں گی، بروگن بنوں گی۔ اپنے مولا....
 تیرے عشق میں پہنی کفن چھوڑا زیور گہنا
 تو جس رنگ میں خوش ہو پیارے اُسی رنگ میں رہنا۔ اپنے مولا...
 کوئی جائے مسجد میں اور کوئی جائے مندر
 ہم نے تیرا جلوہ پایا پیارے دل کے اندر۔ اپنے مولا...
 کوئل بن کر جنگل ڈھونڈھا، بلبل بن کر گلشن،
 کلیاں چُن چُن میں نے دیکھی بن کر تیری مالن۔ اپنے مولا...

(پردہ)

ترکی حور

ترکی حور (1922)

یہ ڈراما بھی آغا حشر کی اس اصلاحی مہم سے متعلق ہے، جو انھوں نے 'سلور کنگ' سے شروع کی تھی۔ اس ڈرامے میں بھی 'سلور کنگ' ہی کی طرح شراب نوشی، قمار بازی اور طوائفوں سے تعلق رکھنے کے برے نتائج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسے ہڈنس کمپنی کے رستم جی سیٹھ کے اصرار پر لکھا گیا تھا اور انھیں کی کمپنی نے اسے پہلی بار اسٹیج بھی کیا۔ اس ڈرامے میں ہندوستانی بیوی کا مثالی کردار پیش کیا گیا ہے، جو شوہر کے انتہائی ناروا سلوک اور حد درجہ پریشانی کے باوجود شوہر پرستی ترک نہیں کرتی اور ہمیشہ اپنی وفاداری کا ثبوت دیتی رہتی ہے۔ آغا حشر کو اپنا یہ ڈراما بے حد پسند تھا اور وہ اسے اپنا شاہ کار کہا کرتے تھے۔ اس کا زبان اور بیانیہ ادبی شان لیے ہوئے ہے اور مکالموں کا فکری پہلو اس فن میں آغا صاحب کی مہارت اور مشاطی کی بہترین مثال ہے۔ اس ڈرامے کا نام 'ترکی حور' کیوں رکھا گیا ہے، قاری یا ناظر کو اس کا جواب پورا ڈراما دیکھنے کے بعد بھی نہیں ملتا۔ بعض محققین نے اس سلسلے میں رستم جی سیٹھ کی ضد کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے یہ بات ہی درست ہو۔ کیونکہ خود آغا حشر کا ایسا کرنا ان کے حراج کے منافی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے پس پشت بھی وہی بات رہی ہو کہ اس عہد کے شائقین غیر ملکی چیزوں کو اسٹیج پر دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے اور یہ بات بھی ڈرامے کی کامیابی میں کہیں نہ کہیں معاون ہوا کرتی تھی۔ شاید ترکی حور ہندوستانی عورت کے مقابلے میں ان کے لیے زیادہ باعث کشش ہو۔ شاید رستم جی کی ضد میں بھی یہی پہلو شامل رہا ہو اور حالات کے تحت آغا حشر ان کی بات مان لینے پر مجبور ہو گئے ہوں۔

اس ڈرامے کے چار مسودے اور تین مطبوعہ نسخے آغا صاحب کے ذخیرے سے برآمد ہوئے۔ یہ نسخے اردو مرکز، لاہور سے (مقدمہ عشرت رحمانی) 1954 میں، آئینہ ادب، لاہور سے 1982 میں اور رتن اینڈ کو، دہلی سے شائع ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مسودات آغا حشر کے انتقال کے بعد ثانوی ذرائع سے حاصل کیے گئے ہوں گے۔

دستیاب چار مسودوں میں سے پہلا مسودہ مجلد کاپی کی شکل میں ہے۔ اس کے آخر میں تاریخ تحریر 9 دسمبر 1932 درج ہے۔ لیکن کاتب کا نام موجود نہیں۔ مشمولہ ڈراما اسی مسودے پر مبنی ہے۔ دوسرا مسودہ 300 صفحات کی ایک کاپی میں منقول ہے۔ اسے 1962 میں راجا ماسٹر نے نقل کیا ہے۔ اس کی حالت اچھی ہے لیکن ظاہر ہے یہ آغا حشر کے انتقال کے بعد کا نسخہ ہے۔ تیسرا مسودہ نامکمل ہے۔ یہ کاپی کے کل 26 صفحات پر لکھا ہوا ہے۔ اس میں پہلے باب کے صرف چار سین ہیں۔ چوتھا مسودہ محمد صدیق عرف جن کا لکھا ہوا ہے، جو 124 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں کلکتہ، مورخہ 9 جون 1951 لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نسخہ بھی کافی بعد کا ہے۔

کردار

مرد

عارف	ایک فضول خرچ رئیس زادہ
فرید بیگ	معزز رئیس۔ عارف کا خسر
انور	فرید بیگ کا بیٹا۔ ترکی فوج کا کپتان
ایاز	عارف کا وفادار ملازم
عائم	ایک آوارہ نوجوان۔ عارف کا دوست
زیاد	ایک عیاش رئیس۔ ترکی سلطنت کا ماتحت جاگیردار
طارق نعمان	زیاد کے مصاحب
اتش رحلال	انور کے فوجی دوست
عائم	ایک دولت مند عیاش
پولیس افسر۔ جیل کا جہدار۔ قیدی۔ ہوٹل مالک، خاناماں اور دیگر ملازم	

خواتین

رشیدہ	عارف کی وفادار بیوی۔ فرید بیگ کی لڑکی
لیلیٰ	با عصمت گل فروش
شمیم	طوائف
نسیم	شمیم کی ماں
رشیدہ کی سہیلیاں اور کنیریں وغیرہ	

پہلا ایکٹ - پہلا سین

دیوان خانہ

(رشیدہ غور سے کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس کی دو ہم جو لیاں پاس بیٹھی ہوئی اخبار دیکھ رہی ہیں)

رشیدہ : کتاب ہی تنہائی کے وقت مرد کے لیے سب سے اچھا دوست اور کتاب ہی عورت کے لیے سب سے اچھی سہیلی ہے۔ کتاب ماں کی طرح دل و دماغ میں عمدہ خیالات کی پرورش کرتی ہے۔ استاد کی طرح نیکی و اخلاق کی تعلیم دیتی ہے۔ جہاں دیدہ سیاح کی طرح انسان کے ماضی و حال کا افسانہ کہتی ہے۔ رہنما ستارے کی طرح دنیا کے بچ دار اور تاریک راستوں میں روشنی بن کر زندگی کے آگے آگے چلتی ہے۔

جلوے ہیں علم و عقل کے یوں حرف حرف میں
جیسے کرن چمکتی ہے شفاف برف میں
ذرے میں کائنات ہے، دریا حباب میں
دنیا بسی ہے چند ورق کی کتاب میں

(دوبارہ کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو جاتی ہے)

سہیلی ۱: بہن رشیدہ۔ ہم تم سے بات کرنے آئے اور تم کاغذ میں چھپے حروف سے باتیں کر رہی ہو۔

سہیلی ۲: سیاہی کو سوختہ جذب کرتا ہے اور تمہاری نظروں کو ان حروف کی سیاہی نے جذب کر لیا ہے۔

سہیلی ۱: بڑے شوق و غور سے دیکھ رہی ہو۔ کون سی کتاب ہے؟

رشیدہ: ایک نو تصنیف اخلاقی ناول۔

سہیلی ۲: اے ہے بہن۔ پھینکو بھی۔ تم ناول پڑھتی ہو؟

رشیدہ: تو کیا ناول کا مطالعہ گناہ میں داخل ہے؟

سہیلی ۲: بے شک۔

رشیدہ: باجی۔ اگر وہی اور بزدل بنانے والی دیو پری کی کہانیاں، گندی غزلوں کے

دیوان اور حیا سوز ناول پڑھنا گناہ نہیں ہے تو کسی اچھے شاعر کا سبق آموز

ناول پڑھنا کیوں گناہ ہے؟

سہیلی ۲: گناہ نہ ہوتا تو لوگ ناول دیکھنا کیوں بُرا سمجھتے؟

رشیدہ: یہ اعتقاد کا زمانہ نہیں ہے، عقل اور تجربے کا زمانہ ہے۔ اس نئے زمانے میں

جب کہ دنیا آدھی کی طرح پرانے خیالات کو اڑاتی ہوئی آگے بڑھی جا رہی

ہے، ناول کو برا سمجھنا سمجھ کی غلطی ہے۔

سہیلی ۲: کیا۔ غلطی؟

رشیدہ: ہاں، جن ناولوں میں غلط زبان، مہمل شاعری، سطحی خیالات اور اخلاق و مذاق

بگاڑنے والی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، وہ بے شک توجہ اور قدر دانی

کے حق دار نہیں ہیں۔ لیکن بہترین ناولوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا علم

اور عقل کا گلا گھونٹنا ہے۔

سہیلی ۲: موعے ناول بدتر ہوں یا بہتر، مگر یہ تو کہو کہ ان سے فائدہ کیا ہے؟

رشیدہ: ناول بھی سوئے ہوؤں کو جگانے اور گرے ہوؤں کو اٹھانے کا ایک زبردست

ذریعہ ہے۔ جو ترقی کا جوش اور اصلاح کا جذبہ سینکڑوں وعظ اور ہزاروں

لکچر سن کر برسوں میں پیدا نہیں ہوتا، وہی جوش و جذبہ انسان کے اندر، بہتر

ناول صرف ایک رات میں پیدا کر دیتا ہے۔

سہیلی ۲: تم نے تو میرا خیال ہی بدل دیا۔ ناول اور خوبیاں، میں تو انہیں برائیوں کا

پوٹ سمجھتی تھی۔

سہیلی ۱: تم جو ناول پڑھ رہی ہو، اس کا نام کیا ہے؟

رشیدہ : ”ترکی حور“۔

سہیلی ۲ : مصنف کون ہے؟

رشیدہ : آغا حشر کاشمیری۔

سہیلی ۲ : یہ تو مشہور شاعر ہے۔ میں نے اخباروں اور رسالوں میں اس کی ان نظمیں پڑھی ہیں۔

سہیلی ۱ : اس ناول میں کیا دکھایا گیا ہے؟

رشیدہ : شراب خوری اور فضول خرچی کا نتیجہ۔

سہیلی ۲ : یعنی؟

رشیدہ : بہن ہمارا ملک جو سادہ کھانا، سادہ پہننا اور سادے طور پر زندگی بسر کرتا پسند کرتا ہے، آج نمود و نمائش کا بندہ، فیشن کا غلام اور شراب کے نجس پیپوں کی کھسی بن رہا ہے۔ امیر تو امیر، غریب مزدور تک اپنی دن بھر کی کمائی کا ایک حصہ چائے اور سگریٹ پر اور دوسرے شام کے وقت شراب کی دوکان پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ فضول خرچی اور شراب خوری کی لہروں میں تندرستی، دولت، عزت سب کچھ تنکے کی طرح بہی جا رہی ہے۔ ان برائیوں کا بیان۔ یہی اس ناول کا مضمون اور ان برائیوں کی اصلاح کی طرف ملک کو توجہ دلانا، یہی اس ناول کا مقصد ہے۔

سہیلی ۱ : (دوسری سے) آپا دولھا بھائی آفس سے آگئے ہوں گے۔ اب گھر جانے کی اجازت لو۔

رشیدہ : اے بیٹھو۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟

سہیلی ۲ : نہیں بہن وہ میرا راستہ دیکھ رہے ہوں گے۔ مگر دیکھو تم نے پرسوں آنے کا وعدہ کیا ہے۔ وعدہ بھولیں تو پانچ سیر مٹھائی جرمانہ کر دوں گی۔

رشیدہ : اور جو میں نے جرمانہ نہ دیا؟

سہیلی ۲ : تو مجھے وصول کرنے کا طریقہ معلوم ہے۔ مٹھائی کے جتنے روپے ہوتے ہیں اتنے ہی روپے پر تمہیں تمہارے میاں کے ہاتھ بیچ ڈالوں گی۔

رشیدہ : بڑی مہربانی۔

(رشیدہ دونوں کو دروازے تک پہنچانے جاتی ہے اور اندر سے عارف اور غانم آتے ہیں)

عارف : بے شک تم بھروسے اور دوستی کے لائق ہو اور اسی لیے میں تمہیں اپنا سچا خیر خواہ اور سچا دوست سمجھتا ہوں۔

غانم : آپ کی قدر دانی ہے جو مجھے اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتے ہیں۔ ورنہ میرے خاص خاص مہربانوں نے تو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ جس کا میں دوست بنوں اُسے دنیا میں دشمن ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عارف : میں حیران ہوں کہ دنیا تم جیسے شریف آدمی کو کیوں بُرا سمجھتی ہے۔ یہی ناکہ تم غریب ہو، شرابی ہو۔ لیکن غریبی کوئی جرم نہیں ہے۔ اپنا کمایا ہوا خرچ کرنا چوری نہیں ہے۔ اور جیسا کہ تم نے مجھ سے کہا، اگر ڈاکٹر کے مشورے سے صرف تندرستی قائم رکھنے کے لیے بطور دوا کے شراب پیتے ہو تو یہ مجبوری کا پینا بد چلتی نہیں ہے۔

غانم : جناب مجھے خود تعجب ہے کہ دنیا میرے ساتھ اتنی ناانصافی کیوں کر رہی ہے۔ صورت دیکھتے ہی اکثر منہ پھٹ تڑ سے بد معاش کہہ دیتے ہیں۔ گویا میرا چہرہ بد معاشی کی دوکان کا سائن بورڈ ہے۔ جس پر مونے حرفوں میں پانچ لکھا ہوا ہے۔

عارف : اچھا کہو۔ کل کا کیا پروگرام ہے؟

غانم : دنیا میں ایک امیروں کا پروگرام ہوتا ہے اور ایک غریبوں کا۔ جو پسند ہو وہی پروگرام تیار کروں۔

عارف : غریبوں کا کیا پروگرام ہوتا ہے؟

غانم : صبح چھ بجے اٹھنا۔ دن بھر محنت کرنا۔ شام کو گھر آکر بیوی بچوں سے ہنسنا کھیلنا اور دس بجے رات سے پہلے کھا پی کر مردوں سے شرط باندھ کر سو جانا۔ یہ غریبوں کا پروگرام ہے۔

عارف : اور امیروں کا پروگرام؟

ترکی خود

غانم : گیارہ بجے سو کر اٹھا۔ بارہ بجے ناشتہ کرتا۔ ادھر ادھر کی زل بازی کے بعد پونے تین بجے کھانا کھاتا۔ تین سے سات بجے شام تک بھر خزانے لینا اور ساری رات تھیز، جلے، ہاہو میں کاٹ کر سورج کے جاگنے کے وقت ٹانگیں لمبی کر کے پلنگ پر اٹا چت ہو جاتا، یہ امیروں کا پروگرام ہے۔

عارف : پروگرام سے میرا یہ مطلب ہے کہ کل تھیز میں نیا تماشا بھی ہے اور زیادہ پاشا کے یہاں دعوت بھی ہے۔ ایک جگہ آنکھوں کو خوراک ملے گی اور دوسری جگہ پیٹ کو، کہاں کا ارادہ ہے؟

غانم : ہینڈل کا چکر گھما کر جس طرف ڈرائیور پھک پھک اور ہم کرتی ہوئی موٹر کا رخ پھیر دے گا، اسی طرف چل پڑیں گے۔

عارف : تو میں کل شام کو سات سے آٹھ تک تمہارا منتظر رہوں گا۔

غانم : آداب۔

عارف : بھولنا نہیں۔

غانم : اطمینان رکھیے۔ جیسے وکیل مقدمے کی فیس لینا اور رٹھی بے وفائی کرتا نہیں بھولتی ویسے ہی میں بھی اپنا وعدہ نہیں بھولتا۔

(غانم کا جانا)

عارف : کیا دل چسپ آدمی ہے۔ آج کا غم اور کل کی فکر دونوں کو پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ اس کا قول ہے کہ زندگی شراب کا پیالہ ہے۔ اُسے منہ بنا کر نہیں مرے لے لے کر ختم کرنا چاہیے۔

(رشیدہ واپس آتی ہے)

رشیدہ : (سائڈ میں) یہ محبت کا قیدی کہاں بھاگا جا رہا ہے؟

(پچھے سے عارف کی آنکھیں بند کر لیتی ہے)

عارف : (آنکھوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے) ارے دن کو ڈاکہ کیسا؟ یہ کون؟

رشیدہ : (سامنے آکر) نہیں پہچانتے؟ میں گھر کی کوتوال۔

کلیات آغا شہر کا شیری - جلد چہارم

- عارف : تو یہ مجھے تو چور کا دھوکہ ہوا تھا۔
- رشیدہ : صدقے اس سمجھ کے۔ کوتوال کو چور سمجھ لیا۔
- عارف : ہاں میں سمجھا کہ کوئی چور میری آنکھیں بند کر کے سینے کے پاکٹ سے دل کی نقدی نکال رہا ہے۔
- رشیدہ : مگر آپ کے پاس دل ہے کہاں؟ جو چوری ہوگا۔ دل تو پہلے ہی آپ ایک شریف کی لڑکی کو نذر کر چکے ہیں۔
- عارف : وہ کون؟ اس کا نام؟
- رشیدہ : شادی سے پہلے اس کا نام تھا رشیدہ اور اب اس کا نام ہے جو رو۔
- عارف : یعنی تم؟
- رشیدہ : واہ۔ میں کیوں۔ میرا نام کیا جو رو ہے؟ میرا نام تو بیوی ہے۔
- عارف : لیکن تم تو ابھی اپنے کو گھر کا کوتوال کہتی تھیں۔
- رشیدہ : کہتی تھی نہیں۔ کہتی ہوں، بولو، کوتوال کا کیا کام ہے؟
- عارف : انتظام اور حفاظت۔
- رشیدہ : ٹھیک ہے۔ تم جواب میں فیل ہونے کے بدلے پاس ہو گئے۔ اب سینے شریف بیویاں بھی شوہر کے گھر کا انتظام اور شوہر کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہیں۔ اسی لیے انھیں گھر کا کوتوال کہتے ہیں۔ سمجھے یا کوتوال کی طرح ڈانٹ کر سمجھاؤں؟
- عارف : تم اپنا کرنے والی بیوی ہی نہیں، میرے گھر کی روشنی اور میرے دل کے دنیا کی مالکہ ہو۔
- رشیدہ : میرے مالک میں صرف تمہاری لوٹھی ہوں۔

(گاتا)

- رشیدہ : بلبل میں تو پریم کی بھی پیاسی۔
- تمہاری میں ہوں داسی۔
- نین کے سیں سے ہر لیو سیاں۔ مووے گرے ڈارے بہیاں۔

عارف : من ہر ناری۔ بھولی ناری۔
رشیدہ : ہر لیت مورے تن من دکھ شوک روگ اُداسی۔
عارف : میں ہوں تیرا دیوانہ۔
رشیدہ : بس رہنے دو مٹھلانا..... بلم میں تو.....
(دونوں کا جانا)

پہلا ایکٹ - دوسرا سین

جشن گاہ

(زیاد پاشا صوفے پر لیٹا ہے۔ ایک نازنین پیچھے کھڑی پنکھا چل رہی ہے اور دوسری پیروں کے پاس بیٹھ کر شراب کا گلاس پیش کر رہی ہے۔ مصاحمین، احباب اور جمعی غلام حاضر ہیں۔ سامنے خوبصورت لڑکیوں کا غول ناچ رہا ہے۔

ناظم : ۔

ہماری رات بھی دن ہے پری جمالوں سے
کھلی ہے چاندنی محفل میں گورے گالوں سے
پڑا ہے عکس جو اُن کے گلابی گالوں کا
شفق کے حُسن پہ ہنستا ہے رنگ پیالوں کا

زیاد پاشا : مضمون بھی خوبصورت اور لفظ بھی خوبصورت۔ دو شعر مجھے بھی یاد آئے۔

مصاحب : ارشاد۔

زیاد : ۔

ازل سے چاند کی کرنوں نے جن کو سینچا ہے
انہیں ستاروں کے پھولوں کا عطر کھینچا ہے
عجیب چیز براے سرور پیتے ہیں
ہم آج گھول کے سوڈے میں نور پیتے ہیں

طارق : اے سبحان اللہ۔ روح تازہ ہو گئی۔

ترکی حور

ناظم : بالکل اچھوتا مضمون ہے۔ شاعر نے ستاروں کی دنیا کا تمام حسن لوٹ کر اپنے دو شعروں کو دے دیا ہے۔
 غلام : (آکر) عارف آفندی تشریف لائے ہیں۔
 زیاد : خوش آمدید کہو۔

(غلام واپس جاتا ہے)

ناظم : واللہ۔ جب سے آپ کی دوستی کا فخر حاصل ہوا ہے، تب سے زندگی بڑی ہی پر لطف ہو گئی ہے۔
 زیاد : اس شہر کی دل چسپی اور دوستوں کی محبت ہی ہے جو میرے قلعے اور ریاست سے بار بار مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے۔

(عارف اور غلام آتے ہیں)

عارف : نیاز مند کی تسلیم قبول ہو۔
 غلام : خادم بھی آداب کی نذر پیش کرتا ہے۔
 زیاد : اخاء۔ عارف کے ساتھ غلام بھی۔
 غلام : جناب میں ان سے کس طرح الگ رہ سکتا ہوں۔ جہاں آقا ہوگا وہاں خادم بھی ہوگا۔ کیونکہ یہ مارچ کا مہینہ ہیں تو میں گڈ فرائی ڈے ہوں۔ یہ دسمبر ہیں تو میں کرسمس ہوں، یہ نئے برس ہیں تو میں نئے برس کا کیلینڈر ہوں۔
 مصاحب : غلام کا منہ مذاق کا فوارہ ہے۔ جس سے ہر وقت دل لگی کے لفظوں کی پھوار پڑتی رہتی ہے۔

زیاد : بڑا ہی زندہ دل آدمی ہے۔ (عارف سے) مگر عارف چاند کے اوپر سے گزرتے ہوئے بادل کے نکلنے کی طرح اس وقت آپ کے چہرے پر اداسی کا تاریک سایہ کیوں دکھائی دیتا ہے۔ خیریت تو ہے؟

عارف : کیا کہوں۔ میرے پچھلے قرضوں میں صرف پانچ ہزار کا قرض باقی رہ گیا تھا جس کی بے باقی کے لیے میرے سر نے آج ہزار ہزار کے پانچ قطعہ

نوٹ دیے تھے۔ قرض خواہ کے آفس میں پہنچ کر دیکھا تو ایک دم چوک پڑا۔ جیب موجود اور نوٹ غائب۔

زیاد : کیا ہوئے؟

عارف : نہ جانے کیسے گئے اور کہاں گئے؟

غانم : (سانڈ میں) قرض خواہ کی تجوری میں پہنچنے کے بدلے غانم کی پاکٹ میں پہنچ گئے۔

زیاد : ساتھ کون تھا؟

عارف : میرا دوست غانم۔

غانم : بے چارہ غانم کیا کرتا۔ اس شہر میں تو ایسے ایسے پاکٹ مار رہتے ہیں، جو پاکٹ سے نوٹ کیا، کتے کی دم سے ٹیڑھا پن اور سیانی رنڈی کے دل سے جھل پٹ نکال لیں۔

عارف : آپ نے سنا ہوگا کہ میرے مرحوم والد مکانات اور زمین کے علاوہ آٹھ لاکھ نقد چھوڑ کر مرے تھے، جس کو میں نے چند ہی برسوں کے اندر بری سمجھتوں اور فضول خرچیوں میں آتش بازی کے اتار کی طرح پھونک کر ختم کر دیا۔ چونکہ میرے سر کو ابھی تک میرے نیک چلن ہو جانے کا پورا اطمینان نہیں ہے اس لیے انھیں ضرور خیال ہوگا کہ یہ نوٹ بھی پہلی جیسی حرکتوں میں غارت ہوئے ہیں۔ بس یہی ایک فکر ہے، اور یہی فکر چہرے کی اداسی کا باعث ہے۔

غانم : میرے دوست۔ دولت تو آتی جانی چیز ہے۔ نہ بخی کے پاس رہتی ہے نہ کنجوس کے۔ فرق یہ ہے کہ بخی کی دولت اس کی زنگی ہی میں اس کے ہاتھ سے کھانے کھلانے میں خرچ ہوتی ہے اور کنجوس کی دولت اس کے مرنے کے بعد اس کے لڑکوں کے ہاتھوں رنڈی بازی یا مقدمہ بازی میں جہاں ہوتی ہے۔ اس لیے جانے والی دولت چلی گئی تو اب رنج سے کیا فائدہ۔ جس نے نوٹ لیے خدا اُس کا بھلا کرے۔

عارف : دولت کے رہتے ہوئے چاہے دولت کی قدر نہ ہو مگر ضائع ہو جانے کے بعد

دولت کو سنبھال کر نہ رکھنے کا رنج ضرور ہوتا ہے۔
 عاتم : لیکن رنج کے مرض کا صبر کے سوا علاج کیا ہے (پاشا سے) میں تو یہی دوا جانتا ہوں۔ (ہوٹل سے گلاس میں شراب اٹھیلنے کا اشارہ کر کے) کیا آپ کے پاس اس بیماری کی کوئی اور دوا ہے؟
 زیاد : نہایت مفید اور نہایت لذیذ (مصاحب سے) طارق گلاس میں رنج کی دوا کا ایک ڈوز اٹھیلو۔
 طارق : (شراب کا گلاس پیش کر کے) لیجیے نوش کیجیے۔ یہ رنج اور فکر بھلانے کی پینٹ دوا ہے۔ ۔

حلق سے اتری کہ بس آرام پایا جان نے
 یہ دوا ایجاد کی ہے ڈاکٹر لقمان نے

عارف : معاف کیجیے۔
 عاتم : کیوں؟ یہ تو مردے کو زندہ کرنے والا آب حیات ہے۔
 عارف : لیکن میں اسے ساری بیماریوں کا ست اور تمام خوفناک زہروں کا نچوڑ سمجھتا ہوں۔

عاتم : اچی اس کی رنگت تو دیکھیے۔
 عارف : یہ رنگت نہیں، شیطان کے چہرے کی چمک ہے۔
 عاتم : اس کی خوشبو تو سونگھیے۔
 عارف : یہ خوشبو نہیں۔ گناہ کے پرہالے کی بدبو ہے۔
 عاتم : اس کی لذت تو چکھیے۔
 عارف : یہ لذت نہیں، موت کے پیالے کی کڑواہٹ ہے۔
 زیاد : آخر انکار کی وجہ؟

عارف : گلاس منہ سے لگانے کے بعد انسان انسان نہیں رہتا۔ ایک عالم کا قول ہے کہ پیٹ میں شراب پہنچے ہی عقل انسان کے دماغ سے نکل کر باہر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کیا آپ کی یہ خواہش ہے کہ میں آدمی سے جانور بن کر بندر

کی طرح اچھل کود کرنے لگوں؟

زیادہ : شراب غمگین روح اور ست پڑ گئے ہوئے دل کے لیے ایسی ہی ہے، جیسے بجھتے ہوئے چراغ کے لیے تیل یا بند ہو گئی ہوئی گھڑی کے لیے چابی۔ دنیا میں ایسی کون دوا ہے جو دو منٹ کے اندر دل میں جوش، خون میں گرمی، بدن میں پھرتی، آنکھوں میں سرور، ہونٹوں پر ہنسی اور جھریاں پڑے ہوئے چہرے پر جوانی کی رونق پیدا کر دے۔ مجھے شراب میں خوبیوں کے سوا کوئی نقصان دکھائی نہیں دیتا۔

عارف : شراب کے نقصان اول پولیس کے سپاہیوں سے پوچھیے جو ہر روز سڑک پر پڑے ہوئے شرابیوں کو لے جا کر حوالات میں بند کر دیتے ہیں۔ شراب کے نقصان ان غریب عورتوں سے پوچھیے جن کے شرابی شوہر آدمی رات کو جموٹے ہوئے گھر میں آکر بیوی بچوں کے ساتھ لاقوں اور گالیوں سے اپنی محبت ظاہر کرتے ہیں۔ شراب کے نقصان ان بدنصیبوں سے پوچھیے جو پیچیدہ، معدہ، دل، دماغ، جسم کی مشین کا ایک ایک پرزہ خراب کرنے کے بعد ریشہ، مٹھیا، فالج میں گرفتار ہو کر کسی اسپتال میں یا عقل و ہوش کھو کر کسی پاگل خانے میں یا نئے کی حالت میں خون اور جرم کر کے کسی جیل میں زندگی کے باقی دن سک سک کر پورے کر رہے ہیں۔

شراب راحت نہیں ہے غم ہے، شراب امرت نہیں ہے سم ہے
شراب دروازہ موت کا ہے، شراب سیدھی رو عدم ہے
نہ زہ نہ طاقت، نہ تندرستی، کسی طرح سانس چل رہی ہے
شراب فٹ فٹ جو تھے نکلے، شراب انہیں اب نکل رہی ہے

عالم : آپ شراب پینے والوں کا قصور بچاری شراب کے سر قہوہ رہے ہیں۔ جس طرح شراب خریدنے کے لیے روپے کی ضرورت ہے ویسے ہی شراب پینے کے لیے قہیز کی ضرورت ہے۔ اناج سے زندگی ہے لیکن پاؤ بھر کی بھوک میں ڈیڑھ سیر ڈکار جاؤ تو یقیناً پیسے کی بیماری ہو جائے گی۔ پانی بدن کا بخود ہے

ترکی حور

لیکن گلاس دو گلاس کے بدلے پورا گھڑا غٹ غٹا جاؤ تو ضرور پیٹ پھول کر
ٹپکا ہو جائے گا۔ شراب پینے کا پروگرام یہ ہے کہ دوا سمجھ کر پیو، کبھی کبھی پیو اور
حد کے اندر پیو۔ اور ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ پینے کا مزا چاہتے ہو تو کسی
معشوق کے ساتھ پیو۔

عارف : دنیا میں سب ممکن ہے لیکن شرابی ایک گلاس کے بعد دوسرا اور دوسرے کے
بعد تیسرا گلاس نہ مانگے یہی بات ناممکن ہے۔

بھول جاتا ہے نتیجہ چل گئے جب دور دور

بس یہی رشتا ہے پھر وہ، اور دو ہاں اور دو

بڑھاپے سے شکیلا ہوا ایشیا یورپ سے بڑھ کر عقل مند نہیں ہے۔ اگر
شراب میں نقصان، یا شراب کا حد کے اندر پینا ناممکن ہوتا تو آج یورپ
میں پانی سستا اور شراب مہنگی نہ ہوتی۔

عارف : شراب سے یورپ کی اخلاقی و جسمانی صحت کس طرح خراب ہو رہی ہے،
جرم اور موت کی تعداد کس رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ دہسکی اور نیئر کے
ریلوں سے سوسائٹی کی بنیادیں کیوں کر کٹ کر گر رہی ہیں۔ اگر یہ جاننا
ہے تو یورپ کے اخباروں کے آرکیل، پولیس کی رپورٹ، جھوٹ کے فیصلے،
ڈاکٹروں کے بیان، میمرنس سوسائٹیوں کے لکچر پڑھو۔ جب تمہیں معلوم ہوگا
کہ اب وہاں کے لوگ بھی چیخ چیخ کر شراب کو دنیا کی مصیبت اور سوسائٹی
کی لعنت کہہ رہے ہیں۔

شرابی کا ٹھکانہ ہے نہ گوروں میں نہ کالوں میں
نہ جانے پائے مسجد میں، نہ گرجوں اور شوالوں میں
پھرا کرتا ہے پاگل کی طرح داعی خیالوں میں
کبھی گرتا ہے سڑکوں پر، کبھی سڑتا ہے نالوں میں
بھلا غیروں کا کیا شکوہ اگر توہین کرتے ہیں
کہ اُس کے باپ بھائی تک اسے نفرین کرتے ہیں

عائم : (طارق سے) بڑی دون کی لے رہا ہے۔ آج اسے شراب سے ضرور پتہ دینا چاہیے۔

طارق : اس کی ترکیب؟

عائم : نارنگی کے عرق میں دہسکی ملا کر شربت کے نام سے پلا دو۔

طارق : زعمہ باش، اچھی بھائی۔ (عارف سے) جناب رندوں کی محفل میں گلاس تو ہاتھ میں لینا ہی ہوگا۔ شراب نہیں تو شربت ہی سے شوق کیجیے۔

عارف : آپ ہر شخص کے ہاتھ میں ایک گلاس دیکنا چاہتے ہیں۔ خواہ شراب کا ہو خواہ شربت کا۔ بہتر ہے۔ لائیے۔

(عائم چپکے سے نارنگی کے عرق میں دہسکی ملا کر طارق کو دیتا ہے اور طارق عارف کو دیتا ہے)

طارق : شوق کیجیے۔ مگر دیکھیے۔ شرابیوں کے قانون کے مطابق، پورا گلاس ایک سانس میں ختم ہونا چاہیے۔ (زیاد سے) خداوند آپ بھی گلاس کی پری کو اپنے ہونٹوں کا بوسہ لینے دیجیے۔

(عارف شربت کے دھوکے میں سب کے ساتھ گلاس پی کر خالی کر دیتا ہے)

عائم : (سائڈ میں) وہ بارود میں چنگاری پڑی۔ بس قلعہ فتح۔ اب اس کے پیسے ہیں اور میرے مزے۔

عارف : عجیب طرح کا مزہ تھا۔ یہ کیا۔ سینے میں گرمی کیوں معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے مجھے کیا پلا دیا؟

عائم : پینے کے بعد دوا کا نام پوچھنے سے فائدہ۔ اور پوچھنا ہی ہے تو آنکھوں میں سرور آنے کے بعد پوچھیے گا۔

عارف : تو کیا یہ شراب تھی؟

عائم : اور آپ کیا سمجھ کر نارنگی کا شربت تھا۔

عارف : اُف۔ غضب کیا۔ تم نے میری گرتی کے سکھ کا خاتمہ کر دیا۔ آرام اور آبدو کا

ترکی حور

گلا گھونٹ دیا۔ جانی اور برہادی کے لیے میرے مکان کا دروازہ کھول دیا۔
تم نے شراب پلا کر آج میرے آرام و خوشی کے اہار میں چھوٹی سی چنگاری
ڈال دی ہے۔ جو آج چنگاری ہے، کل انگارہ ہوگی، برسوں شعلہ بنے گی۔
اور ترسوں دکھ دکھ کرتی ہوئی آگ کی شکل اختیار کر لے گی۔ اور اس
آگ میں میرا سب کچھ جل جائے گا۔ خوشی بھی، عزت بھی، زندگی بھی۔

عائش : بھائی جان، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ پرانی زندگی کا بانٹ کر کے آج سے نئی
زندگی شروع کیجیے (طارق سے) یا رنہ کیا دیکھتے ہو۔ اٹلیو نہ اتنے برسوں
کی پیاس کیا ایک ہی گلاس میں بجھ جائے گی۔

عارف : بس اور نہیں۔

زیاد : توبہ ٹوٹنے کے بعد بھی انگار۔

عارف : مجھے نشہ ہو چلا۔

زیاد : تھوڑی۔ وہ بھی میری خاطر سے۔ (ناچنے والیوں سے)

عائش ہے آج ایک زمانہ شراب کا
ہاں مل کے گاؤ کوئی ترانہ شراب کا

(گانا شروع ہوتا ہے۔ زیاد پاشا کے اشارے سے ناچنے والیاں
عارف کو جھرمٹ میں لے کر شراب پلاتی ہیں۔)

پہلا ایکٹ - تیسرا سین

رشیدہ کے باپ کا مکان

(رشیدہ پریشان اور اُداس صورت کے ساتھ سر جھکائے ہوئے آتی ہے)

رشیدہ : تمام شب کا جاگا ہوا چاند ستاروں کی روشنی گل کر کے سو گیا۔ رات کی سیاہ چادر میرے آنسوؤں سے دھل کر سفید ہو گئی۔ روشن دن مشرق کی کھڑکی کھول کر جھانکنے لگا۔ لیکن وہ جن کا انتظار کرتے کرتے ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی، ابھی تک نہ آئے۔

دیکھیے کب دیکھتے ہیں مڑ کے وہ گھر کی طرف
کان آہٹ پر لگے ہیں اور نظر در کی طرف

(بوڑھا ایاز آتا ہے)

ایاز : بیٹی رشیدہ۔ انتظار میں شام سے صبح ہو گئی۔ جاؤ ذرا آرام کر لو۔ کب تک جاگو گی اور کب تک بھرائی ہوئی آنکھوں سے دروازے کی طرف ٹھٹکی لگائے رہو گی۔

رشیدہ : جب ایک وفادار کتا بھی، گھر سے باہر گئے ہوئے مالک کے واپس آنے تک، اس کے انتظار میں دروازے پر بیٹھا رہتا ہے تو میں ان کی بیوی اور لوطی ہو کر کس طرح اپنے آرام کی پروا کر سکتی ہوں۔ آہ ایاز۔ مجھے دو دن سے ڈراونے خواب اور بدشگونیاں نظر آ رہی ہیں۔ گھر، دولت، سکھ، سب کچھ تباہ ہو چکا۔ کوہو اب اور کون سی تباہی ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے والی ہے۔

آساں کی گردشیں ہیں کس نئی تدبیر میں
اور کیا لکھا ہے اس پھوٹی ہوئی تقدیر میں

ایاز : کل شام کو گھر سے کس کے ساتھ گئے تھے؟
رشیدہ : غانم کے ساتھ۔

ایاز : کیا کروں۔ غانم تمہارا دور کا رشتہ دار ہے۔ ورنہ میں اس بے اصول یار مار
آدی کو کبھی اس گھر کے دروازے کے اندر قدم نہ رکھنے دیتا۔
رشیدہ : لیکن وہ اسے رشتہ دار ہی نہیں، اپنا سب سے بڑا خیر خواہ دوست بھی سمجھتے
ہیں۔

ایاز : لیکن یہ دوست ہی ان کا سب سے بڑا دشمن ہوگا۔ وہ میری مانیں یا نہ
مانیں لیکن میں نے انہیں خبردار کر دیا ہے۔ کہ زہر اور آگ سے دوستی کرو،
سانپ اور بچھو سے دوستی کرو لیکن اس غانم سے دوستی نہ کرو۔ یہ دوستی کے
غلاف میں چھپی ہوئی تلوار ہے۔ آج جھک کر ملے گا اور کل گلا کاٹ کر الگ
ہو جائے گا۔

(رشیدہ کا بوڑھا باپ فرید بیک غصے میں آتا ہے)

فرید : بس آج سب ختم ہو گیا۔ قسمت پر بربادی کی مہر لگ گئی۔ امید کی آخری
کرن بھی تاریکی میں ڈوب گئی۔

رشیدہ : بابا جان.....

فرید : رشیدہ۔ خدا نے تجھے خوبصورتی دی، نیکی دی، لیاقت دی، محبت دی، شوہر
پرستی دی لیکن افسوس اچھی قسمت نہ دی۔ معلوم نہیں کس قصور پر ناراض ہو کر
زندگی کے سکھوں نے تیری طرف سے منہ پھیر لیا۔

ایاز : خیر تو ہے؟

رشیدہ : پیارے بابا کیا ہوا؟

فرید : کیا کہوں۔ ڈر ہے کہ تو سنتے ہی پاگل ہو جائے گی۔ میں دیوان خانے کی
کھڑکی سے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی رئیس کی شاندار

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

گھاڑی، جس میں سرنگ جوڑی بجی ہوئی تھی، دروازے پر آکر ٹھہری۔ پٹ
کھلا اور اندر سے پاندان پر پاؤں رکھ کر پہلے غانم اُترا اور پھر اس نے
ہاتھ پکڑ کر عارف کو اُتارا۔

رشیدہ : تو وہ آگئے؟

فرید : ہاں۔ دروازہ کھلنے پر غانم کچھ کہہ کر سڑک کی طرف مڑا اور عارف کے بار
بار بلانے پر بھی ہاتھ سے نہیں ٹھیک کا اشارہ کرتا ہوا چلا گیا۔

ایاز : اور عارف؟

فرید : وہ دروازے سے پیٹھ لگائے ہوئے ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔ مگر جانتے ہو
کس حالت میں؟ عقل سے خارج۔ ٹانگوں پر کھڑے ہونے سے مجبور۔
شراب کے نشے میں بالکل چور۔

رشیدہ : کیا نشے میں؟

ایاز : شراب پی لی۔

رشیدہ : آہ میں برباد ہوگئی۔

(صدگے سے صوفے پر گر پڑتی ہے)

فرید : جس گھر میں شراب آئی۔ وہاں بربادی ضرور آئے گی۔

ایاز : بد ذات غانم۔ یہ تیری دوستی کے درخت کا پہلا کڑوا پھل ہے (رشیدہ سے)
اشو میری بچی اشو۔ قسمت کا فیصلہ سب کو منظور کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی
کسی عدالت میں اس کے حکم کی اپیل نہیں ہو سکتی۔

رشیدہ : گبڑا ہوا گھر بن چلا تھا۔ آج بننا ہوا گھر پھر گبڑ گیا۔

جو میرا ناخدا تھا خود بہا جاتا ہے دھارے پر
الہی کس طرح پہنچے گی اب کشتی کنارے پر

(لڑکھاتا ہوا عارف آتا ہے)

عارف : غانم بھی کیسا ڈرپوک ہے۔ گھر والوں کی ناراضی کے خوف سے دروازے ہی

پر سے لوٹ گیا۔

فرید : افسوس۔ ان آنکھوں کو یہ بھی دیکھنا تھا۔

عارف : کوئی چیز صاف نہیں دکھائی دیتی۔ دماغ گھوم رہا ہے یا زمیں کے ساتھ گھر گھوم رہا ہے۔

رشیدہ : (قریب جا کر) شام کو گئے اور صبح کو لوٹے۔ (منہ پھیر کر) اُف کیسی بدبو۔

انسان عقل رکھ کر ایسی گندی اور غلیظ چیز کیوں پیتا ہے۔ (عارف سے) کہاں تھے؟

عارف : کیا کہا؟

رشیدہ : کہاں تھے؟

عارف : نہ میں مجرم نہ تم جج اور نہ یہ گھر عدالت کا اجلاس۔ پھر کس حق سے یہ سوال کرتی ہو؟

ایاز : اُسی حق سے، جو محبت کے رشتے اور شادی کے قانون کی رو سے بیوی کو حاصل ہے۔

عارف : یعنی؟

ایاز : بیوی شوہر کا نصف۔ اُس کے قسمت کی شریک، اس کے دکھ سکھ کی ساتھی، اس کے گھر کے امن و امان کی نگہبان اور اس کے برائی بھلائی کی ذمہ دار ہے۔ جو شوہر کے واپس آنے تک تمام گھر کے سوا جانے پر بھی بھوک پیاس انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔ جو شوہر کے چہرے پر ذرا سی اداسی دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے۔ جو شوہر کے دکھ اور بیماری میں لوظی کی طرح خدمت کرتی ہے اور پروانے کی طرح پتک کے گرد پھرتی رہتی ہے۔ کیا اُس بیوی کو ”کہاں تھے“ اتنا بھی پوچھنے کا حق نہیں ہے۔

عارف : کیا کہہ گئے۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔

رشیدہ : نہ حواس قابو میں نہ پاؤں قابو میں (عارف سے) سنہلے۔ گر پڑو گے۔

فرید : عارف مجھے امید تھی کہ دنیا میں ٹھوکر کھانے کے بعد اب تم دیکھ کر اور سنبل کر چلو گے۔ مگر آج مظلوم ہوا کہ بربادی ہی تمہارا آخری راستہ اور آخری

انجام ہے۔

گھر میں آئے لڑکھڑاتے ٹھوکریں کھاتے ہوئے
شرم بھی تم کو نہ آئی سامنے آتے ہوئے
کیا رہا، ہنستا ہے تم پر بے نوا، محتاج بھی
عقل، دولت کھو چکے تھے آج کھو دی لاج بھی

عارف : بے شک میں نے دولت بھی پھونکی اور شراب بھی پی۔ لیکن نہ دولت آپ کی
تھی اور نہ شراب آپ کی۔ بزرگ سمجھ کر معاف کرتا ہوں۔ آئندہ ایسے سخت
لفظ نہ کیجیے گا۔

فرید : تب کیا کہوں۔ کن لفظوں میں اس نالائقی اور بد چلتی پر ملامت کروں۔
بدبخت آدمی، تو نے صرف اپنی ہی نہیں، اپنے ساتھ اس غریب کی مٹی بھی
برباد کر دی۔ اگر میں جانتا کہ تو ایک دن دولت، عزت، شرم، سب سے
مفلس ہو جائے گا تو کبھی اس کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں نہ دیتا۔

عارف : اگر ایسا داماد چاہیے تھا جو کبھی مفلس نہ ہو تو مجھ سے شادی کرنے کے بدلے
ایک سونے کا پتلا بنا کر اس کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دی ہوتی۔

فرید : دیکھو ایاز دیکھو۔ یہ ہے شراب پینے کا پہلا نتیجہ۔ پینے کے ساتھ ہی آدمی کے
منہ سے گندی باتوں اور گالیوں کا پر نالہ بننے لگ جاتا ہے۔

ایاز : (عارف سے) ہوش کیجیے۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

عارف : ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے اپنی خوشی سے داماد پسند کیا ہے۔ میں
ان کے دعوازے پر شادی کی بھیک مانگتے نہیں آیا تھا۔

فرید : (ایاز سے) سن لیا۔ اور منع کرو گے۔ شرابی تھوڑی پینے پر احق، زیادہ پینے پر
جانور اور حد سے زیادہ پینے پر پاگل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس وقت نشے میں
پاگل ہو رہا ہے۔

عارف : میں رشتے اور بزرگی کا خیال کر رہا ہوں۔ اپنی عزت کی حفاظت کیجیے اور
چلے جائیے۔

ترکی حور

فرید : چلے ہی جانا ہوگا۔ کیونکہ یہ حالت نہ دیکھ سکتا ہوں نہ برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر جانے کے بیشتر تجھ کو ہوشیار کرتا ہوں کہ زندگی کے درخت کی جڑ میں شراب کا زہر نہ ٹپکا۔ ورنہ اس سے صرف تکلیف کے کاغذ اور بربادی و موت کے پھل پیدا ہوں گے۔ اور تجھے ان کانٹوں کو اپنے دل میں جگہ دینا اور ان پھلوں کو چمکنا ہوگا۔

اسے پہچان آفت اک نئی صورت میں آئی ہے
نہ ڈال اس آگ میں ایندھن جو قسمت نے جلائی ہے
گلاسوں میں جو ڈوبے پھر نہ ابھرے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے ان بوتلوں کے بند پانی میں

(جاتا ہے)

رشیدہ : (ایاز سے) پاؤں قبضے میں نہیں۔ انھیں سہارا دے کر کمرے میں لے چلو۔
ایاز : خدا تمہاری مصیبت پر رحم کرے۔ اور انھیں نیک ہدایت دے۔ (عارف سے) اٹھیے۔
عارف : ہٹ جاؤ۔ مجھے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ (تموڑا بڑھ کر) کدھر ہے راستہ؟ وہ رہا۔

(عارف دو قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ اور
رشیدہ اور ایاز اسے سنبھالنے کے لیے دوڑتے ہیں)

ایاز : حضور۔ حضور۔

رشیدہ : ہائے قسمت۔

ایاز : بروٹی ہو روؤ۔ شراب کی بھلت اپنے شوہر اور گھر کی بربادی دیکھ کر آج اس بدقسمت ملک میں ہزاروں شریف بھیاں اسی طرح آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہیں۔

کوئی چارہ نہیں آنکھوں سے بس ندیاں بہاتی ہیں
کلیجہ اور گھر جلا ہے آنسو سے بجھاتی ہیں

رشیدہ : شراب۔ شراب۔ ارے شیطان کی بیٹی۔ گناہوں کی ماں۔ بوجھ میں رہنے والی چڑیل۔ تو نے اس ملک کی کیا حالت کر دی۔ آج مسجد، گرجے، شوالے آدمیوں سے خالی اور ہوٹل اور شراب کی دکانیں آباد ہو رہی ہیں۔ دولت اور تمدنی دے کر موت خریدی جا رہی ہے۔ بیوقوف اور پاگل بننے کو زندگی کا حرہ سمجھا جا رہا ہے۔ جا۔ جا۔ جہاں سے پیپوں اور بوتلوں میں بند ہو کر ہزاروں بیمار یوں اور برائیوں کو ساتھ لیے ہوئے آئی ہے۔ وہیں واپس جا۔

بے کسوں اور بے بسوں کی التجا منظور کر
یا الٹی ملک سے تو اس بلا کو دور کر

پہلا ایکٹ - چوتھا سین

طوائف کا مکان

(ہمیں کی ماں نیسہ جھنجھلاتی ہوئی آتی ہے)

نیسہ : ہائے ہائے۔ یہ لوٹیا تو ان لچنوں سے تین پشت کی جی بھائی دوکان چوہٹ کر دے گی۔ رنڈیوں میں بد نصیب کون؟ جس کے گھر لڑکا پیدا ہو۔ اور خوش نصیب کون؟ جس کے گھر لڑکی پیدا ہو۔ لڑکا بڑا ہونے پر، یا جوتے مار مار کر ماں بہن سے روپے چھینے گا یا تماشہ بینوں کی چلیں بھرے گا۔ یا بہن کے ساتھ سارنگی بجائے گا۔ اور لڑکی تو جوان ہو کر سونے کا ڈلا بن جاتی ہے۔ جس سیٹھ ساہوکار کے پاس چاہو، بیچ کر روپے کھڑے کر لو۔ لیکن میری کوکھ سے گھر بناؤ کے بدلے گھر اجاڑ پیدا ہوئی ہے۔ دس کی جیسیں کاٹتی ہے اور ایک کی جیب بھرتی ہے۔ اسے ناز برداری، روپیہ، خوشامد کچھ نہیں چاہیے۔ بس دنیا میں دو چیزیں چاہئیں۔ ایک وہ مفت خور غانم اور دوسرے دسکی کا گلاس۔ ارے جنم جلع غانم تیرا ستیاناس۔

(ہمیں آتی ہے)

ہمیں : کیا لقس ہے۔ چیز رکھو اور غائب (ماں سے) اماں۔ سنگار میز پر لالی اور پاؤڈر کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ کیا ہوا؟
نیسہ : میں اٹھالے گئی تھی۔ میرے کمرے میں آئینے کے پاس رکھا ہوا ہے۔
ہمیں : جوانی ڈھلی۔ جھریاں پڑیں۔ سائیکل سے چرغا بن گئیں۔ لیکن ابھی تک لالی

اور پاؤڑ کا شوق نہیں گیا۔ دنیا کو دھوکا دے چکیں، اب بڑھاپے کو دھوکا دے رہی ہو۔

نسبہ : نزلے سے دو چار بال چاندی کے تار بن گئے تو کیا میں بڑھیا بن گئی۔ اب بھی جب کسی دن بن سنور کر کھڑکی سے چلن اٹھا کے سڑک کی طرف جھانکتی ہوں تو رستہ چلتوں کے منہ سے نکل جاتا ہے۔ ہائے مار ڈالا۔

ہشیم : وہ کوئی اندھے ہوں گے جنہیں پاؤڑ کے پیچھے بڑھاپے کی جھریاں دکھائی نہیں دیتیں۔ میں تو جب تمہیں کھڑکی میں دیکھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ پنجرے میں پرکٹی چیل بیٹھی ہے۔

نسبہ : تو گورے رنگ اور رسی آنکھوں کے سوا بقیہ میں اور کون سے لعل جڑے ہیں۔ ہاں اتنا ہے کہ جوان ہو۔ لیکن جوانی میں تو گدھی بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔

ہشیم : اچھا بُرا نہ مانو۔ آج تک تمہیں لوگ بڑھیا سمجھ کر میری ماں اور مجھے جوان سمجھ کر تمہاری بیٹی کہتے تھے۔ لیکن اب کوئی پوچھے گا تو میں کہہ دوں گی کہ یہ میری بیٹی ہیں اور میں ان کی ماں ہوں۔

نسبہ : منہ پھٹ۔ ماں سے بھی دگی کرتی ہے۔ خیر یہ تو بول۔ یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ رڈی کا گھر فقیر کی جھولی ہے۔ جب مانگے گی نہیں اور لوگ دیں گے نہیں تو گھر بھرے گا کیسے؟

ہشیم : تو کیا لوگوں کا گلا گھونٹ کر لوٹ لیا کروں؟
نسبہ : جب لوگ خوشی سے دینے کو تیار ہیں تو لوٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن تیری نظر میں تو بس غام غام کا کھڑا ہے۔ اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔

ہشیم : کیا خاک دیکھوں۔ دیکھنے لائق صورت بھی تو ہو۔ ایک موا وہ بڑھا جوہری آتا ہے۔ ہماژو جیسی بھنویں۔ چیاں جیسی آنکھیں۔ کوزی کے بدن جیسی چٹکبری داڑھی۔ پاس بٹھاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاضی کی بغل میں جنگی چوہا بیٹھا ہوا ہے۔ دوسرا شیئر مارکیٹ کا دلال، ہر وقت پیسے کی طرح

ترکی حور

پیٹ سے منہ تک شراب سے بھرا رہتا ہے اور اس پر بیگن جیسی ناک ہے۔
اس طرح پھوں پھوں سانس لیتا ہے گویا پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا انجن سیٹی
دے رہا ہے۔ تیسرے یہ....

نسیم : بس میں عاشقوں کی فہرست سننا نہیں چاہتی۔ ارے پاگل شکاری بندوق
چلانے کے وقت یہ تھوڑی دیکھتا ہے کہ شکار خوبصورت ہے یا بدصورت۔
ہمیں شکل نہیں دولت چاہیے۔ وہ خوبصورت نہ سہی ان کا روپیہ تو خوبصورت
ہے۔

ہشیم : چپ چپ۔ وہ موا ناظم آ رہا ہے۔ میں نے سونے کے ہار کی فرمائش کی
تھی۔ لایا ہے تو اوپری دل سے دوچار پچارے کے ہاتھ پھیر دوں گی اور
خالی ہاتھ آیا ہے تو سر کے درد کا بہانہ کر کے میہیں سے چٹا کر دوں گی۔
نسیم : مگر دیکھو۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔ ایسا نہ کرنا کہ ہمیشہ کے لیے
یہ ڈربہ ہی بھول جائے۔

(ناظم داخل ہوتا ہے)

ناظم : (ہشیم سے) سرکار بندگی (نسیم سے) اماں جان تسلیم۔
نسیم : جیتے رہو بیٹا۔ ابھی تمہیں ہشیم یاد ہی کر رہی تھی کہ تم آ گئے۔ بہت دن
جیو گے۔

ناظم : یہ تو ان کی مہربانی پر موقوف ہے۔ چاہے ماریں۔ چاہے جلائیں۔
نسیم : (ہشیم سے) لو جن کے لیے تڑپ رہی تھیں، اب ان سے جی بھر کے باتیں
کرو۔ (ناظم سے) بیٹا میں جاتی ہوں۔ جہاں بیٹی داماد ہوں۔ وہاں ساس کو
نہ رہنا چاہیے۔

ناظم : (سانڈ میں) خدا تیری جیسی ساسوں کا ستیاناس کرے۔ نہ جانے حرام زادی
ساس بن کر کتنے دامادوں کا گلا کاٹ چکی ہوگی۔
نسیم : اچھا لال میں چلی۔

(نسیم جاتی ہے)

ناظم : (سانڈ میں) جہنم کے حوالے۔ (شیم سے) مائی لارڈ اینڈ جیوری، اُدھر کہاں دیکھ رہی ہیں اس گنہ گار کی طرف دیکھیے۔

شیم : کیا دیکھوں۔ دیکھ تو لیا۔ ایک آدمی آیا ہے۔ دم لگی ہوئی تو سمجھتی کہ جانور آیا ہے۔

ناظم : آپ کے دربار سے چاہنے والوں کو جانور کا خطاب ملتا ہے تو مجھے نہیں چاہیے۔ اس عزت کے بدلے کو کسی اور بیوقوف کے سینے پر دیوانی کچھری کے سنن کی طرح چپکا دیجیے۔

شیم : تو آپ کو کس خطاب سے پکاروں؟

ناظم : بیوی، ہوتیں تو میاں کہتیں۔ بہن ہوتی تو بھائی کہتیں۔ صرف پیاری ہو اس لیے پیارے کہہ کر پکارو۔

شیم : رنڈی کا پیارا بننے کے لیے لاکھوں خرچ کرنے پڑتے ہیں اور آج کل کے پیارے بننے والوں کی یہ حالت ہے کہ جان دیں گے، دل دیں گے، کلیجہ دیں گے، بچھڑا دیں گے مگر نکال نہ دیں گے۔ تم اپنے ہی کو دیکھو۔ میرا پیار چاہتے ہو مگر میری فرمائش دینا نہیں چاہتے۔ گدھے کی سینگ کی طرح فرمائش دیتے وقت غائب۔ اور تار لانے والے ڈاکیے کی طرح سلام بی بی صاحب کہہ کر انعام مانگنے کو موجود۔

ناظم : گبڑیے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جیسے نیکیاں ساتھ لیے بغیر جنت میں نہیں جا سکتے ویسے ہی جب تک جیب میں روپیہ اور بغل میں فرمائش نہ ہو رنڈی کے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ یہ لیجیے آپ کی فرمائش۔

(شیم کو ہار دیتا ہے)

شیم : واہ جیسا چاہتی تھی دیا ہی ہے۔ اب تم مجھے پیارے معلوم ہوتے ہو۔

ناظم : (سانڈ میں) کیا جانوں۔ میں پیارا معلوم ہوتا ہوں کہ میرا روپیہ پیارا معلوم ہوتا ہے۔

شیم : بڑا ہی خوبصورت ہے۔ کس ستار سے بنوایا ہے؟

ترکی حور

ناظم : ستار سے بنوانے میں آٹھ دن صرف ہوتے اور تم نے تو مجھے کل دو دن کی مہلت دی۔

شمیم : پھر؟

ناظم : یہ ہار میری بیوی کا ہے۔ میں نے دوسرا بنوا دینے کے وعدے پر پہلے منہ سے مانگا اور جب وہ رکی تو ہاتھ جھٹک کر زبردستی گلے سے اتار لیا۔

شمیم : اس طرح چھیننے سے تو بیوی رونے لگی ہوگی؟

ناظم : اور بیوی کے رونے کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ ہم تو تمہیں ہنتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔

شمیم : (سانڈ میں) اف کتنی بے وفائی۔ میں گھر کی بیوی ہوتی تو ایسے شوہر کو چوراہے پر گولی مار دیتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مرد خود اتنے بے وفا ہیں وہ رنڈی کو کس منہ سے دغا باز کہتے ہیں۔

ناظم : اب ذرا صراحی دار گردن میں پہن کر ان آنکھوں کو تو خوش کرو۔ (گلے میں ہار پہناتا ہے)

شمیم : کیا کہوں۔ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ بس ہوتا تو دل کے اندر رکھ لیتی۔

ناظم : برا نہ ماننا۔ اس دل میں تو ہزاروں کپٹ اور پاپ پاؤں پھیلانے سورہے ہیں۔ مجھے جگہ کہاں ملے گی۔

شمیم : پیارے۔ تم نے میری گردن میں سونے کا ہار پہنایا ہے۔ میں تمہارے گلے میں اپنی گوری گوری کلائیوں کا ہار پہناتی ہوں۔

(گلے میں ہاتھیں ڈال دیتی ہے)

(گاتا)

شمیم : بانگے رسیا۔ من بسیا۔ سوئی من موئی توری صورتیا۔

ناظم : پھولوں سے گالوں پہ کیا لالیاں۔ رس والیاں ہیں توری بتیاں۔

شمیم : سوتن سے تاہیں نیناں لگاتا۔ پریت کی ریت نبھاتا۔ جن موسے۔

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

ہاتم : ہیں لعل جڑے جوین میں۔
ہیم : یہ روپ رے نھن میں۔ الیلے چھپ کھیلے من میں۔
ہاتم : نیاری شان۔ پیاری آن۔ مری جان۔ میں قربان
ہاتے رسیا.....

پہلا ایکٹ - پانچواں سین

فرید بیگ کا مکان

(رشیدہ کشیدہ کاری کرتے ہوئے ایاز سے باتیں کر رہی ہے)

رشیدہ : پاؤں تمام کرختیں کیں۔ رو رو کر قسمیں دیں۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے لفتوں میں بھیا تک انجام کی تصویر کھینچی۔ اب کیا کروں؟

ایاز : آٹھ دن سے بڑے حضور نے بھی سمجھنا اور بولنا چھوڑ دیا۔ کبھی سامنا ہوا بھی تو ٹھنڈی سانس لے کر ہاتھ ملتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

رشیدہ : بیکار دماغ، ڈمگاتے پاؤں، بدبودار منہ کے ساتھ نصف انسان اور نصف حیوان کی حالت میں بارہ بارہ بجے رات کو گھر آتا۔ نوکروں کو گالیاں دیتا۔ بیوی کے سامنے اول فول بکتا۔ جوتے کپڑوں کے ساتھ پلنگ پر گر کے بیمار کی طرح کراہ کراہ کے سانس لینا، ایک مہینے سے روز بھی نظارہ دیکھتی ہوں، کڑھتی ہوں اور روتی ہوں۔

ایاز : افسوس، دنیا میں جب دن کا آدھا کاروبار ختم ہو چکا ہے، تب بڑی مشکلوں سے کئی مرتبہ آنکھیں کھولنے اور بند کر لینے، سر اٹھانے اور نیچے پر گرا دینے کے بعد جاگتے ہیں۔ اور اس وقت ان کے اترے ہوئے چہرے پر مردنی، ہونٹوں پر پھڑی، ہاتھ پاؤں میں انٹھن، لال انگارہ بنی ہوئی آنکھوں کے نیچے سیاہی کی موٹی لکیر دکھائی دیتی ہے۔ گھڑی گھڑی پانی پیتے اور بار بار درد کی تکلیف سے پیشانی پر گھونے مارتے ہیں..... اور طبیعت میں سکون آنے کے بعد.....

رشیدہ : اور اس کے بعد رات کی حرکتوں پر شرمندہ ہوتے، افسوس کرتے، نوکروں سے معافیاں مانگتے اور شراب پینے پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن شام ہوتے ہی پھر اپنی توبہ اور عقل کو شراب کے گلاس میں غرق کر دیتے ہیں۔

ایاز : * قسمت رحم کر۔

(دونوں اندر جاتے ہیں۔ باہر سے شراب پیے ہوئے عارف و غانم آتے ہیں)

عارف : کس نے؟ کس نے کہا؟ ایاز نے؟

غانم : جی ہاں۔ جو پرانا ملازم ہونے کے حق سے ڈگری دار کی طرح آپ کے گھر پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ اسی ایاز نے۔

عارف : گھونسا دکھا کر تمہیں دھمکی دی؟

غانم : کل جب آپ گاڑی میں بیٹھ گئے اور میں اور کوٹ لینے کے لیے دوبارہ گھر میں آیا، تب اس نے اور کوٹ میرے کندھے پر بھینکنے کے بعد زور سے میری کلائی پکڑی۔ اور ڈھائی سیر کا گھونسا ناک کے سامنے کر کے کہنے لگا کہ جی چاہتا ہے کہ ایک ہی گھونے میں تیری ناک پچکا دوں۔

عارف : پھر؟

غانم : پھر جیسے گھوڑا لگام چباتا ہے، ویسے ہی دانت پیس کر بولا کہ اے پاجی اس گھر میں آنا چھوڑ دے۔ ورنہ میں کسی دن لاٹھی مار کر تیری دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔

عارف : تب تم نے کیا کہا؟

غانم : میں نے کہا کہ ٹانگیں توڑنے سے پہلے ایک سائیکل دلادیتا۔ ورنہ میں اسپتال سے تمہارا شکریہ ادا کرنے کیسے آؤں گا؟

عارف : میں بے شک اس کی باپ کے برابر عزت کرتا ہوں لیکن اس عزت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ آقا کا آقا بن کر اس کے دوستوں کی بے عزتی کرے۔

غانم : جس گھر میں خود آپ کی عزت نہیں، اُس گھر میں آپ کے دوستوں کی کیا

ترکی حور

عزت ہو سکتی ہے۔ سر کو غزا ہے کہ میں داماد کو روٹیاں دیتا ہوں۔ بیوی کو گھمنڈ ہے کہ میاں میرے باپ کے دروازے پر ہل رہے ہیں۔ گھر کے نوکروں کا خیال ہے کہ ہمارے مالک کی خیرات سے ایک فقیر پرورش پا رہا ہے۔ آپ تو سیدھے اور بھولے آدمی ہیں۔ لوگوں کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ مگر چہرے کی کھال سے جھانکتی ہوئی حقارت کو نہیں دیکھ سکتے۔

عارف : میں بیوی کے سمجھانے اور مجبور کرنے سے سرال میں رہنے آیا ہوں۔ حقارت کا برتاؤ دیکھتا تو ایک دن بھی یہاں نہ ٹھہرتا۔ سب کچھ کھو دینے پر بھی میرے رہنے کے لیے ابھی ایک باغ اور دو عالی شان مکان موجود ہیں۔

غانم : (سانڈ میں) اسی باغ اور مکان کو بکوا کر ہاتھ رکتے کے لیے تو یہ جاں نثار دوست تجھے سر سے لڑوانا چاہتا ہے۔ (جیب سے چھوٹا سا گلاس اور دہسکی کا ادھا ٹکالتا ہے) گلا سوکھ گیا ہوگا، ذرا تر کر لیجیے۔

عارف : گھر والوں کے خوف سے میں نے دن کو کبھی نہیں پی۔ تم نے آج سے دن کا پینا بھی شروع کرا دیا۔

غانم : پیجیے، دن کا پینا گناہ میں شمار نہیں ہوتا۔

عارف : کیوں؟

غانم : جس طرح پولیس کے سپاہی رات بھر پہرہ دیتے اور صبح کو وردی پٹنی کھول کر خرائے لیتے ہیں، ویسے ہی شرابیوں کا گناہ لکھنے والے فرشتے بھی رات بھر شراب کی دکانوں اور ہوٹلوں میں جاگتے اور دن کا کھاتا سر کے نیچے رکھ کر سو جاتے ہیں۔

(غانم گلاس میں شراب اٹھاتا ہے)

عارف : تھوڑی۔ ہم دو میں ایک بوتل تو ختم ہو چکی۔ (پینا ہے)

غانم : آپ جانتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ آپ کا کوئی خیر خواہ دوست نہیں ہے۔ اگر کوئی قائدے کی نیک رائے دوں تو مانجے گا؟

عارف : تم میری عقل کی ریل گاڑی کے انجن ہو۔ ہدمر کچھو گے ادھر ہی چلوں گا۔
 عانم : محتاج بن کر دوسرے کے ہاتھ کی طرف کب تک ٹکا کیجیے گا۔ کھوئی ہوئی
 دولت پیدا کرنے کے لیے اُس باغ اور مکان کو بیچ کر میری ترکیب اور
 صلاح کے موافق کسی مبارک دھندے میں روپے لگا دیجیے۔

عارف : رائے تو اچھی ہے۔ لیکن آفس جانا، آرڈر دیکھنا، کھانا سمجھنا، منیم سے لڑنا،
 گاہکوں سے مغربی کرنا، نفع نقصان کی فکر میں جان گھلاتا اور دن بھر تانوں
 کے پھیر میں رہ رات کو تھکے تیل کی طرح آدھے جاگتے، آدھے اٹھتے
 ہوئے گھر آتا، یہی تو دھندا ہے۔ اتنی محنت مجھ سے ہو سکے گی؟

عانم : ابی محنت کر کے پیدا کرنا مزدور کا کام ہے۔ میں تو آپ کو ایسا دھندا بتاتا
 ہوں کہ دس بجے بازار گئے۔ گیارہ بجے سودا کیا اور بارہ بجے دس پانچ ہزار
 جب میں ڈال کر گھر لوٹ آئے (پھر گلاس بھر کر دیتا ہے) دماغ کا تار
 ڈھیلا ہو گیا ہوگا، ذرا ہوا بھر لیجیے۔

عارف : دو گلاس پینے کے بعد ضرور گر جاؤں گا۔ (چتا ہے) اچھا کون سا دھندا سوچا
 ہے؟

عانم : میرے ایسا دوست کبھی آپ کو نقصان کا دھندا نہیں بتائے گا۔ گاہک جوت
 لاتا ہوں، باغ اور مکان بیچ کر جو روپے ملیں، ان سے سٹھ کیلینا شروع
 کیجیے۔

عارف : سٹھ ارے اس دھندے میں تو سینکڑوں کے ٹاٹ الٹ گئے۔
 عانم : کون بیوقوف کہتا ہے۔ میں ہزاروں کو جانتا ہوں جو ایک ہی دن میں سٹھ
 کی بدولت بھکاری سے کروڑ پتی بن گئے ہیں۔ سٹھ کھیت اور روپیہ بیچ ہے۔
 تھوڑے سے بیچ چھڑکیے اور سٹھ کے کھیت سے گاجر مولیٰ کی طرح مٹھی بھر
 بھر کر روپے توڑیے۔

عارف : سٹھ میں اتنا فائدہ ہے تو ہر مہینے انسا لونی کورٹ میں دوپار سٹھ کیلینے والوں
 کی طرف سے دیوالیہ کی درخواست کیوں گذرتی ہے؟

عانم : وہ دیوالیہ کی درخواست نہیں امیر بننے کا سرٹیفکیٹ ہے۔ جائداد بیوی بھائی کے

ترکی حور

نام لکھ کر اور جھوٹے کھاتے بنا کر دوسروں کے لاکھوں روپے مار لینا اور دیوالیے ہو چکنے کے بعد کسی اور کے نام سے پھر نیا دھندا شروع کر دینا، یہ آج کل کا فیشن ہو گیا ہے۔

عارف : تب میں ضرور ٹے کا دھندا کروں گا۔ میرے بیوپاری بننے کی خوشی میں ایک گلاس بھر۔

(غانم گلاس میں شراب ڈالتا ہے)

غانم : پیسے جیسے۔ یہ مڑے دنیا ہی میں ہیں۔ جنت میں یہ سب کچھ نہیں ملے گا۔ دسکی نہیں ملے گی۔

عارف : (پی کر) آہا۔ کیا دھندا بتایا۔ دس بجے بازار گئے۔ گیارہ بجے سودا کیا اور بارہ بجے دس پانچ ہزار جیب میں ڈال کر گھر آگئے۔ آہا ہا ہا۔ سٹ بھی امیر بنانے کی مشین ہے۔

غانم : ایسی اچھی صلاح میرے سوا آپ کا نوکر، بیوی، سر کوئی نہیں دے سکتا۔ عارف : جہنم میں گئے وہ سب۔ مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں۔ میرا دوست ہے تو تو ہے۔ نوکر ہے تو تو ہے۔ سر ہے تو تو ہے۔ بیوی ہے تو تو ہے۔

غانم : اچھا تو اس مونچھوں والی بیوی کے ہاتھ سے ایک محبت کا جام اور چڑھا لیجیے۔

(گلاس میں شراب ڈالتا ہے کہ ایاز داخل ہوتا ہے)

ایاز : یہ کیا؟..... دن کو..... اور وہ بھی گھر میں۔ (غانم سے) خبردار گلاس نہ دیتا۔

غانم : کیوں۔ کیا اس گلاس میں زہر بھرا ہوا ہے؟

ایاز : ہاں۔ یہ زہر ہی ہے۔ اور ایسا زہر جو پھن اٹھا کر ٹاپتے ہوئے سانپ کی

طرح پہلے تماشہ دکھایا کرتا، پھر ڈس کر بے ہوش کر دیتا ہے، اور آخر میں جان لے لیتا ہے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ اس ملک کے جج زہر کھلانے والوں کو کالے پانی اور پھانسی کی سزا دیتے ہیں، لیکن تم جیسے قاتلوں کو جو

بوتل کے زہر سے ہزاروں کی جان لے رہے ہو، ٹکلی سے باندھ کر دس بید لگانے کا بھی حکم نہیں دیتے۔

عارف : (عارف سے) دیکھ لیجیے۔ یہ میرا کتنا دشمن ہے۔ میں گھر میں آتا رہا تو ضرور کسی دن کوئی لوٹا یا دیگھی تھا کر پولیس کے حوالے کر دے گا۔

عارف : ایاز تم بہت گستاخ ہو گئے ہو۔ میں پیتا ہوں، میری خوشی، یہ پلاتا ہے، اس کی مہربانی۔

عارف : (بات کاٹ کر) تھینک یو

عارف : اس کو بُرا کہنے اور مجھے روکنے کی وجہ۔ یہ میرا دوست ہے، تم کون ہو؟

ایاز : جس ایاز کے سامنے پیدا ہوئے، جس ایاز کی گود میں پل کر بڑے ہوئے، جس ایاز کے ہاتھوں سے اس سر پر شادی کا سہرا بندھا، وہ ایاز تمہارا کوئی نہیں۔ اور یہ پیسوں کا یار، دسترخوان کی مکھی، سو پانچوں کا ایک پانچی، آج تمہارا دوست ہو گیا۔ زوف ہے تمہاری سمجھ پر۔

عارف : سن لیجیے۔ ابھی زوف کہا ہے، تھوڑی دیر میں گالیاں دے گا۔

عارف : ایاز چلے جاؤ۔ میں اس وقت نشے میں ہوں۔ زیادہ بولو گے تو اس بوڑھے منہ پر بوتل کھینچ کر مار دوں گا۔

ایاز : اس منہ پر بوتل نہیں جوتیاں مارو۔ اس منہ پر بوٹ کی ٹھوکر لگاؤ۔ اس منہ پر تھوک دو۔ لیکن یہ منہ جس نے چالیس برس تک تمہارے باپ کا نمک کھایا ہے، جو نصیحت کرے وہ سن لو۔ شراب تندرستی میں گھسن لگاتی ہے۔ امیروں سے بھیک منگواتی ہے۔ شریفوں سے جرم کراتی ہے۔ پڑھے لکھوں کو کتے کی طرح کچڑ میں لٹاتی ہے۔ بھائی بیٹے کے منہ سے ماں بہنوں کو گالیاں سنواتی ہے۔ شوہروں کے ظلم سے تنگ آئی بیبیوں کو بازار کی رنڈی بنا کر کوشوں پر بٹھاتی ہے۔ ایسی گندی اور خوفناک چیز کو مت چھوؤ۔ اس منہ پر تھوکنے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس بوتل پر بھی تھوک دو۔

عارف : بول چکے یا کچھ اور بولنا ہے؟ جتنی ضد دلاؤ گے اتنی ہی پیوں گا۔ (عارف سے) لا گلاس بھر کے۔ کنارے تک بھر کے۔

غانم : (گلاس دیتے ہوئے) غٹ سے اتار جائیے۔

(ایاز غانم کا ہاتھ پکڑ کر مروڑتا ہے)

ایاز : وہ رہا دروازہ۔ آج سے اس گھر میں قدم رکھے گا تو دسوں انگلیاں گردن میں دھنسا کر دم نکال دوں گا۔ (گردن میں ہاتھ دے کر) نکل جا حرام زادے۔

عارف : ہائیں۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے دوست پر حملہ۔ گھر کے پالتو کتے میں اتنی ہمت۔ بد معاش کہینے۔

(ایاز کو مارنے کے لیے کرسی اٹھاتا ہے۔ فرید بیگ اور رشیدہ کا داخلہ)

رشیدہ : یہ کیا۔ یہ کیا؟

فرید : یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔

غانم : (سانڈ میں) غانم اب کھک جا۔ اس نے گردن توڑی۔ یہ دونوں مل کر سر توڑ دیں گے۔

(جاتا ہے)

رشیدہ : (عارف سے) تمہیں کیا ہو گیا؟ تم چند ہی دنوں میں کتنے بدل گئے۔ یہ کیا ہے؟

ایاز : میری زندگی بھر کی خدمت کا مجھے انعام دے رہے ہیں۔

عارف : یہ اپنے کو بھول گیا ہے۔ میں اسے سکھانا چاہتا ہوں کہ یہ میرا مالک نہیں نوکر ہے۔

فرید : شرم کر۔ بوتل کے بندے۔ نشے کے غلام شرم کر۔ انسان کی صورت اور حیوان کی حرکتیں۔ آج تو نے اس وقادار فرشتے پر کرسی اٹھائی، کل بیوی کو لائیں مارے گا، پرسوں مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا۔

سمجھ انڈی، نظر بیکار، سر چکر میں رہتا ہے

بھائی کچھ نہیں دیتا نشہ جب سر میں رہتا ہے

نہ رنج اوروں کے صدمے کا، نہ شرم اپنی خرابی سے
ہر اک جرم اور بدی ممکن ہے پاگل اور شرابی سے

عارف : حد کے اندر رہو۔ غصے کی باتیں صرف تمہارا خریدا ہوا غلام سن سکتا ہے۔

پاگل میں نہیں، پاگل یہ بوڑھا ہے، پاگل تمہاری لڑکی ہے، پاگل تم ہو۔

فرید : بے شک میں پاگل ہوں۔ پاگل نہ ہوتا تو اتنی نالائقی پر تیرا بھلا کیوں

چاہتا۔ پاگل نہ ہوتا تو اپنے روپیوں سے تیرے قرض کیوں ادا کرتا۔ پاگل نہ

ہوتا تو برائیوں سے بچانے اور نیک راستہ دکھانے کے لیے اپنے گھر میں

لاکر کیوں رکھتا۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ انسان، وحشی رچھ اور خونخو بھیڑیے کے

ساتھ گذر کر سکتا ہے لیکن شرابی کے ساتھ ایک منٹ بھی بسر نہیں کر سکتا۔

عارف : تو کون ہاتھ جوڑتا ہے۔ ساتھ نہیں رہنا چاہتے، نہ رہو۔ میں دونوں پر لعنت

بھیجتا ہوں۔ اس گھر پر بھی اور گھر والوں پر بھی۔

فرید : پتھر کا دل بھی اس سے زیادہ صدمے کی چوٹ نہیں سہ سکتا۔ اچھا تو چلا جا۔

نکل جا۔ اسی وقت نکل جا۔ تیرا دنیا میں ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہے۔

میں سمجھوں گا کہ نالائقی عارف شراب پیتے پیتے مر گیا اور اس کی بدقسمت

بیوی جوانی میں بیوہ ہو گئی۔

رشیدہ : ابا۔ ابا۔ کس پر غصہ کر رہے ہیں۔ یہ آپے میں نہیں ہیں۔

ایاز : حضور اس کی نالائقی کی طرف نہیں۔ اپنی بزرگی کی طرف دیکھے۔

فرید : چپ رہو۔ اگر یہ آج میرے گھر سے نہ گیا تو میں گھر کو آگ لگا کر خود

کسی طرف چلا جاؤں گا۔ اسے میری، اس کی، تمہاری ضرورت نہیں۔ شراب کی،

شراب خانوں کی، شرابی دوستوں کی ضرورت ہے۔ (عارف سے) جاؤ! اور

تجائی تیرا انتظار کر رہی ہے۔

عارف : بس۔ اور ایک حرف نہیں۔ ایاز گاڑی۔ رشیدہ اپنے گھر چل۔

فرید : گھر چلیں۔ کیوں؟ رونے کے لئے، کڑھنے کے لئے۔ انجام میں فاقہ کرنے اور

بھیک مانگنے کے لئے۔ نہیں اب یہ باپ کے گھر کا سکھ چھوڑ کر تیرے دکھوں

میں حصہ لینے نہیں جائے گی۔

عارف : نہیں جائے گی؟

فرید : ہاں نہیں جائے گی۔ یہاں باندیاں ہیں، کپڑا ہے، زیور ہے، خوشی ہے، سکھ ہے۔ لیکن تیرے پاس نشہ، غریبی، اور دکھ کے سوا کیا رکھا ہے۔ رشیدہ۔ ایک طرف شوہر ہے اور ایک طرف باپ ہے۔ بول تو کس کا حکم سنے گی۔

سکھ سے رہتا ہے تو امید اور رشتے توڑ دے

جس طرح میں چھوڑتا ہوں تو بھی اس کو چھوڑ دے

رشیدہ : چھوڑ دوں۔ کیسے چھوڑ دوں؟ ابا جان۔ شادی کا رشتہ دو خود غرض آدمیوں کی شرکت میں شروع کیا ہوا بیوپار نہیں ہے کہ نفع ہو تو شریک رہیں اور نقصان ہو تو الگ ہو جائیں۔ جسے ماں باپ شادی کا دن کہتے ہیں، وہ لڑکی کی قربانی کا دن ہوتا ہے۔ جیسے ندی سمندر میں گر کر اپنی ہستی کو کھو دیتی ہے، ویسے ہی عورت بھی شادی کے دن اپنا دل، ہستی، سکھ، سب کچھ شوہر کو نذر کر کے ہمیشہ کے لئے اسی کی ہو جاتی ہے۔

جہاں تک دم میں دم ہے میں بھروں گی صرف دم ان کا

نہ جب تک ہاتھ کٹ جائیں نہ چھوڑوں گی قدم ان کا

کھلی، پھولی، پھلی اب تک انھیں کے چھاؤں کے نیچے

مری دنیا، مری جنت ہے ان کے پاؤں کے نیچے

فرید : یہ قبر کے کنارے آکھنچا ہوا بیمار۔ ڈوبتی ہوئی کشتی، مگرتی ہوئی جہت، جہاں ہوا مکان ہے۔ اس کا ساتھ نہ دے۔ یہ خود بھی تباہ ہوگا اور تجھے بھی تباہ کر دے گا۔

بند ہونے کے نہیں جاری جو یہ سوتے ہوئے

ختم ہوگی زندگی تقدیر کو روتے ہوئے

رشیدہ : وفادار بیوی سکھ کے لالچ سے شوہر کی محبت اور خدمت نہیں کرتی۔ شوہر اس کا مجازی خدا، شوہر کی محبت اس کا ایمان اور شوہر کی خدمت اس کی عبادت ہے۔

ہزاروں دوست بن جاتے ہیں آکر خوش نصیبی میں
مگر وہ دوست ہے جو ساتھ دے دکھ اور غریبی میں
وہی بیوی ہے جو دکھ درد میں دے ساتھ شوہر کا
ہنسی چھوڑے خوشی چھوڑے نہ چھوڑے ساتھ شوہر کا

فرید : تو کیا میرا حکم نہ سنے گی۔ شوہر کا سب حق ہے اور باپ کا کوئی حق نہیں؟
رشیدہ : شادی کے بعد لڑکی کو رخصت کرنے کے وقت جب ماں باپ یہ کہتے ہیں
کہ میری لڑکی تمہاری جنم کی لوٹھی اور تم اس کی زندگی اور قسمت کے مالک
ہو، اس دن وہ اپنے منہ سے اپنے سارے حق دوسرے کو دے دیتے ہیں۔
پھر بھی اس حکم کے سوا کہ ”دکھ میں شوہر کا ساتھ نہ دو“ میں آپ کا ہر حکم
ماننے کے لیے تیار ہوں۔

میرا سکھ ان میں ہے، ان کے گھر نہ ان کے مال میں
ہو امیری یا غریبی، شاد ہوں ہر حال میں
بے وفائی آ نہیں سکتی مرے نزدیک بھی
آپڑا اگر وقت تو مانگوں گی مل کر بھیک بھی

فرید : باپ کے منع کرنے پر بھی اس کی قسمت کے کڑے پیالے سے زہر کے
گھونٹ پینا چاہتی ہے۔ اس کے ہاتھ کے کھودے ہوئے کنویں میں اس کے
ساتھ گرنا چاہتی ہے۔ جس چھری سے یہ اپنی قسمت کو زخمی کر رہا ہے، وہی
چھری تو اپنے گلے پر ریتنا چاہتی ہے۔ تو جا۔ تو بھی جا۔ اسی وقت جا۔
دکھوں میں ڈوب مر خوش ہے اگر خود کو ڈوبنے میں
نہ مانے گا جو دل رولوں گا، جا کر ایک کونے میں
حضور جوش سے کام نہ لیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ انتہائی دکھ، انتہائی مایوسی یا
انتہائی غصے میں بدل جاتا ہے۔

غصے میں مگر شر ہے، کبھی خبر نہیں ہے
اولاد ہیں، دونوں میں کوئی غیر نہیں ہے

ترکی حور

عارف : شراب برف کو آگ، بے حس مرد اور مجھ کو شیر بنا دیتی ہے۔ لیکن میں اتنے نشے میں بھی ضبط کر کے در گذر کر رہا ہوں۔ اگر تم اسے نہیں بھیجتا چاہے تو میں بھی اسے نہیں لے جانا چاہتا۔

کیوں ذلیل و خوار ہو ساتھ اک ذلیل و خوار کے
تم نے بھیجا بھی تو لوٹا دوں گا ٹھوکر مار کے

فرید : سُن سُن۔ شوہر کے منہ سے اپنی قسمت کا فیصلہ سُن۔ بیوی شوہر کے لیے ساری دنیا کو چھوڑ دیتی ہے۔ بیوی شوہر کے دکھ کے وقت کھانا، سونا، پہننا، ہنسا بھول جاتی ہے۔ شوہر کا گھر روشن رکھنے کے لیے اپنے کو چراغ کی طرح دھیرے دھیرے جلا کر ختم کر دیتی ہے۔ لیکن بدچلن شوہر سے اسے کیا انعام ملتا ہے۔ یہی جو یہ تجھے دے گا۔ نفرت، گالی اور ٹھوکر۔

جیہیں گے رات دن نشتر جگر میں اس کی باتوں سے
ترے سب پیار کے قرضے چکائے گا یہ لاتوں سے

رشیدہ : جو بیوی شوہر سے سکھ چاہتی ہے، پیار چاہتی ہے، عزت چاہتی ہے، لیکن شوہر کا غصہ برداشت کرنا نہیں چاہتی، اسے بیوی نہیں بازار کی خود غرض عورت سمجھتا چاہیے۔ کیونکہ بیوی شوہر کا سکھ دیکھتی ہے اور بازاری عورت اپنا سکھ ڈھونڈتی ہے۔ بیوی سو رکھائیوں پر بھی جان چمکتی ہے۔ اور بازاری عورت ایک بے رخی پر برسوں کے دشمن کی طرح منہ پھیر لیتی ہے۔

یہ ماریں یا جلائیں، ساتھ ہوں اور ساتھ رہنا ہے
میں ان کے ہاتھ کے زخموں کو سمجھوں گی کہ کہنا ہے
نہ بھولی ہوں، نہ بھولوں گی، کبھی پہلے کرم ان کے
یہ لاتیں بھی جو ماریں گے تو چوموں گی قدم ان کے

فرید : رشیدہ۔ تو اس کے لیے میری محبت ہی نہیں، سب کچھ کھو رہی ہے۔ یاد رکھ میری لاکھوں کی دولت سے تجھے ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔

رشیدہ : ابا جان۔ مجھے دولت کا لالچ نہ دیجیے۔ شریف بیویاں شوہر کی محبت ہی کو

سب سے بڑی دولت سمجھتی ہیں۔ آپ کی دی ہوئی دولت کو چور چرا سکتا ہے اور ڈاکو لوٹ سکتا ہے۔ لیکن اس دولت کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

پھنس نہیں سکتی ہے دام زر میں ناداری مری
سلطنت بھی ہو تو ٹھکرا دے وفاداری مری

فرید : اگر میری دولت کی پروا نہیں ہے تو یہ میرا دیا ہوا موتیوں کا ہار اور طلائی چوڑیاں بھی اتار دے۔

رشیدہ : یہ ہار اور چوڑیاں شوہر کے پیار سے زیادہ قیمتی نہیں۔ عورت کے گلے کی خوبصورتی موتیوں کے ہار سے نہیں محبت کے طوق سے اور ہاتھ کی خوبصورتی سونے کی چوڑیوں سے نہیں، وفاداری کی زنجیر سے ہے۔ لیجیے۔ اٹھائیے۔

(رشیدہ ہار اور چوڑیاں اتار کر پھینک دیتی ہے)

امیری مال و زیور میں سمجھتا کم نکاحی ہے
جہاں مل کر رہیں دو دل وہیں پر بادشاہی ہے
امیروں کے محل سے بڑھ کے ٹوٹے گھر کا کونا ہے
خوشی کی شے محبت ہے، نہ موتی ہے، نہ سونا ہے

فرید : آٹھ لاکھ نقد اور جائیداد تو پھونک چکا۔ ایک باغ اور مکان رہ گئے ہیں، انھیں بھی چند دنوں میں شراب خانے کی نذر کر دے گا۔ پھر دیکھوں گا کہ اسے فاقے سے کون بچاتا ہے؟

رشیدہ : کیا یہ انگلیاں کشیدہ نہیں کاڑھ سکتیں، کیا یہ آنکھیں رات کے وقت چراغ کے سامنے نہیں جاگ سکتیں۔ کیا یہ چہرہ محنت نہیں کر سکتے۔ میں سوئی کے ساتھ آنکھیں پھونڈوں گی۔ کپڑے سیوں گی، دوسرے کے گھر میں نوکری کر کے جھوٹے برتن مانجوں گی، لیکن اپنے جیتے جی کبھی انھیں فاقہ نہ کرنے دوں گی۔

بہا دوں گی کلیجے کا لہو ان کے پسینے پر
انھیں فاقوں سے دیکھوں اور جیوں لعنت ہے جینے پر

ترکی حور

فرید : جب جا عارت ہو، تباہ ہو، آج سے میں تیری صورت بھی نہ دیکھوں گا۔ انہیں
قدموں میں تیری پامالی اور انہیں قدموں میں تیری موت ہے۔
رشیدہ : انہیں قدموں میں میری زندگی اور انہیں قدموں میں میرا سکھ ہے۔
(عارف کا پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ فرید غصے میں منہ پھیر لیتا ہے۔
ایاز حیرت سے رشیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اور عارف ہاتھ سے
رشیدہ کو دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔)

پہلا ایکٹ - چھٹا سین

راستہ

(زیاد پاشا، طارق اور ایک مصاحب کے ساتھ آتا ہے)

زیاد : دیکھتے ہو کیسا دلغریب شہر ہے، ہر محلہ ایک خوبصورت پھول کی پگھڑی معلوم ہوتا ہے۔

طارق : واقعی حضور، مشرق کی متانت اور مغرب کی تراش خراش کو ایک ساتھ دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ مدت کے پھڑے ہوئے ایشیا اور یورپ باسٹورس کے کنارے آپس میں گٹھ مل رہے ہیں۔

زیاد : یہ دل کش آبادی پہلے بھی ایشیا کے خوبصورت شہروں کی شہزادی کہلاتی تھی، لیکن جیسے یورپ سے آئی ہوئی آزادی نے اس کے جسم سے عصمت کا قدیم لباس اور پرہیزگاری کے پرانے زیور اتار کر شراب میں غسل دینے کے بعد دنیا پرستی کی پوشاک اور عیاشی کے زیور پہنا کے منہ پر فضول خرچی اور فیشن کا پاؤڈر مل دیا ہے، اس دن سے اس کے حُسن میں ایک نئی چمک دک آگئی ہے۔

طارق : بجا ہے ولی نعمت۔

زیاد : جانتے ہو، میں اپنا قلعہ، محل، ریاست چھوڑ کر ایک معمولی رئیس کی طرح سال کے آٹھ مہینے اس شہر میں کیوں گزارتا ہوں؟

طارق : جانتا ہوں خداوند۔ حضور حُسن کے شکاری ہیں اور یہاں کے ہونٹوں اور تھیمڑوں میں تھوڑے خرچ اور تھوڑی کوشش سے حضور کو ہر ملک کے

خوبصورت شکار مل جاتے ہیں۔

زیاد : خوب سمجھے اور ٹھیک سمجھے۔

یوں ہی اپنی گذرتی ہے یہاں کے گل غداروں میں
گھرا رہتا ہے جیسے چودھویں کا چاند تاروں میں
وہ خوشیاں ہیں بغل میں فاصلہ تھا جن سے کوسوں کا
نظر کو دید کا ملتا ہے لطف اور لب کو بوسوں کا

طارق : خامے کا وقت ہو چکا۔ حضور دوپہر کا کھانا کہاں تبادل فرمائیں گے؟

زیاد : کل والے ارٹنی ہوٹل میں۔

(تینوں جاتے ہیں۔ لیلیٰ پھول بیچتی ہوئی آتی ہے)

لیلیٰ : (گانا) مرے پھول رنگیلے۔ آؤ ریلے لوٹو بہار۔

چن چن کلیاں میں چن لائی، لے لو الیلے بیلے کا ہار۔

جو ہی تمہیلی کی دیکھو رے جوتی۔ دھاگے میں پروئے ہیں موتی

مند سگندھ تمکن سب کھوتی

چھ ہوں میں سکھ اور سنگا ر۔ میرے پھول....

(اپنے آپ سے) ماں کے مرنے کے بعد دنیا کے سمندر میں ٹوٹی ہوئی کشتی

کی طرح غریبی اور مصیبت کے طوفان کا مقابلہ کر رہی ہوں۔ بارغ سے

پھول چننا۔ گلہتے بنانا۔ گلی گلی پھر کر بیچنا، بدمعاشوں کی ناپاک نظر اور

پاجیانہ حملوں سے اپنے کو بچانا اور عزت و حرمت سے چار پیسے مل گئے تو

کچھ کھا لینا ورنہ بھوکی سو جانا، یہی میری زندگی ہے۔ اور یہی میری زندگی کے

روزانہ کام ہیں۔

خداوند بس اتنی عرض تمھ سے دست بستہ ہے

اُدھر ہی مجھ کو لے جانا جدھر نیکی کا رستہ ہے

(لیلیٰ ایک طرف جاتی ہے اور انور اپنے دو فوجی دوستوں کے

ساتھ آتا ہے)

انور : میرے دوست۔ جب ایک طرف غصہ اور ایک طرف گستاخی ہو تب یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ دونوں طرف سے کھینچنے میں ملے ہوئے دل تو کیا، آپس میں جوڑی ہوئی زنجیر کی کڑیاں بھی الگ ہو جاتی ہیں۔

اتش : آپ کو یہاں کا حال کیوں کر معلوم ہوا؟

انور : ایاز کے خط سے۔ جس دن سے خط ملا اسی دن دو مہینے کی چھٹی لی اور اسی شام کو چھاؤنی سے وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔

جلال : اور گھر پہنچنے پر آپ کے والد اور عارف کسی نے آپ کی نیک صلاح قبول نہ کی۔

اتش : یہی تو صدمہ ہے۔

انور : آپ جانتے ہیں کہ رشیدہ میری سگی بہن ہے اور ایسا بھائی کون ہے جسے بہن کی بربادی کا صدمہ نہ ہوگا۔

جلال : وہ سامنے ارنی کا ہوٹل ہے۔ آئیے چائے بھی پیئیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔

(لیلیٰ واپس آتی ہے)

لیلیٰ : میں نظر کی تازگی اور دماغ کی فرحت بیچتی ہوں۔ کیا حضور موسم بہار کے یہ خوش رنگ جواہر خریدیں گے؟

انور : (ساتھی سے) کیسے سترے لفظوں میں سودا بیچتی ہے۔ (ایک گلدستہ لے کر) اس گلدستے کی کتنی قیمت ہے؟

لیلیٰ : غریبوں کی قسمت میں جتنی خوشی ہوتی ہے، اس سے بھی کم۔ صرف چار آنے۔

انور : جب کوئی لڑکی شائستہ لفظوں میں شرم و شرافت کے ساتھ پھول بیچی ہے تو اُس پھول کا دام شریف آدمی کی نظر میں ایک سے چوگنا ہو جاتا ہے۔ یہ لو روپیہ۔

لیلیٰ : معاف کیجیے۔ میں زیادہ دام نہیں لے سکتی۔ کیونکہ یہ غریب لڑکی کے لیے

لاٹج ہے اور لاٹج ہی گناہ کا راستہ ہے۔

انور : کسی نیک لڑکی کو لاٹج دینا، یہ شریف کی نہیں کینے کی حرکت ہے۔

لیلیٰ : تو پھر کیا آپ مجھے بھیک دیتے ہیں۔ اگر یہ بھیک ہے تو اس روپیہ پر میرا نہیں قیاموں، بیواؤں اور ہاتھ پاؤں سے لاچار محتاجوں کا حق ہے۔ میں اپنی روٹی اپنی محنت سے پیدا کر سکتی ہوں۔

انور : پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے روپیہ دیتا ہوں۔

لیلیٰ : پیسے نہیں ہیں تو یہ گلدستہ آپ کی نذر ہے۔

(لیلیٰ گلدستہ دے کر چلی جاتی ہے)

انور : (حیرت سے) اتنا امیر دل اور اس کا جس نے ایک غریب کے گھر میں جنم لیا ہے۔

جلال : دنیا کو نکلی، شرافت، فیاضی کی تعلیم دینے والے تمام پیغمبر اور تمام بڑے آدمی غریب ہی کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔

(سب جاتے ہیں)

پہلا ایکٹ - ساتواں سین

ہوٹل

(مختلف میزوں پر بیٹھے لوگ شراب پی رہے ہیں۔ ایک طرف عارف اور زیاد بیٹھے ہیں۔ عارف کے پاس غانم اور زیاد کے پیچھے اُس کے معاصب کھڑے ہیں۔ ہوٹل کی رقاصہ فیم ناچ رہی ہے)

غانم : واہ میری لٹا کبوتری۔ کیا کمائی کی طرح کر چک رہی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھنگرو پہن کر مور ناچ رہا ہے۔

عارف : دوست غانم۔ ناچ تو خوب ہے۔ لیکن نشے میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ناچ رہی ہے، مکان ناچ رہا ہے یا ہم تم ناچ رہے ہیں۔

غانم : (سائڈ میں) کوئی نہیں دماغ میں بول ناچ رہی ہے۔

ایک شخص : ذرا غریبوں کی طرف بھی آئیے گا۔ ناچ کا تو مول ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ دانتوں میں ہونٹ دبا کر مسکرانے کی قیمت ہے۔

(نوٹ دکھاتا ہے جسے فیم آگے بڑھ کر لیتی ہے)

دوسرا : ادھر بھی زندوں کی ہستی ہے۔ یہ بھویں میز کی کر کے کن انہیوں سے دیکھنے کا نذرانہ ہے۔ (نوٹ دیتا ہے)

غانم : اچی سنتی ہو۔ بہت سی بھوکی ٹکائیں تر نوالہ سمجھ کر گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ منہ پر رومال ڈالو۔ نہیں تو نظر لگ جائے گی۔

- عارف : غانم کیا ہو رہا ہے؟
- غانم : حضور عشق بازی کی ریس میں روپے کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ آپ کی جب میں بھی تو ”بپ“ موجود ہے۔ ”ون“ نہیں تو ”پلیس“ ہی کھیل لیجیے۔
- عارف : سمجھ گیا۔ بے شک۔ ضرور انعام دینا چاہیے۔
- غانم : جناب رٹریوں کو انعام دینے سے بڑھ کر کوئی ثواب کا کام نہیں۔ کیونکہ یہ سب بے باپ کی یتیم بچیاں ہیں۔
- زیاد : اچھا۔ اس روپیہ چھٹنے والی چڑیا سے پوچھو کہ نوٹ کھائے گی یا بینک کا چیک۔ بلا لاؤ۔
- غانم : (شمیم کے پاس جا کر) لو چلو۔ ایک ہی لات مارنے سے نصیب کا پھانگ کھل گیا۔ لیکن جو کچھ ملے داہنے ہاتھ سے لے کر بائیں ہاتھ سے اس کوٹ کے سیونگ بینک میں داخل کر دیتا۔
- شمیم : پہلے یہ بتاؤ۔ کیا کوئی اور خالہ مل گئی ہے؟ تم دو روز سے گھر کیوں نہیں آئے؟
- غانم : کیا سر پھٹول کرنے آؤں۔ تمہاری ماں تو میری صورت دیکھتے ہی اس طرح گرم ہو جاتی ہے جیسے بیٹھل پر کی چڑیل کو بخار آجائے۔
- شمیم : اجی جب میں تمہیں چاہتی ہوں تو بڑھیا کے لال پیلی ہونے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ رٹری کی نانگ تو گھر کی پالو تلی ہوتی ہے۔ جہاں نوچی نے ڈانٹ بتائی کہ دو دفعہ غرانے کے بعد دم دبا کر کونے میں بیٹھ گئی۔
- غانم : یہ تو سچ ہے۔ جب نانگ بڑھیا ہوتی ہے تو اس کی قسمت بھی بڑھیا ہو جاتی ہے۔ اچھا چلو نوٹوں پر ہتھ مار لو۔ مگر دیکھنا محبت کے ڈاک خانے میں ایمان کی رجسٹری کرا چکی ہو۔ آدنی خوبصورت ہے۔ ڈاکے کے تھیلے کی طرح گلے نہ پڑ جاتا۔
- شمیم : (پاس جا کر) سرکار لوگ تو بوتل کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ادھر نظر کیجیے۔ اس ریلی صورت کو دیکھ کر بھی نشہ ہو جاتا ہے۔
- غانم : جی ہاں۔ عورت نہیں پورٹ وائن کی بوتل ہے۔

کلیات آغاشر کاشمیری - جلد چہارم

زیاد : آگئیں۔ خوب ناچتی ہو۔ لٹو بھی اتنی جلدی نہیں پھر سکتا۔

عارف : لو یہ ناچنے کا انعام۔

زیاد : یہ یہاں تک آنے کا انعام۔

(عارف اور زیاد شمیم کو نوٹ دیتے ہیں اور غانم شمیم سے لے کر پاکٹ میں رکھتا ہے)

عارف : یہ ہم دونوں دوستوں کی سلامتی کا انعام۔

شمیم : واہ۔ کیا دل ہے۔ میں نے آج تک ایسے نئی نہیں دیکھے۔

غانم : تجھے معلوم نہیں۔ داؤں جیتنے کے بعد جواری اور تھوڑی پی لینے کے بعد شرابی دونوں نئی بن جاتے ہیں۔

شمیم : ان نوٹوں میں سے کچھ مجھے بھی تو دو۔

غانم : جب میں تمہیں دل دے چکا تو اب دنیا میں دینے کو باقی ہی کیا رہا۔ جاؤ۔ دینے کے لیے بہت سے بیوقوف موجود ہیں۔

شمیم : واہ رے محبت کا اندھیر۔ دنیا کو میں لوٹتی ہوں اور تم مجھے لوٹتے ہو۔

(شمیم ہنستی ہوئی جاتی ہے)

عارف : (زیاد سے) اچھا تو میں رخصت ہوتا ہوں۔

زیاد : اتنا جلد؟ کہاں جائے گا؟

عارف : میں نے اپنی ایک لاکھ کی جائیداد ضرورت کے لیے ستر ہزار میں فروخت کر دی ہے۔ اس وقت غانم کے ساتھ عدالت میں اس کی رجسٹری کرانے جا رہا ہوں۔

(دونوں ہاتھ ملاتے ہیں۔ زیاد مصاحبوں کے ساتھ اندر جاتا ہے۔)

ہوٹل کا بوائے بل لاتا ہے)

بوائے : (عارف کے سامنے بل پیش کر کے) حضور۔

غانم : (ہوائے سے) روپیہ تیرہ آنے والے تو نہیں ہیں۔ کیونکہ ہوٹل والے شرایینوں کو نشے میں دیکھ کر کھوٹے روپیہ دے دیا کرتے ہیں۔ کتنے بچے؟

ہوائے : حضور نے پچاس کا نوٹ دیا تھا۔ سینتیس روپیہ دس آنے کا بل ہوا۔ باقی بارہ روپے چھ آنے۔

عارف : کیا بچے۔ بارہ روپے چھ آنے۔ لے جاؤ تمہاری بخشش ہے۔

(ہوائے سلام کر کے لوٹتا ہے۔ اور غانم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

غانم : ابے اے کہاں لے چلا۔ ایک وقت میں اتنے روپیہ کبھی تیرے باپ کو بھی انعام میں ملے تھے۔ رکھ۔ نہیں تو ڈاکے کے مقدے میں دھروا دوں گا۔ اٹھا بے چوٹی۔

(سب روپے اپنی جیب کے حوالے کرتا ہے)

ہوائے : ایسے ہی کم بخت کسی کا بھلا ہونے نہیں دیتے۔ اچھا بیٹا کبھی تم میرے گھر کے پاس مل گئے تو محلے بھر کے کتے پیچھے لگا دوں گا۔

غانم : کیا بھونکا۔ دو آنے کی جگہ چار آنے انعام پانے پر بھی میرے پیچھے کتے لگا دے گا۔ اور چاہیے۔ لے انعام۔

(سر پر دھول مارتا ہے)

ہوٹل والا : یہ کیا بیہودگی۔ متوالے ہو کر میرے نوکر پر ہاتھ اٹھاتے ہو؟

غانم : ابے ہمیں متوالا کہتا ہے۔ ہم دہسکی کی دو بوتلیں تو ناس کی طرح سونگھ جاتے ہیں۔ یہ اس کی گستاخی کا انعام تھا۔ اور یہ دیکھ تیری حمایت کا انعام۔ (پھر مارتا ہے)

ہوٹل والا : تم جیسے بدمعاش آئیں گے تو اس ہوٹل میں ایک بھی شریف نہ آئے گا۔ لپے فساد۔ نکل جا میرے ہوٹل سے۔

(دروازے کی طرف دھکا دیتا ہے)

عارف : (لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر) شریفوں سے یہ برتاؤ۔ دوست کی بے عزتی خود میری بے عزتی ہے۔ (ہوٹل والے کی گردن پکڑ کر) کتے۔ اس کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ نہیں تو گئے کی طرح گردن کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔
 ہوٹل والا : ہوٹل میں خونی گھس آئے۔ پولیس۔ پولیس۔
 عارف : بول کہ قصور ہوا۔ ورنہ پولیس کیا تیرے باپ کے آنے پر بھی گردن توڑے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔

(پولیس کا افسر دو سپاہیوں کے ساتھ آتا ہے)

افسر : یہ کیا؟ قانون اور عدالت سے اتنی بے پروائی۔
 غانم : (اپنے سے) جیل خانے کے انکھیٹ آگئے۔ اب کھک جاتا ہوں۔ باوا میں تو شکہ اور حرے کا ساتھی ہوں۔ مصیبت اور جیل کا ساتھی نہیں ہوں۔ (بھاگ جاتا ہے)
 افسر : چھوڑ دو گردن۔ پولیس کا حکم نہیں سنتے۔ (گردن چھڑا کر) یوں کھڑے ہو (ہوٹل والے سے) کیا معاملہ ہے؟

ہوٹل والا : آپ ابھی نہ پہنچتے تو خون ہو جاتا۔ (ادھر ادھر دیکھ کر) وہ دوسرا مجرم کہاں ہے؟

بواے : پولیس کی صورت دیکھتے ہی بھاگ گیا۔
 عارف : غانم بھاگ گیا؟ پولیس کا اتنا خوف؟ کیا چوری کی تھی؟
 افسر : کیوں جھگڑا ہوا؟

ہوٹل والا : اس کے ساتھی نے میرے نوکر کو مارا۔ جب میں نے منع کیا تو اس نے اپنے دوست کی طرفداری میں مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ خیر گزری کہ آپ آگئے۔ ورنہ یہ ہوٹل کی چیزوں کو بھی نقصان پہنچاتا اور میرا بھی گلا گھونٹ دیتا۔

افسر : (عارف سے) تم کون ہو؟
 عارف : تم پولیس مین ہو کر صورت دیکھ کے آدمی کو نہیں پہچان سکتے۔ میں ایک

شریف آدمی ہوں۔

افسر: شریف آدمی جن روپیوں سے غریبوں، یتیموں، بیواؤں کی مدد ہو سکتی ہے، ان روپیوں کو شراب کی بھٹی میں نہیں جھونکتے۔ لڑکھڑاتے ہوئے مزدوروں پر نہیں پھرتے۔ ایسے گناہ اور ناپاکی بھرے ہوٹلوں میں روپیہ دے کر بدنامی نہیں مول لیتے۔ عزت اور خاندان کا خیال بھلا کر نشہ میں بدمعاشوں کی طرح مار پیٹ نہیں کرتے۔ تم صورت سے شریف ہو لیکن حرکتوں سے کبھی شریف نہیں ہو۔ اپنے کو ان سپاہیوں کے حوالے کرو۔

عارف: کیا تم مجھے گرفتار کرو گے؟

افسر: ہاں میں تمہیں گرفتار کروں گا۔ اور رات بھر حوالات میں بند رکھنے کے بعد کل صبح بدستی اور حملے کے جرم میں مجسٹریٹ کے سامنے تمہارا چالان کروں گا۔

عارف: تم اتنا اختیار نہیں رکھتے۔

افسر: پولیس کے پاس کتنا اختیار ہے، ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ (سپاہیوں سے) باندھ لو محکمیں۔

(سپاہی رتی سے عارف کی محکمیں باندھتے ہیں۔ اسی وقت ایاز داخل ہوتا ہے)

ایاز: یہ کیا؟ کیا میں بھی نگارہ دیکھنے کے لیے گھر سے انھیں ڈھونڈنے کے لیے نکلا تھا؟ (افسر سے) ایک شریف آدمی کو کیوں گرفتار کیا ہے؟

افسر: آدمی شراب پینے سے خوشتر شریف رہتا ہے۔ لیکن پینے کے بعد پاجی بن جاتا ہے۔ اسے بدستی اور مار پیٹ کے جرم میں گرفتار کیا ہے۔

ایاز: (عارف سے) دیکھ لیا غام جیسے کمینوں کی دوستی کا نتیجہ دیکھ لیا شراب پینے کا انجام۔ کہتے تھے کہ سانپ سے دوستی نہ کرو۔ کہتے تھے کہ زہر کو شربت سمجھ کے نہ پیو۔ باپ سے زیادہ محبت کرنے والے سر نے سمجھایا۔ میں نے سمجھایا۔ جیروں پر سر رکھ کر اور دو رو کر بیوی نے سمجھایا۔ لیکن تم نے کسی کی

پکار اور کسی کی دہائی نہ سنی۔ آج اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ شریف باپ اور شریف گھرانے کے لڑکے ہو کر چور اور گرہ کٹ کی طرح رسیوں میں بندھے پولیس کے گھیرے میں کھڑے ہوئے ہو۔

نشہ لاتا ہے اپنے ساتھ ذلت اور خرابی کو
یہی عزت ملا کرتی ہے دنیا میں شرابی کو

افسر: جس کٹھری میں چور اور بد معاش بند ہوتے ہیں اسی کٹھری میں بدست شریفوں کو بند کرتے ہوئے ہمیں افسوس ہوتا ہے۔ لیکن خود ان شریفوں کو اپنے حال پر افسوس نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ دن کو مجسٹریٹ کی پکھری میں جرمانہ دینے کے بعد شراب کو لعنت سمجھ کر چھوڑ دیتے اور شام ہوتے ہی پھر اسی لعنت کو گلاسوں میں بھر بھر کے پینے لگتے ہیں۔

ایاز: خاندان اور آمد کے دشمن، اپنی حالت دیکھو اور شرم کرو۔ جس بیوی نے تمہارے لیے گھر، باپ، بھائی، بہن، سب کو چھوڑ دیا۔ جب وہ یہ ذلت سنے گی تو اس کا کیا حال ہوگا؟ جب تم رسیوں میں بندھے ہوئے پولیس کے ساتھ بازار سے گذرو گے تو دیکھنے والے کیا کہیں گے؟

یہی کہیں گے، نشہ نے کیا خراب اس کو
چلی ہے لے کے حوالات میں شراب اس کو

افسر: (سپاہیوں سے) بڑھو۔

ایاز: ٹھہرو۔ یہ خون اور چوری کا نہیں معمولی لڑائی کا مقدمہ ہے۔ میں ملزم کی طرف سے ضمانت دینے کو تیار ہوں۔

افسر: ضمانت یہاں نہیں ہو سکتی، تھانے پر آؤ۔

ایاز: اے شراب کے متوالو، اے گھر، دولت، عزت برباد کرنے والو، ایک شریف کا حال دیکھو اور اپنے انجام پر غور کرو۔

نہ ڈسنے دو انھیں آجاؤ اب بھی تم حواسوں میں
بھرے ہیں سانپ تجھو بتکوں میں اور گلاسوں میں

ترکی حور

(پولیس کے ساتھ ہوٹل مالک، ایاز اور عارف کا جانا۔ زیاد، طارق اور ایک مصاحب کا آنا)

زیاد : (طارق سے) دیکھو، دروازے پر موٹر حاضر ہے؟
طارق : بہت خوب (دروازے کی طرف بڑھ کر رکتا ہے) خداوند دیکھیے۔ پھول والی کے ہمیں میں ایک پرستان کی پری چلی آتی ہے۔
زیاد : (دیکھ کر) کتنا شاندار حسن۔ آج تک آنکھوں نے اتنی حسین صورت نہیں دیکھی۔

(للی آتی ہے۔)

للی : (حیرت سے) میں ایک شریف کا گھر سمجھ کر پھول بیچنے آئی تھی۔ لیکن یہ تو شراب خانہ معلوم ہوتا ہے جھی۔ جھی۔ کیسی گندی جگہ ہے۔ مجھے ابھی لوٹ جانا چاہیے۔

(للی لوٹی ہے۔ زیاد آگے بڑھ کر روکتا ہے)

زیاد : اچھا شعر، خوش رنگ پھول اور خوبصورت چہرہ کون نہیں پسند کرے گا۔ لیکن ان پھولوں سے زیادہ (گالوں کی طرف اشارہ کر کے) ان پھولوں میں دلفریبی ہے۔ بتاؤ ان کی کیا قیمت ہے؟

یہ دونوں چاند کے ٹکڑے بھی ہیں اور شمع محفل بھی
کرو سودا، میں زر بھی دوں گا، زر کے ساتھ یہ دل بھی

للی : ہٹ جاؤ۔ دور ہو جاؤ۔ مجھے معطوم ہو گیا کہ یہ جگہ، جہاں میں دھوکے سے آگئی ہوں، اس شہر کا ناپاک دوزخ ہے۔ اور تم اس دوزخ کی لعنتی روح ہو۔

زیاد : غصہ بھی حسن کا زیور ہے۔ گالوں پر غصے کی سرخی آجانے سے تمھارا خوبصورت چہرہ اور بھی زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔

ہاں کہو۔ کیا چاہیے دولت بھی ہے آرام بھی
بڑھ گیا جب حسن تو بڑھ جائیں گے اب دام بھی

لیلیٰ : تم امیر ہو۔ ہم غریب ہیں۔ تم محلوں میں رہتے ہو، ہم جموہڑی میں رہتے
ہیں۔ تم تحمل پہنتے ہو، ہم جھوڑے پہنتے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ پیسے اور گناہ
ایک جگہ جمع ہو سکتے مگر جھوڑے اور نیکی، غریبی اور عصمت ایک جگہ جمع نہیں
ہو سکتیں۔

تحصیل زر تو ہمیں ایمان، ہمت اور قناعت دی
وہ تم نے بھی نہ پائی جو خدا نے ہم کو دولت دی
فقط بازار کی کتیا پھسل جاتی ہے پیسوں پر
جو عصمت دار ہے وہ تھوک دیتی ہے تم ایسوں پر

زیادہ : پھول والی کی زندگی سے بیگم کی زندگی زیادہ شاندار ہوتی ہے۔ تم خوش قسمت
ہو کہ میرے جیسا دولت مند آدمی تمہارے حسن کی قدر کر رہا ہے۔
لیلیٰ : میں تحصیل دولت مند نہیں، ایک بھکاری سے بھی بدتر جانتی ہوں۔
زیادہ : کیوں؟

لیلیٰ : کیوں کہ تم سونے چاندی کو اور میں شرافت اور نیکی کو دولت سمجھتی ہوں۔

وہ سکھ تم کو نہیں، جو سکھ ہے قسمت میں فقیروں کی
غریبوں سے بھی ہے تقدیر بدتر تم امیروں کی
تمہارا گھر ہے اصلی عیش کے سامان سے خالی
بھری ہے جیب تو کیا دل ہے جب ایمان سے خالی

زیادہ : حسن بیچ کر تحصیل دولت اور عیش ملیں گے، لیکن پھول بیچ کر پہننے کے لیے
موٹے کپڑے اور کھانے کے لیے سوکھی روٹی کے سوا اور کیا ملے گا۔

لیلیٰ : لالچ دینے والے شیطان منہ بند کر۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ خدا ایسے گنہگاروں کو کس طرح معاف کرے گا۔ یہ تیرے ہی جیسے بدنیت بدکاروں کا
ظلم ہے کہ ہزاروں غریب لڑکیاں جو بے زر، بے گھر، بے سہارا ہونے پر

ترکی حور

بھی محنت مزدوری کر کے آمد کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں، آج بازار کے کوشوں پر بیسوا بن کر اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت برباد کر رہی ہیں۔

تری بدکاریاں ہی تیری دشمن، بدچلن ہوں گی
نہ تاک اوروں کا گھر تیرے بھی گھر میں ماں بہن ہوں گی

زیاد : تعجب ہے کہ پھول کی پگھڑی سے شہد کے بدلے زہر ٹپک رہا ہے۔ لفظ
کڑوے ہیں لیکن ہونٹ ضرور میٹھے ہوں گے؟

(لپٹا کر بوسہ لینے کی کوشش کرتا ہے)

لیلیٰ : بد معاشوں۔ پاجی...

زیاد : چپ۔

(منہ بند کر کے زبردستی پیار لینا چاہتا ہے۔ انور اپنے دوستوں کے
ساتھ داخل ہوتا ہے)

انور : یہ کیا؟ حیوان آدمی۔ چھوڑ دے اسے۔ شرم ہے تم پر۔ مرد ہو کر ایک بے
کس شریف لڑکی پر ظلم کرتے ہو۔

زیاد : ظلم سے بچتا تھا تو اسے خوبصورت چہرہ لے کر یہاں نہ آنا چاہیے تھا۔

انور : تو گویا عورت کا خوبصورت ہونا جرم ہے اور تم جیسے بدکار مرد اس جرم کی
عورت کو سزا دینا چاہتے ہو۔

زیاد : چلے جاؤ۔ ورنہ میں گھونسا مار کر منہ بند کر دوں گا۔

انور : تیرے گھونٹوں کا جواب تجھے لوہے کے گھن سے دیا جائے گا۔

زیاد : کہیں۔

(انور پر حملہ کرتا ہے۔ انور کے گھونٹوں سے بے دم ہو کر گر جاتا
ہے۔ مصاحب مدد کو آتے ہیں)

کلیات آفاشر کامیری - جلد چہارم

طارق : خبردار۔

اتش : بس۔

(اتش اور جلال تلواریں کھینچ کر زیاد کے مصاحبوں کو روکتے ہیں۔
زیاد اٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور انور اُسے گھونسا مار کر پھر گرا دیتا
ہے۔ لیلیٰ انور کے گلے میں فتح کا ہار پہنا دیتی ہے)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ - پہلا سہین

راستہ

(زیادہ، اُس کے مصاحب اور غائم آتے ہیں)

زیادہ : مقابلے کی طاقت نہ ہونے کا نام درگزر اور دل کی کمزوری کا نام رحم ہے۔
لومڑی شیر کو لات مار کر چلی جائے اور وہ دانت ناخن، غصہ اور طاقت رکھ
کر منہ دیکھتا رہے؟ میرے غصے کا شندا ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا دوزخ
کا سرد ہو کر برفستان بن جانا۔

غائم : (طارق سے) سرکار کی اتنی ذلت اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ اتنے دن سرکار کا
نمک کھایا تھا یا گوبر؟

طارق : جو کچھ کیا، اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا؟
غائم : کچھ نہ ہو سکا تو چلو بھر پانی میں ڈوب ہی مرتے۔ لیکن تم تو سینکڑوں
گھڑے پڑ جانے پر بھی مری ہوئی بھینس کی طرح اب تک پانی کے اوپر تیر
رہے ہو۔

زیادہ : تم کچھ کہتے ہو۔ میرے تمام نوکر صرف دسترخوان پر روٹیاں توڑنا جانتے ہیں۔
ہاں تم نے اس کا کیا نام بتایا؟

غائم : کپتان انور۔
زیادہ : وہ فوج میں ملازم ہے؟

غائم : جی ہاں۔ لڑائی میں بہادری کا ملا بھی پاچکا ہے۔ جب وہ اس بے کو چھاتی
پر لگا کر لٹا ہے، جب معلوم ہوتا ہے کہ بھوکے کالے کی چوٹی میں روٹی

لنک رہی ہے۔

زیاد : وہ عارف کا کون ہوتا ہے؟

غانم : وہی جس کی شان میں سسرال کے ستائے ہوئے شاعر نے یہ شعر کہا ہے۔

ساری دہائی اک طرف، اور ایک اکائی اک طرف

ساری خدائی اک طرف، جو رو کا بھائی اک طرف

زیاد : سمجھ گیا۔ وہ رشتے میں عارف کا سالا ہے۔

غانم : سالا کہیے۔ ازار بندی بھائی کہیے۔ بھانجے کا ماموں کہیے۔ سرکاری نوٹ کی

طرح سب نام چل سکتے ہیں۔

زیاد : وہ عارف کا عزیز ہو، خوفناک روح ہو، دیو ہو، شیطان ہو، کوئی ہو لیکن میں

اس سے اپنی ذلت کا ضرور بدلہ لوں گا۔ تم ہی بتاؤ، کیا مجھے اس بے عزتی کا

انتقام نہ لینا چاہیے؟

غانم : مجھ بیوقوف کی رائے پوچھتے ہیں؟ جناب دنیا میں دو طرح کے آدمی ہوتے

ہیں۔ ایک وہ ہیں جو بندر کی طرح سانپ کو سر سے کھڑ کر رگڑ کر مار

ڈالتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو کبوتر کی طرح تلی کو دیکھ کر آنکھیں بند

کر کے بیٹھ جاتے ہیں آپ کبوتر تو بن نہیں سکتے، اس لیے ضرور آپ کو بندر

بنا پڑے گا۔

طارق : مجھے نہیں معلوم تھا کہ حضور کو اس قدر رنج پہنچا ہے۔ حکم دیجیے۔ ولی نعت

حکم دیجیے۔ وہ اب بھی آپ کے اشارے پر دن کی روشنی میں سربازار قتل

ہو سکتا ہے۔

زیاد : یہ بدلہ لینے کا مناسب طریقہ نہیں ہے۔ میں اس سلطنت کا مالک نہیں صرف

ہاج گزار رئیس ہوں۔ اس طرح مجھے عدالت کے کٹہرے میں اندر کھڑے

ہو کر مجرم کی حیثیت سے خون کے الزام کا جواب دینا ہوگا۔

طارق : ہم جاں نثاروں کی موجودگی میں آپ پر کوئی آج نہیں آسکتی۔ اور اگر ہوا کا

رخ بدل بھی جائے تو دولت کے سامنے سب سر جھکا دیتے ہیں۔ آپ کا

ترکی حور

روپیہ دو منٹ میں گواہوں کا بیان اور جج کا ایمان مول لے سکتا ہے۔
عانم : حضور۔ ان نیک نام کے گھسے میں نہ آئیے گا ورنہ آپ پھانسی کی رسی میں
اس طرح لٹکتے دکھائی دیں گے جس طرح کھجور کے درخت میں تاڑی کا ٹٹکا
جھولتا ہے۔

زیادہ : عانم تم جانتے ہو کہ انعام کی بارش برسانے میں میرے ہاتھ بادل سے زیادہ
نخی ہیں۔ تمہارے چہرے پر بلی کی غریبی مگر آنکھوں میں بھیڑیے کی آنکھوں
کی چمک ہے۔ اس لیے تم اس معاملے میں مجھے اچھا مشورہ دے سکتے ہو۔
میرے پاس آنا۔ میں تمہاری رائے کو منہ مانگی قیمت پر خرید لوں گا۔
عانم : قدر دانی۔

(سب جاتے ہیں)

دوسرا ایکٹ - دوسرا سین

عارف کا مکان

(رشیدہ پریشانی میں ٹہل رہی ہے)

رشیدہ : رات کے وقت تاریک جنگل میں رستہ بھول گئے ہوئے مسافر کی طرح میری عقل مایوسی کے اندھیرے میں بھٹک رہی ہے۔ نہ آسمان پر تسلی کا ستارہ نظر آتا ہے، نہ زمین پر امید کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ زبان تھک گئی لفظ ختم ہو گئے۔ آنکھوں کے چشمے آنسو بہا بہا کر سوکھ گئے۔ لیکن ہائے پھر بھی وہ نظر اٹھا کر اپنے خوفناک انجام کی طرف نہیں دیکھتے۔

تقدیر پھن اٹھائے ہے ڈننے کے واسطے
شعلے لپک رہے ہیں جھلنے کے واسطے
سر پر چمک رہی ہیں تباہی کی بجلیاں
بادل گھرے ہوئے ہیں برسنے کے واسطے

(عارف اور انور آتے ہیں)

عارف : بس زبان سے چھری کٹاری برساتا بند کرو۔ یہ نصیحت کا لہجہ نہیں اعتراض اور جملے کا لہجہ ہے۔

انور : آپ کی رائے بھی آپ کی طرح غلط راستے پر جا رہی ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں، محبت سے کہتا ہوں۔ دل کے دکھ سے کہتا ہوں۔ اور آپ کی بہتری کے لیے کہتا ہوں۔

عارف : جب تمہارے باپ نے بیٹی کے ہاتھ اور گلے سے ہار اور چوڑیاں اُتاروا کر اور داماد کو دروازے کا فقیر سمجھ کر گھر سے باہر کر دیا تھا، اس وقت آکر اسے نصیحت نہ کی تھی اور آج مجھے نصیحت کرنے آئے ہو۔ میری نظر میں تمہاری نصیحت اتنی ہی ذلیل و حقیر ہے، جتنا تمہارا باپ بے رحم اور سنگ دل ہے۔ انور : آپ میرے بزرگ والد کی شان میں بہت سخت اور کڑوے لفظ استعمال کرتے ہیں۔

عارف : سچے لفظ کڑوے ہی ہوتے ہیں۔ انور : میرے صبر کا امتحان نہ لیجیے۔ کوئی شریف بیٹا، باپ کے گوشت، خون سے پیدا ہو کر باپ کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔

عارف : میں اوپر سے فرشتہ اور اندر سے شیطان نہیں ہوں۔ میرا دل اور زبان ایک ہے۔ منہ پر کہتا ہوں اور صاف صاف کہتا ہوں۔ اگر تم صاف اور سچ سن سکتے ہو تو یہاں ٹھہرو اور نہیں سن سکتے تو باہر نکل جاؤ۔ رشیدہ : (قریب آکر) یہ کیا کہہ رہے ہو اور کس کو کہہ رہے ہو؟

عارف : رشیدہ۔ میں گھر سچ کر سنے کھیلتا ہوں، شراہیں پیتا ہوں، پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو کر پکھری میں جبرمانہ دیتا ہوں۔ دنیا بھر کے گناہ اور برائیاں کرتا ہوں لیکن تمہیں اس سمجھ گار اور برے شوہر کے ساتھ جینا اور مرنے ہے تو جس طرح باپ کو چھوڑ دیا، اسی طرح آج سے بھائی کو بھی چھوڑ دینا ہوگا۔

رشیدہ : غریب کا قصور؟

عارف : کچھ نہیں۔

رشیدہ : پھر؟

عارف : شوہر کا حکم۔

انور : بجلی سے مجلس گئے ہوئے درخت کی طرح چہرہ کیوں مرجھا گیا؟ ابھی اس سے بھی بدتر دن دیکھوگی۔ اور اس سے بھی بدتر حکم سنوگی۔

عارف : تم محبت کو نفرت کا سبق پڑھا رہے ہو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ چلے جاؤ۔

انور : بد نصیب بہن۔ معصیت آنے سے پہلے انسان کی عقل خراب ہو جاتی ہے۔ یہ

حالت دیکھ کر مجھے خوف ہوتا ہے کہ ایک دن نئے کا دیوانہ پن خاندان کی
آمد اور شرم کو لات مار کے حصص بھی گھر سے نکال دے گا۔

یہ نہ ہو سکھ کی طرح عزت کو بھی کھو کر چلو
آج میں بھی رائے دیتا ہوں کہ اپنے گھر چلو

رشیدہ : بھائی۔ شادی ہو جانے کے بعد شریف لڑکی کے دو ہی ٹھکانے ہیں۔ شوہر کا
گھر یا قبر کا کوتا۔ وہ بیاہ کا جوڑا پہن کر پاکلی میں شوہر کے گھر آتی ہے اور
کفن پہن کر جنازے کے اندر شوہر کے گھر سے نکلتی ہے۔

ہوں گے جدا نہ ہرگز ہم ان سے اور یہ ہم سے
لکھی گئی ہے قسمت دونوں کی اک قلم سے

انور : اچھا تو خدا کی مرضی۔ تم آنے والی مصیبتوں پر رونا اور باپ اور بھائی
تمہاری بدبختی پر روئیں گے۔

(انور کا جانا)

عارف : آنکھوں کے کنارے پر آنسوؤں کے قطرے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا بھائی
سے جدا ہونے کا رنج ہوا ہے؟

رشیدہ : میرے سرتاج۔ جس دن لڑکی بیوی بن کر اپنے گھر سے پرانے گھر میں قدم
رکھتی ہے، اسی دن وہ باپ، ماں، بھائی، بہن، اپنے بیگانے، سارے زمانے
سے زندگی بھر کے لیے الگ ہو جاتی ہے۔

میں سب کو چھوڑ بیٹھی، میرا سکھ اور آسرا تم ہو
مری تقدیر اک کشتی ہے جس کے ناخدا تم ہو
تمہاری ہی خوشی میں یہ کینز بادفا خوش ہے
کہ جس بیوی سے شوہر خوش رہے اس سے خدا خوش ہے

(ایاز باہر سے آتا ہے)

ترکی حور

ایاز : حضور یہ کیا۔ خود میاں انور سے سنا، پھر بھی یقین نہیں آتا۔ کیا واقعی آپ نے ایک سچے خیر خواہ اور سچے ہمدرد کو گھر میں آنے سے منع کر دیا؟

عارف : ہاں۔ وہ اسی سلوک کے قائل تھا۔

ایاز : تو اس سلوک سے یہ ظاہر ہوا کہ جو بری صلاح دے وہ آپ کا دوست اور جو نیک مشورہ دے، وہ آپ کا دشمن ہے۔

عارف : وہ بک بک کر کے گیا، اب تم بکے آئے ہو۔

ایاز : افسوس ہے کہ آپ خیر خواہ کی نصیحت کو بکواس سمجھتے ہیں۔ جاگئے۔ اب بھی نیند سے جاگئے۔ ستر ہزار میں صرف تیس ہزار کی رقم باقی رہ گئی ہے۔ اگر شراب خوری اور سٹے بازی میں یہ رقم بھی ختم ہوگئی تب باقی زندگی کے دن کس سہارے سے کاہنے گا۔ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر فقیروں کی طرح کس کے دروازے پر جا کر مدد کے لیے آواز دیجیے گا۔

مغلسی کے وقت پوچھے گا نہ کوئی بات بھی
گو ابھی دن ہے، مگر ہے دن کے پیچھے رات بھی
روئے گا اک نوالے، ایک کھیل کے لیے
آج ہے قبضے میں کچھ، رکھ چھوڑیے کل کے لیے

عارف : میں سٹے کے ذریعے اپنی کھوئی ہوئی دولت دوبارہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ کل کا خیال کروں تو آج کی کوئی کوشش نہیں ہو سکتی۔

بچ بونے جا رہا ہوں پھول اور پھل کے لیے
سوچ لوں گا پھر کسی دن بیٹھ کر کل کے لیے

(اٹھ کر چلا جاتا ہے)

رشیدہ : جو تھا غلطی سے کھو چکے۔ اور جو ہے وہ بھی لالچ اور امید میں کھو دینا چاہتے ہیں۔ ایاز تم باپ کی جگہ ہو۔ گھر کے بزرگ ہو، خاندان کے خیر خواہ ہو۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ حال تباہ ہو چکا۔ مستقبل کو تباہ ہونے سے بچاؤ۔

مرجاؤں گی، دیکھا جو انھیں رنج و محن میں
وہ دن نہ کہیں آئے کہ ہو چاند گہن میں

ایاز: اگر قسمت اپنی مہربانیوں کی قیمت مانگتی ہو تو میں تمہارے شوہر کی بہتری کے
لیے اس دنیا کی کمائی ہوئی نیکیاں اور اس دنیا کی نجات تک دینے کو تیار
ہوں۔ کہو میری بیٹی۔ کہو۔ میں کیا کروں؟

رشیدہ: میں کیا بتاؤں، جو ممکن ہو۔ جو تم سے ہو سکتا ہو۔ ب

خیال آنے سے کانپتی ہوں کہ کیسے گزرے گی کیا کریں گے
بھلے ہو تم، کچھ کرو بھلائی، جنس گے جب تک دعا کریں گے

ایاز: جو میں سوچتا ہوں وہی یہ سوچ رہی ہے۔ تھیلی کے بخرے کی تیلیاں ٹوٹ
چکیں۔ روپیوں کو شراب اور سٹے کے پر لگ چکے۔ نصف سے زیادہ اڑ گئے
اور باقی بھی چند دن میں اڑ جائیں گے... کیا کروں۔ (سوچتا ہے) بس یہی
آخری راستہ ہے۔

(غور کرتا ہوا چلا جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ - تیسرا سین

عارف کی خواب گاہ

(عارف پلنگ پر سو رہا ہے۔ سرہانے کی تجوری، اور پلنگی کی طرف بول اور گلاس رکھے ہیں۔ کھڑکی سے چاند کی روشنی کمرے میں آ رہی ہے۔ ایاز دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتا ہے)

ایاز : (خود کلامی) حرکت اور عمل کی دنیا میں سناٹا چھا گیا۔ حواسوں کی روشنی مہم پڑ گئی۔ پتلیوں نے آنکھ کی کھڑکیاں بند کر کے ان پر پلکوں کی چلمیں گرا دیں۔ قدرت جاگ رہی ہے یا شب بیدار چاند جاگ رہا ہے۔ (آہستہ آہستہ جا کر عارف کے سرہانے سے کنبی لیتا، الماری کھولتا اور تمام ٹوٹ نکال لیتا ہے) یہی ہے وہ چیز جس کے ذریعے امتحان انسان گناہوں کی منڈی میں جا کر اپنے دوزخ کے لیے ایندھن خریدتا ہے۔ اسی کے لیے ایک قوم دوسری قوم پر جنگ کے نام سے ڈاکہ ڈالتی ہے۔ اسی کے لیے زمین دار اور سوداگر بے زبان کسانوں اور مزدوروں کو حیوانوں سے بدتر حالت میں رکھتے ہیں۔ اسی کے لیے آدمی اپنے آپ کو، دنیا کو، خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی کے لیے شریف کینوں کی اور عالم جاہلوں کی خوشامد کرتے ہیں۔

یہی ہے وہ شجر جس میں غرور و ظلم پھلتے ہیں
یہی سانچہ ہے جس میں موت کے لوزر پھلتے ہیں
یہی چشمہ ہے جس میں آدمیت ڈوب جاتی ہے
یہی سوتہ ہے جس سے جرم کے دریا نکلنے ہیں

(ایاز نوٹ لے کر جاتا ہے۔ عارف خواب میں ڈر کر جاگ اٹھتا ہے)

عارف : (اپنے آپ سے) آف۔ آف۔ یہ کیا ہے؟ تین روز سے برابر ہمایک خواب میری آرام کی نیند پر حملہ کر رہے ہیں۔ آگھ بند ہوتے ہی دماغ خوف و دہشت کی مخلوق پیدا کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ آج بھی دیکھا کہ عانم نے میرے گلے میں خوش رنگ پھولوں کا ہار پہنایا۔ جس کے تمام پھول تھوڑی سی دیر میں زہری پھو بن گئے۔ اور سب کے سب مجھے ڈنک مارنے لگے۔ (کلی تجوری پر نظر پڑتی ہے) میرے خدا۔ تجوری کس نے کھولی؟ (دوڑ کر دیکھتا ہے) یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ تیس (۳۰) ہزار میں سے تیس (۳۰) پائیاں بھی نہیں۔ میں پھر خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ قسمت مجھ سے ٹھٹھا تو نہیں کر رہی ہے۔ (پھر تجوری دیکھتا ہے) بالکل خالی۔ ایک روپیہ بھی نہیں۔ میں سوکھے پھول میں خوشبو ڈھونڈ رہا ہوں۔ کس نے لیا؟ چاند کی روشنی اور ہوا کے سوا باہر سے کون آیا۔ آہ میں، گھر، رشیدہ سب جاہ ہو گئے۔ دولت بھی گئی اور دولت کے ساتھ آخری اُمید بھی گئی۔

(چنگ پر گرتا ہے۔ ایاز دوبارہ آتا ہے)

ایاز : (خود کلائی) ارادہ تھا کہ تیس ہزار میں سے تیس کوڑیاں بھی نہ چھوڑوں۔ لیکن ناگہانی آفت سے پاگل ہو جائے گا اس لیے پانچ ہزار کے نوٹ الماری میں دوبارہ رکھ دیتا ہوں۔

(عارف ایاز کو تجوری میں نوٹ رکھتے ہوئے دیکھتا ہے)

عارف : کون؟ یہ کون؟ (دوڑ کر ہاتھ پکڑ لیتا ہے) چور۔ لیرے۔ (پہچان کر) ایاز۔ (ہاتھوں میں نوٹ دیکھ کر) اور یہ کیا؟ (چھین کر گنتا ہے) ہزار ہزار کے تیس میں سے صرف پانچ۔ ایاز۔ باقی نوٹ؟ نہیں سنا (جھنجھوڑ کر) میں تم سے پوچھتا ہوں۔ باقی نوٹ۔

ایاز : میں نہیں جانتا۔

عارف : سانپ کی طرح ریختے ہوئے آکر نشے میں سوئے ہوئے مالک کو ڈسنا جانتا ہے۔ خدا اور ضمیر کی موجودگی میں ایمان کا گلا گھونٹنا جانتا ہے۔ دوزخ کے گھر کا کرایہ ادا کرنے کے لیے چوری کرنا جانتا ہے۔ لیکن فوٹوں کا حال نہیں جانتا۔ نہیں جانتا۔ تب تجوری سے کہاں گئے؟

ایاز : تجوری میں ان لوگوں کے روپے رہتے ہیں، جن کو غریبی کا خوف اور کھلی کی فکر ہے۔ نوٹ نہیں ملتے تو جاؤ غنیم کی جیب میں تلاش کرو۔ بٹے کے بازار میں دیکھو۔ شراب کی بوتلوں میں ڈھونڈو۔

کچھ سنبالو، کچھ رکھو، دن رات سمجھاتا رہا
آج کیوں ہے زر کا غم، خوش ہو اگر جاتا رہا

عارف : بس نمک حرام کتے۔ نوٹ دے کر میرے خسے اور انتقام سے رحم مانگ۔ تو نے روپے نہیں چرائے۔ ڈوبتے کا سہارا، پیاسے کا پانی، پتھر سے زمین کی امید چھین لی۔

سمجھ لیا ہے کہ ٹھگ لوں گا صرف باتوں سے
نکال، ورنہ نکلواؤں گا میں لاتوں سے

(ایاز کی گردن پکڑ کر گرا دیتا ہے)

ایاز : جلتے ہوئے درخت پر جانور اور فضول خرچ کی تجوری میں روپے کبھی نہیں ٹھہرتے۔ جو روپے شراب اور بٹے میں کل برباد ہونے والے تھے، سمجھ لو آج ہی برباد ہو گئے۔

قدر صحت کی بھر کرتا ہے بیماری میں
زر ہے کیا چیز سمجھ جاؤ گے ناداری میں

عارف : معلوم ہوا کہ لوہے کو نرم کرنے کے لیے آگ میں تپانا ہوگا۔ (کھونٹی سے ہنر اتار کر لاتا ہے) تیری ایمان داری کے ساتھ میرے رحم کا بھی خاتمہ

ہو چکا۔ آستین کے سانپ، شہد کی ٹھری، نکال نوٹ۔ (ہنٹر مارتا ہے)
نکال۔ (پھر مارتا ہے)

ایاز : تمہیں میری خدمت کی شرم نہ ہو لیکن مجھے تمہارے نمک کی شرم ہے۔ مار
ڈالو۔ میں اپنا خون تک معاف کرتا ہوں۔

عارف : ان ہنٹروں کے بعد پولیس کی جھڑپی اور پھر جیل کی نوبت آئے گی۔ آخری
ذلت سے بچنا چاہتا ہے تو روپے واپس دے۔ نہیں سنتا۔ تب یوں ہی سنے
گا۔ (لگاتار ہنٹر مارتا ہے) کور نمک، ٹھک، کہینے۔

(رشیدہ گھبرائی ہوئی آتی ہے)

رشیدہ : (خود کلامی) رات کے وقت کیسا شور۔ (ایاز کو پٹتے دیکھ کر) ارے گھر کے
بزرگ اسے یہ سلوک۔ کیا کرتے ہو۔ ٹھہرو۔ (ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

عارف : ہٹ جاؤ۔ شیطان شریف آدمی کا چہرہ لگا کر آج تک ہمیں دھوکا دے رہا
تھا۔ اس نمک حرام نے ہم سے بیک منگوانے کے لیے تمام روپے چوری
کر لیے۔

رشیدہ : چوری۔ ایاز نے؟ نامکن۔ جیسے قطب شمالی میں افریقہ کے ریگستان کی گرمی،
سفید دودھ میں کالا بھین، گلاب کے درخت میں دھتورا پیدا نہیں ہو سکتا،
ویسے ہی ایاز کے دل میں کبھی دعا بازی نہیں آ سکتی۔

وقاداروں سے جرم ایسا ہوا ہے اور نہ ہونا ہے

کبھی جیل نہ نکلے گا حقیقت میں جو سونا ہے

عارف : قبر تیار ہو چکی پھر بھی موت کا یقین نہیں ہوتا۔ (ایاز سے) دعا باز میں تیری
کھجلی خدمتوں اور بدحالی کا خیال کر کے اب بھی معاف کر دوں گا۔ بول
روپے کہاں چھپائے ہیں — نہیں بولتا — معلوم ہوا تو حوالات میں
پولیس ہی کے پوچھنے سے جواب دے گا۔ گناہ گار۔ جل اپنے دوزخ میں۔

(پولیس میں لے جانے کے لیے ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے)

ترکی حور

رشیدہ : ٹھہرو۔ پولیس کے حوالے نہ کرو۔ ہم ان کی محبت اور خدمت کے قرض دار ہیں۔ اگر انھوں نے پُرا ہی لیے ہیں تو یہ سمجھو کہ آج ان روپیوں سے ان کا پچھلا قرض ادا ہو گیا۔

محسنوں کی قدر کرنا فرض ہے انسان کا

یہ سمجھ کر چھوڑ دو بدلہ دیا احسان کا

عارف : چپ رہو۔ جب یہ مجھ پر رحم نہیں کرتا تو میں بھی اس پر رحم نہیں کروں گا۔
(پھر کہنپتا ہے) حرام زادے۔ آگے بڑھ۔ (دروازے کی طرف ریتا ہے)

رشیدہ : سنو۔ سنو۔

عارف : الگ ہٹ۔

(رشیدہ عارف کے جھگٹنے سے گرتی ہے اور عارف ایاز کو کہنپتا ہوا
لے جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ - چوتھا سین

شمیم کا مکان

(غانم کا آتا)

غانم : (خود کلامی) چلو چھٹی خُذ۔ قسمت جھاڑ دے کر صندوق اور جیب کا سارا کوڑا کرکٹ اٹھا لے گئی۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ تیرہ کی گنتی منہوں ہوتی ہے۔ پانچ ہزار کے نوٹ عارف کی جیب سے اٹھائے۔ پانچ ہزار مکان بکوانے کے کمیشن میں جھپٹے اور تین ہزار بٹے کے حساب میں ہاؤس بکے۔ سمجھا تھا کہ اس تیرہ ہزار میں کم از کم تیرہ مہینے چین کی بانسری بجے گی۔ لیکن آج صبح شراب اور شامت مل کر جوئے خانے میں کھینچ لے گئیں اور تین ہی گھنٹے کے الٹ پھیر میں تیرہ ہزار کا صفایا ہو گیا۔ اب اس مال زادی شمیم سے کچھ انٹھوں تب کام چلے گا۔ بھئی واہ کیا گڑھی گڑھائی الو کی پنہی مل گئی ہے۔ یہ اوروں کے لیے رٹھی ہے۔ مگر میرے لیے کرنسی بینک ہے۔ ارے سامنے سے وہی ماں بیٹی لڑاکا مرغیوں کی طرح ایک دوسرے کو چنچھیں مارتی چلی آ رہی ہیں۔ چمپ کر ان کی جج سننی چاہیے۔

(غانم آڑ میں ہو جاتا ہے۔ شمیم اور نیسہ جھگڑتی ہوئی آتی ہیں)

شمیم : کیا؟ کیا کہا؟

نیسہ : سچ کہا۔ کرپکلی تو رٹھی کا پیشہ۔ دیکھ لینا ایک دن کسی کے گھر میں۔ برتن مانگے گی یا کسی رئیس کے بچے کلائے گی۔

ہیم : دیکھو غصہ دلا کر مجھے اپنے ہاتھ سے نہ کھوؤ۔ میں تمہاری روزی کا ٹھیکرا ہوں۔

نسیہ : یہ ٹھیکرا سلامت رہے یا ٹوٹ جائے مگر میں سو مرتبہ کہہ چکی اور پھر کہتی ہوں کہ جب تک یہ اٹھائی گیرا غانم اس گھر میں آتا جاتا رہے گا تب تک یہ گھر کبھی نہ بے گا۔

غانم : (سانڈ میں) آہ۔ بڑھیا کیا محبت سے میری تعریف کر رہی ہے۔
ہیم : میں پوچھتی ہوں کہ آخر بے چارے غانم میں کیا برائی ہے۔ تمہارے گھر کا سودا لاتا ہے۔ نوکر چاکر پر رعب رکھتا ہے اور خرچ کا حساب لکھتا ہے۔ دکھ بیماری میں خدمت کرتا ہے۔ ایک شریف آدمی سے اور کیا امید رکھتی ہو؟
نسیہ : مفت کی لوٹری مفت کا کھانا، مفت کی حکومت ملے تو شہر میں ایسے سینکڑوں شریف نکل آئیں گے۔

غانم : (سانڈ میں) بُرائی خزانہ ہے۔ اس لیے پتے کی کہتی ہے۔
ہیم : بس رہنے دو۔ اگر محبت کرنا بُرا ہے تو تم اس کالے کلونے موٹر ڈرائیور پر ابھی تک کیوں جان دیتی ہو۔ نوجھوں کی ماسٹر نانگ۔ جو تم سکھاؤ گی وہی ہم سیکھیں گے۔

نسیہ : اسی دن کے لیے ناچنا گانا، اسی پھناٹا سکھایا تھا۔ چار پیسے کمانے کے لائق ہوئی تو اب ماں کو جوتی کی ٹوک پر مارتی ہے۔ اپنی ستیاناسی چاہتی ہے تو جا ستیاناس ہو۔ (پہلی جاتی ہے)

ہیم : دیکھو۔ اس نمک حرام چاچا کشتی کو۔ میری ہی کمائی کھاتی ہے اور مجھ ہی کو کوٹتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس ماں کا جھوٹا بچہ کر ابھی گھر سے باہر کر دوں۔

غانم : (سانے آنے کے بعد) یہ صلاح تو میں بھی دیتا ہوں۔ اب تم خود شیطان کی اماں ہو۔ قصص ماں کی کیا ضرورت ہے۔

ہیم : ہاں جی۔ میں دیکھتی ہوں کہ اس کے ساتھ زیادہ دن نہیں نیچے گی۔
غانم : اسی لیے تو کئی بار تم سے کہا کہ ٹھوہے اور زیور کا نکس بنل میں دبا کر

میرے گھر میں بیوی بن کے بیٹھ جاؤ۔ کوئی نیا باپ ڈھونڈ کر ماں کو اس کے حوالے کر دو۔

ہمیں : میں بیوی بن کر تمہارے گھر میں چولہا پھونکوں اور تم میرے ہی روپیوں سے اور جگہ ٹھل جھڑے اڑاؤ۔ نہیں رے دادا۔ پھول کی بہار ڈالی تک۔ اور رٹنی کی قدر رٹنی کے گھر تک ہے۔ میں یہیں اچھی ہوں۔

عائشہ : (سانڈ میں) بڑی سیانی چڑیا ہے۔ جال پھینکتا ہوں مگر پسندے توڑ کر نکل جاتی ہے۔

ہمیں : بڑھیا تھیں روز برا بھلا کہتی تھی۔ آج میں نے بھی ایسی کھری کھری سنائی کہ منہ ہی بند ہو گیا۔ کب خوش ہوئے نا؟

عائشہ : جیتی رہو۔ تم تو مجھے ہمیشہ خوش رکھتی ہو۔ مگر دیکھو کل سے ایک قرض دار میرے لیے وارنٹ لیے بھر رہا ہے۔ اگر اس کا قرض ادا کرنے کے لیے اس وقت صرف ایک نھسی سی رقم یعنی فقط دو سو روپے دے دو تو ڈبل خوش ہو جاؤں گا۔

ہمیں : تم تو بہانہ بنانے میں رٹنیوں اور مانگنے میں فقیروں سے بھی آگے بڑھ گئے ہو۔ اب تک ہزاروں روپے دے چکی۔ کہاں تک تمہارا بھرتا بھروں گی۔

عائشہ : تو کون سا کشیدہ کاڑھ کے یا چٹلی پیس کے پیدا کرتی ہو۔ مفت میں آتا ہے اور مفت میں جاتا ہے۔ تم لوگوں کا مال کھانے کے لیے ہی تو ہم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔

ہمیں : مگر دول کہاں سے؟ دو ہزار روپے تھے، ان کا ماں نے سونا خرید لیا۔ اب تو کوڑی بھی نقد نہیں ہے۔

عائشہ : نقدی نہیں ہے تو یہ گلے کا ہار اتار کر دے دو۔

ہمیں : دادا۔ ایک بیوقوف اپنی بیوی کے گلے سے اتار کر مجھے دے گیا اور میں اس حق بن کر تھیں دے دوں۔

عائشہ : تو کیا ہوا۔ دنیا میں انسان نما گدھوں کی کمی نہیں۔ کوئی نیا بیوقوف آکر پھر بڑا دے گا۔

- ہشیم : بس بہت دے چکی۔ سونے کا ہار کیا، تانبے کا جھلا بھی نہ دوں گی۔
- غانم : اچھا تو پھر یار نہ ختم۔ جاؤ تین طلاق۔
- ہشیم : یہ کیوں؟
- غانم : میں روپے لیے بغیر رٹھی سے محبت نہیں کرتا۔
- ہشیم : رٹھیوں کو دھکا کر روپیہ لینا، یہ شریفوں کا کام ہے؟
- غانم : جیسے کمرے میں آنے سے پہلے جوتا اتار دیا کرتے ہیں ویسے ہی میں بھی اپنی شرافت کو دروازے کے باہر ہی چھوڑ کے رٹھی کے گھر میں داخل ہوتا ہوں۔
- ہشیم : تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں دیکھے بغیر مر جاؤں گی۔ کوڑی نہ دوں گی۔ جاؤ۔
- غانم : اچھا اب مجھے بلانے کے لیے کسی کو نہ بھیجتا۔ میری خوبصورتی سلامت رہے، تمہاری جیسی سینکڑوں پاؤں دبائیں گی۔
- ہشیم : (سانڈ میں) بگڑ گیا۔
- غانم : (سانڈ میں) سوچ رہی ہے۔ پھنسنے گی۔ (مخاطب ہو کر) تو سن لیا۔ آدی بھی نہ بھیجتا اور ادھر سے گذروں تو کھڑکی سے آدھا دھڑ نکال کر بات سننے کے لیے قسمیں بھی نہ دیتا۔
- ہشیم : منہ دھو رکھو۔ جب تمہیں میری پروا نہیں تو مجھے بھی تمہاری پروا نہیں۔
- غانم : اچھا تو میں چلا۔ تمہو ہے تیری محبت پر۔ (جانا چاہتا ہے)
- ہشیم : سنو سنو۔ (غانم رکتا ہے) ظالم۔ تو تو سرکاری آدی کی طرح محبت کرنے کا مجھ سے ٹکس وصول کرتا ہے۔ (ہار اتار کر) بے ایمان لے۔
- غانم : ایمان دار لا۔

(ہشیم ہار دیتی ہے، اسی وقت نسیہ آجاتی ہے)

- نسیہ : یہ کیا؟ آج پھر چپکے سے زہر اتار کر دے رہی ہے۔ ارے کیوں محبت میں انڈمی بن رہی ہے۔ یہ تو گھر میں ڈاکو کھسا ہے۔ تجھے لوٹ کر رہنے کی فقیرنی بنا دے گا۔

ہیم : لوٹتا ہے تو لوٹنے دے۔ تجھے کیا۔ میں اپنی کمائی دیتی ہوں۔ تیری کمائی تو نہیں لٹاتی۔

نسیم : ارے موئے تو نے میری لڑکی پر کیا جادو کر دیا۔ یہ ڈاکوؤں کے ہتھکنڈے چھوڑ دے۔ نہیں تو میں تیرا گھر میں گھستا بند کر دوں گی۔

غانم : سنتی ہو۔ یہ پاؤں سے اتار کر پھینکی ہوئی جوتی ہی سر چڑھ کر بول رہی ہے۔

ہیم : کیا کہا۔ گھر میں گھستا بند کر دے گی۔ بڑی بند کرنے والی۔ بند تو کر اگر اپنے ہی باپ کی بیٹی ہے۔

نسیم : یہ جواب۔ ارے میں تیری ماں ہوں۔

ہیم : چل چل۔ تیری جیسی ماں ہزار ملے گی۔ یہ کہاں ملے گا؟

غانم : (سائڈ میں) بڑھیا سے بدلہ لینے کا یہی موقع ہے۔ (روٹی آواز میں) بس جی بس۔ میں بھولا بھالا آدمی ہوں۔ کسی دن تمہاری ماں مجھے کھانے میں زہر دے دے گی۔ میں اب نہیں آؤں گا۔

ہیم : نہیں نہیں۔ خانا نہ ہو۔ تمہیں میری قسم۔ (ماں سے) حرام زادی فتنہ۔ تو میرے سکھ کا ستیاناس کرنا چاہتی ہے۔ ابھی چولے میں سے جلتی لکڑی لا کر منہ جھلس دوں گی۔

نسیم : آشنا کے لیے ماں کو گالیاں دیتی ہے۔ ابھی مارے جوتیوں کے منہ سلپٹ کر دوں گی۔

غانم : سن لیا۔ تیرا ہی کھائے گی اور تجھی کو جوتیاں لگائے گی۔ دے کھنچ کر منہ پر طمانچہ۔

ہیم : نکل میرے گھر سے۔ اسی ایک کپڑے سے نکل۔ مردار۔ کتیا۔ (ماں کو دو ہتھو مارتی ہے)

نسیم : ارے تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ تجھ پر کڑے قد بکلی گرے۔ (غانم سے) موئے تو نے میرا ستیاناس کیا۔ خدا تیرا ستیاناس کرے گا۔ ہائے ہائے۔ پانچی کے پلے نے میری گانے بجانے کی ذلی چھین لی۔

ترکی حور

غانم : بس اب ہمیشہ دب کر رہے گی۔ آؤ اب کمرے میں بیٹھ کر اس کے رونے پر قبضہ مار کر نہیں۔

(نسیہ روتی ہوئی جاتی ہے)

ہمیم : پیارے۔ کمرے میں وہ گھوڑا ناظم بیٹھا ہے۔ تم تھوڑی دیر...
غانم : کیا تھوڑی دیر؟ تم نے تو کہا تھا کہ میں نوج کھسٹ کر ناظم کو دھتا کروں گی؟

ہمیم : کیسے دھتا کروں؟ وہ تو رکھائی کو بھی ادا سمجھتا ہے۔
غانم : یہ جھائیں چھتے رہنے دو۔ صاف کیوں نہیں کہتیں کہ مجھے ناظم سے محبت ہو گئی ہے۔

ہمیم : ارے یہی تو ہم رنڈیوں کی بد قسمتی ہے۔ کہ جو جو پیار کریں، روپیہ دیں، ناز اٹھائیں ان سے محبت نہیں کرتے۔ ہم تو تم جیسوں سے محبت کرتے ہیں، جو ہمارا ہی مال کھائیں اور ہم ہی کو جوتیاں لگائیں۔

غانم : اچھا بخشو۔ جاؤ تمہارے اکلوتے چہیتے یاد کر رہے ہوں گے۔ (جانا چاہتا ہے)
ہمیم : (ہاتھ پکڑ کر) اے ہے۔ تم تو گبڑتے ہی گھوڑے کی طرح رسیاں تڑانے لگتے ہو۔

غانم : اور تم بھی تو بھوکی گھوڑی کی طرح جس نے گھاس کا سٹھا دکھایا، اسی کے ساتھ ہولیتی ہو۔

ہمیم : جان۔ بس دیکھو بس دس منٹ باہر چکر لگا آؤ، میں ابھی اُس بھوت کو دو انڈروں میں گھر سے بھگاتی ہوں۔

غانم : اچھا تو دس سے گیارہ منٹ نہ ہو۔ ورنہ واپس آکر تھپڑوں سے منہ کا پاؤڈر اڑا دوں گا۔

ہمیم : (جاتے جاتے) بڑے ظالم ہو۔

غانم : دنیا میں ڈاکوؤں اور رنڈیوں دونوں کا ایک پیشہ ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ڈاکو گلی کوٹنے میں چھاپے مارتے ہیں اور یہ کٹے بازار ڈاکہ ڈالتی ہیں۔

وہ کپ چپ لوثے ہیں اور یہ سارگی طبلہ بجا کر لوہتی ہیں۔ ان کی کمانی چوری کا مال خریدنے والے ہضم کرتے ہیں اور ان کا مال ہم جیسے بے فکرے ہڑپ کرتے ہیں۔ اسی نصیب میں عیش لکھا ہے تو کیوں نہ ہڑپ کریں۔ رٹپوں کا مال کھانا ایسے دیسوں کا نہیں قسمت والوں کا کام ہے۔

(ہنستا ہوا جاتا ہے۔ شمیم اور ناظم آتے ہیں)

ناظم : سمجھ گیا۔ تم بچھو کی اولاد ہو۔ لاکھ پیار کرو لیکن تم ضرور ڈنک مارو گی۔
شمیم : اپنے پیار کو ناس کی ڈیبا میں بند کر کے رکھو۔ جب ضرورت ہو ایک چنگی نکال کر سونگھ کیا کرتا۔

ناظم : وہ محبت کی ششدری ششدری سانسیں کدھر گئیں؟

شمیم : بادل میں بیٹھ کر ہوا کھانے۔

ناظم : وہ کبھی نہ بجنے والی پیار کی پیاس کہاں گئی؟

شمیم : ہوٹل میں سوڈا پینے۔

ناظم : شمیم میری بیوی اس قدر خوبصورت ہے کہ تیرا چہرہ اس کے چہرے کے ناخن کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔ اور اتنی نیک اور وفادار ہے کہ حویریں دیکھ دیکھ کر عیش کرتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے مجھ پر اور میرے جیسے احمقوں پر جو بیوی کو اس کے حق کی محبت تک نہیں دیتے۔ اور رٹپی پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ تو ایسی جھوٹی اور اتنی بے وفا ہے۔

شمیم : آج سمجھ بھی تو جلد سمجھ۔ میرے عقل مند، بے وفائی اور جھوٹ ہی کا دوسرا نام رٹپی ہے۔ اگر ہم میں سچی محبت اور وفاداری ہوتی تو بازار کی بیسوا اور گھر کی شریف بیوی میں کیا فرق ہوتا۔ ہمارے پاس صرف جھوٹا دل، جھوٹی ہنسی، جھوٹا پیار ہے جسے ہم بازار میں بیٹھ کر بیچتے ہیں اور تم جیسے آنکھوں والے اندھے عقل اور روپیہ دے کر خریدتے اور خوش ہوتے ہو۔

ناظم : میں نے چار مہینے میں روپیوں اور زپروں سے تیرے بکس بھر دیے۔ دو

ترکی حور

مہینے میں ایک مکان خرید دیا۔ اس کے چند روز بعد دو ہزار کی گھوڑا گاڑی خرید دی۔ تھوڑے روز ہوئے بیوی کے گلے کا ہار دے دیا۔ ان احسانوں کا یہ انعام کہ میرا سیٹھ آگیا ہے، چلے جاؤ۔ اچھا جاتا ہوں۔ شریف ہوں تو کبھی نہ آؤں گا۔

ہشیم : بڑے بڑے شریفوں کو دیکھ لیا ہے۔ بگڑتے ہیں، تنختے ہیں، قسمیں کھاتے ہیں۔ اور دو ہی دن کے بعد آکر رٹھی کے پاؤں پڑتے ہیں۔

ناعلم : وہ کتنے ہوں گے لیکن میں ناک والا ہوں۔ اب آؤں تو اس اونچی ناک ہی پر تھوک دیتا۔

ہشیم : اچھا دیکھ لوں گی۔ دوبارہ جھک مارنے آئے تو ناک پر تھوکتا کیا، منہ پر پورا پیک دان الٹ دوں گی۔

ناعلم : افسوس مجھے اس نتیجے کی ذرا بھی خبر نہ تھی۔

ہشیم : آج تو خبر ہوگئی۔ کان کھول کر سنو۔ رٹھی کا یار، سدا خوار۔

یہی انجام تم جیسوں کا آخر کار ہوتا ہے
زباں پر آف گلے میں جوتیوں کا ہار ہوتا ہے

ناعلم : شیطان کی بچی۔ میں ضرور تجھ سے بدلہ لوں گا۔

ہشیم : شیطان کے ماموں۔ بس چل دو۔ نہیں تو جھازو مار کر گھر سے باہر کر دوں گی۔

(گاتا)

کسی رٹھی کے پھندے میں آنا نہیں۔

بے وفاؤں سے دل کو لگانا نہیں

دعا دل میں ہے منہ سے چاہ کا اظہار کرتے ہیں

زمانہ حُسن کو اور ہم نکلوں کو پیار کرتے ہیں

دل لگانا کبھی ہم نے جانا نہیں۔ کسی رٹھی....

یہ صورت بھولی چڑیوں کو پھنسا لینے کا پھندا ہے
چڑی ماروں کا اور ہم رٹھیوں کا ایک دھندا ہے
میٹھی باتوں کے دھوکے میں آنا نہیں۔ کسی رٹھی....

یہی انجام تم ایسوں کا آخر کار ہوتا ہے
زباں پر اُف گلے میں جوتیوں کا ہار ہوتا ہے
شرم ہو تو کبھی منہ دکھانا نہیں۔ کسی رٹھی....

(ناظم کا جانا)

دوسرا ایکٹ - پانچواں سین

ایک ٹوٹا پھوٹا گھر

(رشیدہ بچے پرانے کپڑے پہنے ہوئے چلی ہیں رہی ہے)

رشیدہ : پیاری چلی۔ تو عورت کے لیے صبح کی ورزش ہے۔ تنہائی میں باتیں کرنے والی سہیلی ہے۔ امیری میں دل بہلانے کا مشغلہ ہے۔ غریبی میں روٹی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ پیاری چکی سحر کے دھندھلکے میں جب تیری گھر گھر کی ریلی آواز چڑیوں کے گانے اور کلیوں کے چٹکنے کی آواز میں مل کر کانوں میں گونجتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورج کے مشرقی محل کے ڈیوڑھی پر صبح کی نوبت کے ساتھ شہنائی بج رہی ہے۔ یا قدرت کا بلی اور نیند کو سلانے کے لیے بیٹھے سُروں میں لوریاں دے رہی ہے۔ یا زندگی دن کے چہل پہل کے خیر مقدم کا گیت گا رہی ہے۔ گائے جا۔ گائے جا۔ پیاری چلی وہی گانا جو تو نے دنیا کی سب سے پہلی عورت کے ساتھ مل کر گایا تھا۔ اور جسے دنیا کی پیدائش کے روز سے آج تک ایک سُر اور ایک لے میں گاتی رہی۔ اب بھی گائے جا۔

غریبی اور مصیبت میں دلاسا تجھ سے پاتی ہوں
ترے گانے میں اپنے دکھ کا رونا بھول جاتی ہوں

(للی آتی ہے)

للی : (اپنے آپ سے) کیسی مبر والی، اتنی مصیبت پر بھی نہ خدا کو الزام دیتی ہے، نہ

شوہر کی شکایت کرتی ہے۔ (پاس جا کر) بہن تم تھک گئی ہو۔ لاؤ میں بیس دوں۔
 رشیدہ : لیلیٰ! بہن۔ میں اپنے اچھے دنوں میں امیر کی لڑکی اور امیر کی بہو ہونے پر
 بھی آج کل کی امیر لڑکیوں کی طرح گھر کا کام کرنا اور نوکر چاکر کا ہاتھ
 بٹانا عیب نہیں سمجھتی تھی۔ اس لیے محنت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کیا
 تم باہر جا رہی ہو؟

لیلیٰ : ہاں۔ گلوبند تیار ہو گیا ہو تو دے دو۔ ایک بیگم صاحب نے اپنے بچے کے
 لیے خریدنے کا وعدہ کیا ہے۔

رشیدہ : تمہیں اپنے غریب پردیسیوں کی کتنی فکر ہے۔ (گلوبند نکال کر دیتی ہے) یہ
 لو۔ کل ساری رات چراغ کے سامنے آنکھیں پھوڑیں، تب خدا خدا کر کے
 پورا ہوا۔ دام کی کمی بیشی کا خیال نہ کرنا۔ کیونکہ — گھر میں — پانچ چھ
 آنے پیسوں اور تھوڑے گیہوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

لیلیٰ : کیسے افسوس کی بات ہے کہ بیوی تندرستی اور آرام کا خیال تج کر چھ بجے
 دن سے بارہ رات تک محنت و مزدوری کر کے ڈیڑھ دو روپیہ پیدا کرتی ہے
 اور شوہر ان محنت کے روپیوں میں سے شراب کے دام چھین لے جاتا ہے۔
 بہن کیا انھیں کبھی سمجھ نہ آئے گی؟

رشیدہ : سمجھ ہی آگئی ہوتی تو ایاز جیسے خیر خواہ کو غصے اور جلد بازی میں محض شک پر
 پولیس کے حوالے کیوں کرتے۔ اور اس بے گناہ کو چوری کے جرم میں
 عدالت سے چھ مہینے کا جیل کیوں ہوتا۔ سمجھ ہی آگئی ہوتی تو چوری کے بعد
 بچے ہوئے پانچ ہزار بھی تین ہی مہینے کے اندر جوئے اور شراب میں کھو کر
 کوڑی کوڑی کو محتاج کیوں ہو جاتے۔

مری جانب سے رخ تقدیر کے سورج نے پھیرا ہے
 اسی سے سب کے گھر میں دن، مرے گھر میں اندھیرا ہے

(رشیدہ آنسو بھری آنکھوں سے اندر جاتی ہے۔ لیلیٰ دروازے کی
 طرف بڑھتی ہے کہ انور آجاتا ہے)

- لیلیٰ : کون؟ غریبوں کے مددگار۔ میرے محسن۔
- انور : حیرت۔ تم اور یہاں؟
- لیلیٰ : میں اسی غریب محلے میں، اسی گھر سے ملے ہوئے گھر میں رہتی ہوں اور دن میں ایک دو مرتبہ اپنی پڑوس کی خیریت پوچھنے آجایا کرتی ہوں۔
- انور : تم اس مکان میں رہنے والوں کو کب سے جانتی ہو؟
- لیلیٰ : جب سے میرے پڑوس میں کرائے پر گھر لیا ہے۔ میاں بڑا ہی نا سمجھ لیکن بیوی بے حد نیک ہے۔ مجھے اس کی خدمت سے بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔
- انور : تم تو خود غریب ہو۔ پھر کیا خدمت کرتی ہوگی؟
- لیلیٰ : میرے پاس روپیہ نہیں لیکن انسانیت اور ہمدردی ضرور ہے۔ میں اس کے ہاتھ کی بٹائی ہوئی چیزیں بازار میں بیچ آتی ہوں اور جو کچھ ملتا ہے اسی سے وہ غریب اپنا گزارہ چلاتی ہے۔
- انور : جتنا چہرہ خوبصورت، اس سے زیادہ دل خوبصورت۔ نیکی و رحم کی پتلی، میں اس بے لوث ہمدردی کا اپنی بدنصیب بہن رشیدہ کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔
- لیلیٰ : کیا آپ میری سیکلی رشیدہ کے بھائی ہیں؟ آپ کا نام؟
- انور : دنیا مجھے کہتاں انور کہتی ہے۔ لیکن تمہارے ہونٹوں سے صرف انور سن کر خوش ہوں گا۔
- لیلیٰ : (اپنے آپ سے) کیسا پیارا نام۔ یہ معلوم ہوا کہ کان کے پاس سے بلبل گاتی ہوئی نکل گئی۔
- انور : تمہاری دکھیا سیکلی کہاں ہے؟
- لیلیٰ : ابھی کسی کام سے اندر گئی ہے۔
- انور : تو میں وہیں جا کر مل لیتا ہوں۔ (جاتے جاتے) کوئی میرے لائق خدمت ہو تو یاد کرنا۔ (جاتا ہے)
- لیلیٰ : کتنا فیاض۔ احسان کر کے احسان کا بدلہ کیا شکریہ بھی نہیں چاہتا۔ وہ عورت دنیا میں بڑی ہی خوش نصیب ہوگی جسے اس شریف آدمی کی بیوی بننے کا فخر حاصل ہوگا۔

(الحلی جاتی ہے اور رشیدہ اندر سے باہر آتی ہے)

انور : بہن جب تم شوہر کے ظلم کو ظلم نہیں سمجھتیں تو اس دکھ کو دکھ بھی نہ سمجھتی ہوگی۔

رشیدہ : دکھ کہاں ہے؟ کیا اس ٹوٹے پھوٹے گھر کا نام دکھ ہے۔ کیا اس پھٹے پرانے کپڑے کا نام دکھ ہے؟ ایسا ہے تو پھر دنیا سے دکھ کا مٹ جانا بہت ہی سہل ہے۔ گھر کو ڈھا دو، دکھ ہی مٹ جائے گا۔ کپڑوں میں آگ لگا دو۔ دکھ بھی جل کر خاک ہو جائے گا۔ پیارے بھائی دکھ سکھ سے نہیں جاتا بلکہ سکھ کی خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ میرے دل میں دنیا کی کسی چیز کی خواہش نہیں ہے، اس لیے کوئی دکھ نہیں ہے۔

انور : مصیبت کے بوجھ سے کندھے ٹوٹے جا رہے ہیں۔ پھر بھی کہتی ہو کہ کوئی دکھ نہیں ہے۔

رشیدہ : ہاں کوئی نہیں۔ ذرا بھی نہیں۔

نہ کھانا ہے، نہ کپڑا ہے، نہ زیور ہیں، نہ پیسے ہیں
مگر پھر بھی ہیں خوش جس حال میں ہیں اور جیسے ہیں
زمانے بھر کا سکھ اک لفظ شوہر میں سایا ہے
وہیں دنیا کی راحت ہے، جہاں شوہر کا سایا ہے

انور : بہن میرے زخم پر نمک نہ چھڑکو۔ میں دنیا کے بُرے سے بُرے آدمی کی تعریف سن سکتا ہوں لیکن اس احمق، اندھے، نابکار شوہر کی تعریف سن کر غصے کو ضبط نہیں کر سکتا۔

رشیدہ : بس بھائی بس۔ بیوی کے سامنے شوہر کو ایسے بُرے لفظوں سے یاد نہ کرو۔ وہ کچھ بھی ہوں لیکن میرے لیے بہشت کی امید کی طرح پیارے، مذہب کی طرح پاک اور خدا کے نام کی طرح قابلِ عزت ہیں۔

بہن ہے اور بنے گی دو جہاں میں میری بات اُن سے
یہاں ہے آئندہ اُن سے، وہاں ہوگی نجات اُن سے

اگر معبود برحق کے سوا سجدہ روا ہوتا

تو شوہر ہی خدا کے بعد عورت کا خدا ہوتا

انور : میں اس گھر میں قدم نہ رکھنے کے عہد کو توڑ کر تمہاری محبت سے قصصیں سمجھانے آیا تھا۔ آج فیصلہ کر لیا کہ تم کبھی نہ سمجھو گی۔ قسمت نے تمہاری عقل پر تالا لگا کر اس کی کنجی سمندر میں پھینک دی ہے۔ اچھا یہ لو۔

(انور رشیدہ کو ایک لفافہ دیتا ہے)

رشیدہ : اس میں کیا ہے؟

انور : پانچ سو روپے کا نوٹ۔ اسے وقت اور ضرورت کے لیے رکھ چھوڑو۔

رشیدہ : انور۔ معاف کرو۔ میں ان کی اجازت کے بغیر یہ نوٹ نہیں لے سکتی۔ میری محنت کے پیسے میری ضرورت کے لیے بس ہیں۔

انور : یہ کسی غیر کا روپیہ نہیں ہے۔ رہنے دو۔ وقت پر کھوٹا پیسہ بھی اشرافی کا کام دیتا ہے۔ خدا تم پر رحم کرے۔

(انور جاتا ہے اور رشیدہ روکتی ہے)

رشیدہ : نوٹ لے جاؤ۔ سنو سنو — نہیں لیا — کہاں سے آیا؟ کس نے دیا؟ میرے حکم کے بغیر کیوں لیا۔ ان سوالوں کی بارش کے ساتھ ان کا غصہ گرجے لگا تب کیا جواب دوں گی — خیر سوچوں گی۔ (نوٹ نیچے کے نیچے رکھ دیتی ہے۔ اسی وقت عارف شراب پیے ہوئے آتا ہے) یا خدا بھر دی حالت۔

عارف : نشہ۔ نشہ کس کو نہیں ہے؟ کسی کو دولت کا نشہ ہے، کسی کو خوبصورتی کا نشہ ہے، کسی کو علم کا نشہ ہے، کسی کو حکومت کا نشہ ہے۔ یہ نشے بڑے نہیں تو بڑے کا نشہ کس طرح بُرا ہو گیا — رشیدہ۔

رشیدہ : اب ہمیں کیا کھوں۔

عارف : ادھر آؤ۔

رشیدہ : صبح جب ہاتھ جوڑ کر روتی ہوئی میں تمہارے پیروں پر گر پڑی تھی، تب تم نے میرا سر چھاتی سے لگا کر اور آنسو پونچھ کر وعدہ کیا تھا کہ اب سے شراب نہ پیوں گا۔ اور پھر پی لی — اور — پھر پی لی۔

عارف : ہاں۔

رشیدہ : کیوں؟

عارف : شروع میں بھول سے پی۔ پھر دوستوں کی خوشی کے لیے پی۔ اس کے بعد زندگی کا مزہ سمجھ کر پیتا رہا۔ اور اب غم بھلانے کے لیے پی رہا ہوں۔ نہ پیوں گا تو مصیبت پاگل کر دے گی۔

رشیدہ : لوٹری مالک کو سمجھا سکتی ہے۔ حکم نہیں کر سکتی۔ صبح سے ابھی تک کہاں تھے؟

عارف : جہاں دکھ کی دوا کبھی ہے وہیں۔ اور دوا کے دام لے کر پھر وہیں جاؤں گا۔ لاؤ کچھ روپیہ دو۔

رشیدہ : روپیہ۔

عارف : کہہ دو کہ نہیں ہے۔

رشیدہ : پرسوں بچاری لیلٰی نے گلوبند اور موزے بیچ کر چار روپے لادے تھے۔ جس میں سے ڈیرہ روپے کے گپھوں منگائے۔ دو روپے آج صبح تم لے گئے۔ اب اور روپے کہاں سے آئیں؟

عارف : تو کچھ نہیں ہے؟

رشیدہ : صرف آٹھ آنے باقی رہ گئے ہیں۔

عارف : اچھا تو وہی لاؤ — نہیں سنا کیا؟ — کان بہرے ہو گئے ہیں؟

رشیدہ : گھر میں تھوڑے سے گپھوں ہیں جو آج شام تک ختم ہو جائیں گے۔ یہ پیسے بھی نہ رہے تو کل ہمیں فاقہ کرنا ہوگا۔

عارف : فاقے کا بہانہ کیوں بناتی ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ مجھے شوہر پیارا نہیں، پیسہ پیارا ہے۔

رشیدہ : جھی جھی۔ یہ کیا کہتے ہو۔ تم اگر میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنو تو میں اسے بھی اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ (اٹھنی لا کر دیتی ہے) خفا

ہو گئے۔ یہ لو۔

عارف : قسمت بدل گئی۔ دنیا بدل گئی اور اب یہ دیکھتا ہوں کہ تو بھی بدلتی جا رہی ہے۔ (جانے کے لیے اٹھتا ہے)

رشیدہ : ٹھہرو۔ تم نشے میں کہاں چلے ہو؟

عارف : غم جاگ اٹھا ہے۔ اس کو سلانے کے لیے اور پیوں گا۔

رشیدہ : تو نہیں جانے دوں گی۔ دولت کھو چکے، عزت کھو چکے، اب کیا پی پی کر جان بھی کھو دو گے؟

عارف : ہٹ جاؤ۔ تم کو میرے ساتھ مرنا نہیں پڑے گا۔

رشیدہ : میرے مالک، میرے سرتاج، قسمت کی چھری پر سان نہ دو۔ دیکھو۔ میں پاؤں تھام کر منت کرتی ہوں۔

عارف : میں شراب خانے کے رستے کے سوا سب رستے بھول چکا ہوں۔ پاؤں چھوڑ دو۔

رشیدہ : جیسے مغرور امیروں کی گاڑیاں غریبوں کو کچلتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ ویسے ہی تم بھی مجھے روند کر چلے جاؤ۔ لیکن میں خود سے کبھی یہ پاؤں نہ چھوڑوں گی۔

عارف : یہ التجائیں۔ فرماں برداری کی آڑ میں مرد پر عورت کی حکومت ہے۔

(لات مار کر چلا جاتا ہے۔ رشیدہ سر جھکا کر روتی ہے)

دوسرا ایکٹ - چھٹا سین

راستہ

غانم : چوری کے جرم میں ایاز کو چھ مہینے کا جیل ہونے کے بعد عارف نے غر ہو کر باقی پانچ ہزار بھی میری رائے پر چل کر چند ہی دنوں میں ختم کر دیے۔ اور جس دن روپے ختم ہوئے، اس دن سے میں نے بے رس کام سمجھ کر اس سے ملنا جلنا بھی ختم کر دیا۔ سوچ رہا تھا کہ اب کسی کے ساتھ نیکی کر کے ثواب کماؤں، اتنے میں یہ تازہ مردہ زیاد اپنی قبر ڈھونڈتا ہوا مل گیا۔ پینٹ شریف ہوں تو چند ہی دن میں اس کا بھی کفن تک بچ کے کھا جاؤں گا۔ بھئی واہ۔ میرا نصیب بھی ڈاک گاڑی کا انجن ہے۔ آرام کے جتنکشن کے سوا غریبی اور مفلسی کے انجین پر ٹھہرنا ہی نہیں چاہتا۔

(غانم جانے کے لیے مڑتا ہے۔ سامنے سے شکستہ حالت میں عارف داخل ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے ہیں)

عارف : غور سے کیا دیکھ رہے ہو۔ جس طرح خود غرضی سے تمہاری آنکھیں اور دغا باز دل بدل گیا ہے، اسی طرح مصیبت اور غریبی سے میری صورت اور حالت بدل گئی ہے۔ پھر بھی میں وہی عارف ہوں یہ پہچانا مشکل نہیں ہے۔ البتہ تم وہی غانم ہو یہ پہچانا بہت مشکل ہے۔

غانم : تو میں آج سے ماتھے پر اپنے نام اور پتے کا سائن بورڈ لگا کر پھرا کروں گا۔

عارف : خیال ہے؟ ہم دونوں آج کتنے دنوں بعد ملے ہیں؟
 غنم : کیا خبر۔ میں کیا جیل خانے کا قیدی ہوں جو سزا پانے اور رہا ہونے کی تاریخ یاد رکھوں۔

عارف : غنم۔ جب تک میرے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، تب تک تم کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ اور اب میری صورت دیکھتے ہی اُس سانپ کی طرح جو ڈس کر بھاگنا چاہتا ہو، چھپنے کے لیے بل ڈھونڈنے لگتے ہو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ انسان اتنا دغا باز اور اتنا بے ایمان ہوتا ہے۔

عارف : تو کیا تمہاری یہ مرضی تھی کہ جیسے اندھا اندھے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بھیک مانگتا ہے، ویسے ہی میں بھی تمہارے ساتھ دو اندھوں میں ایک روٹی کی صدا لگاتا پھرتا۔

عارف : شرم کر۔ شرم کر۔ ان لفظوں کو سن کر شیطان بھی اپنے کو انسان سے بہتر سمجھنے لگے گا۔

عارف : دیکھو۔ جس دن ایاز کو چھ مہینے کا جیل ہوا تھا، اس دن تمہاری بیوی نے غصے اور جوش میں مجھے آستین کا سانپ لٹیرا، یار مار، گلا کاٹو سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ جس کا میں ایک دن ضرور بدلہ لوں گا۔ اور آج تم میری عزت اور شرافت کے سر پر چپت لگا رہے ہو۔

عارف : میں تجھے آج کئی روز سے ڈھونڈ رہا تھا۔ تسلی اور مدد مانگنے کے لیے نہیں، صرف یہ کہنے کے لیے کہ جب قدرت کا قانون نیک انسانوں کو بھی ان کی بھول کی سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا، تب تیرے جیسے بدکار اپنی بدی کا بدلہ پانے سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ عنقریب لعنت اور بد دعا کی گھٹائیں تیرے سر پر برسیں گی اور تو تنکے کی طرح گناہ کے پرانوں میں بہتا ہوا دوزخ میں جا کر گرے گا۔ (چلا جاتا ہے)

عارف : دوزخ۔ ہا۔ ہا۔ دوزخ میں بھی پہنچا تو مزہ ہی رہے گا۔ کیونکہ وہاں پہلے ہی سے میرے بڑے بڑے پرانے دوست موجود ہیں۔

(زیادہ مصاحبوں کے ساتھ آتا ہے)

زیادہ : کیوں غانم۔ تمہارا وعدہ کب پورا ہوگا؟ بدلہ لینے کی تدبیر سوچھی؟ حامی بھرنے کے وقت فصاحت و بلاغت خرچنے میں حاتم سے زیادہ نجی اور ایضاً وعدہ کے وقت قارون سے زیادہ کنجوس۔

غانم : تو کیا واقعی یہ غصے کی آگ جو اتنے دنوں سے حقے پر رکھی ہوئی چلم کی طرح سلگ بھی رہی ہے اور دھواں بھی دے رہی ہے، انور کے خون ہی سے ٹھنڈی ہوگی؟

زیادہ : ہاں۔ انور کے خون ہی سے۔

غانم : یہ آخری فیصلہ ہے؟

زیادہ : آخری فیصلہ۔ اس کا سامنا ہونے پر اپنی پچھلی ذلت کا خیال کر کے میری آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے، ہونٹ سوکھ جاتے ہیں، ہر طرف سے نامرد، بزدل، کم ہمت کی آوازیں آ کر کان کے پردے سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ بتاؤ یہ روح کی تکلیف اور دل کی ملامت کہاں تک برداشت کر سکتا ہوں۔ بس یا مجھے ہمیشہ کے لیے یہ شہر چھوڑ دینا ہوگا یا اُسے مرنا ہوگا۔

غانم : مگر جناب اُسے مرنے کا ڈر ہوتا تو فوج میں نوکری ہی کیوں کرتا۔ وہ تو جان کو ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ جیسے میوہ فروش نوکری میں انگور بیچتے پھرتے ہیں۔

زیادہ : پھر؟

غانم : سنیے۔ انسان کو مال سے زیادہ جان اور جان سے زیادہ عزت عزیز ہوتی ہے۔ وہ قییموں اور غریبوں پر اپنا تمام مال بانٹ دے گا۔ ملک اور قوم کے لیے جان قربان کر دے گا۔ لیکن اپنی عزت کبھی دوسروں کو نہ دے گا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جان اور مال سے عزت زیادہ قیمتی چیز ہے۔ آپ کو بدلہ لینا ہے تو جان کے بجائے اُس کی عزت پر حملہ کیجیے۔

- زیاد : اس سے فائدہ؟
- غانم : فائدہ یہ کہ نکوار کے گھاؤ سے ایک منٹ میں مرجائے گا لیکن عزت پر چوٹ پڑی تو اس کو رنج اور شرم سے ہر روز مرنا ہوگا۔
- زیاد : ٹھیک رائے دے رہے ہو۔ لیکن حملہ کا طریقہ؟
- غانم : انور کی سگی بہن رشیدہ جو عارف کو بیانی گئی ہے، اس ملک کی عورتوں میں جوانی اور خوبصورتی کا نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ ایسی جوان جیسے چودھویں کا پورا چاند اور ایسی خوبصورت جیسے موسم بہار کا کھلا ہوا تازہ پھول — آگے کہوں — یا سمجھ گئے؟
- زیاد : چاند کی طرح جوان اور پھول کی طرح خوبصورت۔ سمجھ گیا۔ تم چاہتے ہو کہ خوشبو، رنگت اور رس لوٹ کر اس حسن کے پھول کو تباہ کر دیا جائے۔
- غانم : ہاں یہ خوفناک بدلہ ہے۔ بہن کی بے عزتی کے بعد انور کبھی آپ کے سامنے آنکھیں اوپنی کر کے بات نہ کر سکے گا۔ جس دن رشیدہ کی عصمت تباہ ہوگی، اُس دن انور کی ہمت، زندگی اور خوشی بھی تباہ ہو جائے گی۔
- زیاد : لیکن رشیدہ نہ شوہر سے بے وفا ہے، نہ دولت اور عیش کی حریص۔ پھر کس طرح ہمارے قبضے میں آسکتی ہے؟
- غانم : جہاں دولت اور طاقت کام نہیں دیتی وہاں دھوکا کام دیتا ہے۔ انعام مقرر کیجیے۔ میرا ایک ہی فقرہ اس خوبصورت ہرنی کو بھوکے شیر کے منہ میں پہنچا دے گا۔
- زیاد : اگر تم دھوکا دے کر رشیدہ کو میرے محل میں لے آئے تو میں اس خدمت کے عوض تھیں دس ہزار روپے انعام دوں گا۔

(زیاد جاتا ہے)

- غانم : (اپنے آپ سے) اوہو۔ دس ہزار۔ بے ایمانی کے درخت میں ایک ساتھ اتنے پھل نکل آئے۔ ایمان دار رہتا تو دس نکلے بھی نصیب نہ ہوتے۔

(غانم بھی جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ - ساتواں سین

زیاد پاشا کا محل

(زیاد شراب پی رہا ہے۔ سامنے زرق برق پوشاک میں خوبصورت
نوجوان لڑکیاں ناچ رہی ہیں)

زیاد : گانا، عورت، شراب، یہی تین بیٹھے سر ہیں جن سے زندگی کا راگ پورا
ہوتا ہے۔ اور دل و جذبات کے نغمہ آفریں تصادم کی آواز، روح کی تان،
پھولوں کا الاپ اور ستاروں کا گیت معلوم ہوتی ہے۔

(غانم آتا ہے)

غانم : واہ رے میں۔ لایئے انعام۔ کانا ڈالتے ہی مچھلی پھنس گئی۔

زیاد : پھنس گئی۔ کس طرح؟

غانم : پہلے بھوکی جیب میں انعام کا نوالہ تو ڈالیے۔

زیاد : روچے سائیکل پر بیٹھ کر بھاگے نہیں جاتے۔ کیا تمہیں میرے وعدے پر

بھروسہ نہیں ہے؟

غانم : معاف کیجیے۔ اس شریف زمانے میں لوگوں کا وعدہ شرابی کی توبہ کی طرح پانچ

منٹ میں ٹوٹ جاتا ہے۔ اچھا سنیے۔ میں بے باپ کے بچے کی طرح روتی

صورت بنا کر رشیدہ کے سامنے گیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہا کر....

زیاد : ٹھہرو۔ پتھر سے پانی نہیں آگ نکلتی ہے۔ پھر تمہاری آنکھوں میں آنسو کہاں

سے آئے؟

غانم : رشیدہ کے دل پر اثر ڈالنے کے لیے آنکھوں میں ہنسی ہوئی لال مرچی ڈال لی تھی۔

زیاد : اچھا آنسو بہا کر کیا کہا؟

غانم : میں نے کہا مجھے دیکھ کر غصے اور نفرت سے منہ نہ پھیرو۔ میں صرف تمہاری بے بسی اور بے کسی کا خیال کر کے یہ غم ناک اطلاع دینے آیا ہوں کہ عارف شراب کے نشے میں موثر کے نیچے دب گیا ہے۔ اور ایک رحم دل بیگم جو گاڑی میں اس طرف سے گزر رہی تھیں، اسے زخمی حالت میں اٹھا کر اپنے مکان پر لے گئی ہیں۔

زیاد : تم نے یہ کہا کہ عارف موثر کے نیچے دب گیا ہے؟

غانم : ہاں۔ پھر میں نے کہا کہ آخری دیدار کرتا ہے تو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اس نیک بیگم کے گھر تک چلی چلو۔ دیر کی تو شوہر سے دنیا کے بدلے جنت میں ملاقات ہوگی۔

زیاد : تو کیا وہ شوہر کی محبت میں پاگل ہو کر تمہارے ساتھ چلی آئی؟

غانم : نہ آتی تو میں اسے وفادار بیوی ہی نہ سمجھتا۔

زیاد : میں تمہاری پیٹھ ٹھوکتا ہوں۔ شاباش۔

غانم : ابھی تو آپ سیکڑوں مرتبہ شاباش دیں گے۔ میرے جیسے آدمی گھڑی گھڑی پیدا نہیں ہوتے۔ میں تو مرنے کے بعد قبر کے بدلے عجائب گھر کی الماری میں رکھا جاؤں گا۔

زیاد : تو وہ کہاں ہے؟

غانم : دروازے پر گاڑی میں۔ میں شکار کو لاتا ہوں۔ بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑنے کو تیار رہیے۔

زیزو : (غانم کے باہر جانے کے بعد) کیسا زہری آدمی ہے۔ سانپ کو ڈس لے تو وہ بھی پانی ہو کر بہہ جائے۔

(زیاد آڑ میں ہو جاتا ہے اور غانم رشیدہ کو لے کر آتا ہے)

کلیات آفاشر کا میری - جلد چہارم

رشیدہ : کہاں ہے میرا مالک۔ میرا سرتاج کہاں ہے۔

ہجوم اشک و حسرت سے ہے ایک طوفان آنکھوں میں
دکھا دو شکل کھنچ کر آگئی ہے جان آنکھوں میں

غانم : یہاں ٹھہرو۔ میں بیگم صاحب کو تمہارے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔

(اندر جاتا ہے)

رشیدہ : اف دماغ محوم رہا ہے۔ آسمان و زمین کے بیچ میں ہر چیز اس طرح دکھائی
دیتی ہے۔ گویا چکر کھائے ہوئے دھوئیں کے ڈبیر میں آگ کی چھوٹی چھوٹی
چنگاریاں چمک رہی ہیں۔

کہوں کس سے کہ اس تقدیر نے کیا پامالی کی
تو ہی سنتا ہے یا رب خیر کچھ میرے والی کی

(زیادہ سانسے آتا ہے)

یہ کون؟ وہ بیگم کہاں ہیں؟ یا خدا اس طرح مجھے کیوں گھور رہا ہے؟
زیادہ : (پاس جا کر) ڈر کر پیچھے کیوں ہٹ گئیں؟ اطمینان رکھیے یہ بھی آپ ہی کا
گھر ہے۔

رشیدہ : جناب میں اپنے شوہر کو جو موٹر سے زخمی ہو گئے ہیں، لینے آئی ہوں۔ مہربانی
فرما کر یہ بتائیے کہ وہ کس کمرے میں ہیں؟ — آپ ہنستے کیوں ہیں؟
زیادہ : اس لیے کہ آپ میرے مکان کو زخموں کا اسپتال سمجھ رہی ہیں۔ اس گھر میں
میرے دل کے سوا، جو ان بھڑوں کی تلواروں اور نگاہ کی چھریوں سے گھائل
ہو گیا ہے، اور کوئی زخمی نہیں ہے۔

رشیدہ : تو کیا دفاباز، کمینہ غانم مجھے دھوکہ دے کر یہاں لایا ہے؟

زیادہ : دنیا خود دھوکا ہے۔ اس لیے یہاں کا ہر کام دھوکے ہی سے چلتا ہے۔

رشیدہ : سمجھ گئی۔ آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا دور ہو گیا۔ بد معاش غانم۔ شریفوں

کے آرام و آمد کے دشمن خدا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

(رشیدہ واپس جانا چاہتی ہے۔ زیاد روکتا ہے)

زیاد : ٹھہرو۔ کہاں جاتی ہو؟

رشیدہ : میں اپنے گھر جاؤں گی۔ راستہ چھوڑ دیجیے۔

زیاد : چھوڑ دوں۔ خوب۔ مرتے ہوئے کو زندگی، مفلس کو دولت، فقیر کو بادشاہت مل جائے، تو کیا وہ اُسے چھوڑ دے گا۔ کسی کے اندھیرے گھر میں آسمان سے چودھویں کا چاند اتر آئے تو کیا وہ اسے فوراً لوٹ جانے دے گا؟ ۔

آد بیٹھو۔ نور کی محفل یہ کاشانہ بنے

تم بنو صمیع وفا، دل میرا پروانہ بنے

رشیدہ : خبردار۔ میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا سایہ بھی نہ ڈالنا۔

زیاد : کیوں؟

رشیدہ : یہ گلی گلی عزت بیچنے والی مردار کا ہاتھ نہیں، ایک عصمت دار شریف عورت کا ہاتھ ہے۔ اس ہاتھ کو شوہر کے سوا دنیا کے کسی مرد کو چھونے کا حق نہیں ہے۔ ۔

جب خدا نے جلوہ گاہ آب و گل پیدا کیا

عشق اور ایثار سے عورت کا دل پیدا کیا

باوقا رہتی ہے بیوی زندگی بھر کے لیے

ہاتھ کیا، دل، روح سب ہیں صرف شوہر کے لیے

زیاد : شوہر۔ کون شوہر؟ مفلس شرابی عارف؟ وہی شوہر جو تم سے زیادہ شراب کی

بوتل سے پیار کرتا ہے۔ وہی شوہر جس کی شراب کا قرض ادا کرنے کے

لئے یہ نازک نرم انگلیاں گلوبند اور موزے بنتی اور سونوں سے زنجی ہوتی

ہیں۔ وہی شوہر جس کا پیٹ بھرنے کے لیے چاند سے تراش کر بتائے ہوئے

ہاتھ چکیاں پیٹتے ہیں۔ ۔

وہی شوہر کہ جس کے واسطے پلکیں بھگوتی ہو
وہی شوہر جو ہنس دیتا ہے جب تم دکھ سے روتی ہو
نصیب اپنا خود اپنے آنسوؤں سے کیوں بھگوتی ہو
پڑی ہو خاک میں پر اب بھی تم خوش آب موتی ہو
نہ کھاؤ ٹھوکریں، نکلو اندھیرے سے اجالے میں
مری آغوش میں آجاؤ جیسے چاند ہالے میں

رشیدہ : دیکھو سر کی عزت خدا کے سامنے جھکتے سے، آنکھ کی عزت شرم سے، زبان کی عزت سچائی سے، ہاتھ کی عزت سچاوت سے، پاؤں کی عزت نیک راستے پر چلنے سے اور انسان کے دل کی عزت نیکی و شرافت سے ہوتی ہے جس میں شرافت نہیں وہ دل نہیں۔ اور جس کے پاس شریف دل نہیں وہ انسان نہیں۔

برائی کا برا انجام ہوتا ہے زمانے میں
نہ جل جاؤ کہیں خود دوسروں کا گھر جلانے میں
بدی کا گھر، سیہ کاری کا دوزخ اس کا سینہ ہے
جو تاکے اور کی بیٹی بہن کو وہ کینہ ہے

رشیدہ : زیاد : ایک مرتبہ کا ہارا ہوا داؤں دوسری مرتبہ جیتا جاسکتا ہے۔ اُجلے ہوئے باغ پھر سے ہرے بھرے ہو سکتے ہیں۔ سوکھی ہوئی عذی میں دوبارہ پانی کی باڑھ آسکتی ہے۔ لیکن زندگی، خوبصورتی اور جوانی دوبارہ نہیں مل سکتی۔

یہ نیکی، پارسائی، باوقائی، سب کہانی ہے
اٹھا لو زندگی کا لطف دو دن کی جوانی ہے

رشیدہ : دنیا کی خوبصورتی عزت ہے۔ اور عورت کی خوبصورتی صحت اور شرم ہے۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جو عورت جوان اور خوبصورت ہو، اُسے اپنے آرام کے لیے نیکی اور پارسائی کو ٹھوکر مار دینی چاہیے؟

زیاد : میں تو اسے یہی صلاح دوں گا۔

رشیدہ : یہی صلاح۔ بے شرم اور بدکار بننے کی صلاح؟ اچھا فرض کرو۔ اگر اس وقت

ترکی حور

میری جگہ تمھاری خوبصورت بہن یا جوان بیٹی آکر کھڑی ہو جائے تو تم اُسے
بھی صلاح دو گے کہ دنیا کا عیش خریدنے کے لیے اپنی عزت اور حرمت
دوسرے مرد کے ہاتھ بیچ ڈالو۔ یہی صلاح دو گے کہ بے شرمی اور لعنت کا
طوق گلے میں پہن لو۔ اور نیکی و نیک نامی کے تاج کو ٹھوکر مار دو۔

نظر شوہر کے چہرے کے سوا ہر سو نہ جائے گی
یہ دل وہ پھول ہے جس سے وفا کی بو نہ جائے گی
نہ پاؤ گے دعا، میری کسی بات اور قرینے سے
کہ بچی ہے دودھ کے بدلے شرافت ماں کے سینے سے

شرافت کی قدر فرشتوں کی دنیا میں ہوگی۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں شرافت کو
زیادہ : کون پوچھتا ہے۔ شرافت سے دنیا کا کون سا کام چل سکتا ہے۔ کیا تم
شرافت کے جموٹے سکے سے آٹا چاول خرید سکتی ہو؟ کیا تم روپے کے عوض
شرافت دے کر کپڑا اور زیور مول لے سکتی ہو؟ کیا تم ایٹھ اور پتھر کے
بدلے شرافت کے گارے سے رہنے کا گھر بنا سکتی ہو؟

وہ جینا موت سے بدتر ہے جو وقفِ مصیبت ہے
شرافت کی نہیں انسان کو سکھ کی ضرورت ہے
مری بن جاؤ، پھر جمبولو کی تم راحت کے جمبولوں میں
سدا کھیلا کرو گی بن کے خوشبو سکھ کے پھولوں میں

قاتل دوسرے کا گلا کاٹنے میں، ڈاکو پرائے مال پر ڈاکہ ڈالنے میں، بے رحم
رشیدہ : امیر غریبوں کا حق چھیننے میں اور تمھارے جیسے بدکار لالچ اور فریب سے شریف
عورتوں کی عزت برباد کرنے میں اپنا سکھ سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک وفادار بیوی
ٹوٹے پھوٹے گھر میں گزری گاڑھا پہن کر اور نمک سے سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھا
کر سچی محبت کے ساتھ شوہر کی خدمت کرنے میں اپنا سکھ جانتی ہے۔

وفا میں میرا سکھ، نیکی میرا گنجینہ زر ہے
حیا پوشاک میری اور محبت میرا زیور ہے

غریبی میں بھی ہنس پڑتی ہے نکلی مال والوں پر
مری عصمت کی چادر تھوک دیتی ہے دوشالوں پر

زیاد : جب کوئی ملک فہمائش اور صلح سے تابع نہیں ہوتا، تب اُسے اچانک حملہ
کر کے آگ اور تلواریں سے فتح کیا جاتا ہے۔ اگر تم میری محبت کا نفرت سے
جواب دو گی....

رشیدہ : تو کیا کرو گے؟
زیاد : کیا کروں گا؟ کمزور درخت کے ساتھ آندھی، منجدھار میں پھنس گئی ہوئی کشتی
کے ساتھ طوفان اور چوگرزی بھول گئے ہوئے ہرن کے ساتھ بھوکا شیر کیا
سلوک کرتا ہے؟ -

میں بڑا بے رحم ہوں۔ سمجھیں۔ نہ رہنا بھول میں
دو گھڑی میں رنگ ہی ہوگا نہ بو اس پھول میں

رشیدہ : جا۔ جا۔ میں ان دھمکیوں کو کتے کا بھونکتا سمجھتی ہوں۔
زیاد : ہاں؟

رشیدہ : ہاں۔ عورت کی آمد کو تو نے کیا سمجھ لیا ہے۔ یہ کمزور قوم کی آزادی،
غریبوں کی محنت کا پھل، بے کس کی پونجی نہیں ہے کہ ایک ظالم دھمکی اور
طاقت سے چھین لے۔ -

کب آنکھوں میں خیال وفا بدلا ہے
یہ وہ چراغ ہے جو آندھیوں میں جلتا ہے
مرے گلے میں چھری تیز کر لے تو اپنی
میں جان دوں گی، نہ دوں گی پر آمد اپنی

زیاد : رشیدہ مجھے جبر کے لیے مجبور نہ کر۔ اگر شوہر کے سوا دوسرے مرد کو پیار کرنا
گناہ بھی ہو، تو اس گناہ کو اس اکیلے گھر میں کوئی نہیں دیکھتا۔

رشیدہ : ضرور دیکھتا ہے۔
زیاد : کون؟

رشیدہ : جو سب جگہ حاضر و ناظر ہے۔

قیامت میں کرے گا کس طرح اس سے دو چار آنکھیں
تری ہیں صرف دو لیکن خدا کی ہیں ہزار آنکھیں

زیاد :

تو پھر اچھا وہی ہونے دے جو تیرا ارادہ ہے
مجھے بھی دیکھنا ہے اب کہ کس کی ضد زیادہ ہے

(زیاد زبردستی رشیدہ کا بوسہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ رشیدہ ہاتھ
چمڑا کر اسے ڈھکیل دیتی ہے)

رشیدہ : خبردار۔ اک قدم آگے بڑھایا تو غضب ہوگا۔

زیاد : ترے ان حسن کے پھولوں کا شہد اور میرا لب ہوگا۔

(زیاد دروازے کی طرف بھاگتی ہوئی رشیدہ کو پکڑنے کے لیے
دوڑتا ہے۔ رشیدہ اپنی سلامتی کے لیے کرسی، بوتل، گلدان وغیرہ
اٹھا اٹھا کر زیاد پر پھینکتی ہے۔ زیاد پیچھا کرتا ہے۔ رشیدہ لات
مارتی ہے اور زیاد گرتا ہے۔ اسی بیچ رشیدہ کو زیاد کا پستول دکھائی
دے جاتا ہے۔ جسے لے کر وہ فائر کر دیتی ہے اور زیاد زخمی ہو کر
گر جاتا ہے۔)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ - پہلا سہین

مجاؤنی

(کپتان انور آتش اور جلال نامی اپنے دو فوجی دوستوں کے ساتھ آتا ہے)

انور : ایک کو پھول کا رنگ پسند ہے اور ایک کو خوشبو۔ تم عورت میں خوبصورتی ڈھونڈتے ہو اور میں عورت میں نیکی تلاش کرتا ہوں۔ تم کو خوبصورت چہرہ چاہیے اور مجھ کو خوبصورت دل چاہیے۔

جلال : یار من۔ میں پھر کہوں گا کہ دنیا میں جو کچھ ہے خوبصورتی ہے۔ ثبوت کے لیے اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کو دیکھو۔ سستی ہیں، ٹکاؤ ہیں، مضبوط ہیں، ٹوٹنے اور پرانی ہو جانے پر بھی دس کی خرید ہیں تو دو کو بک سکتی ہیں۔ لیکن شیشے کی الماری اور بکسوں میں بند نہ ہونے کی وجہ سے انھیں کوئی نہیں پوچھتا اور غیر ملک کی بنی ہوئی چیزیں نمائی، بودی اور نکمی ہونے پر بھی لیبل اور خوبصورت پیکنگ کی وجہ سے ہر آدمی کی پسند اور نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ میرا تو یہ قول ہے کہ قسمت خوبصورت نہ ہو، مگر بیوی ضرور خوبصورت ہو۔

انور : نیکی کے بغیر عورت کی خوبصورتی بڑی خوفناک چیز ہے۔ تازہ لال مرچ کیسی خوبصورت ہوتی ہے لیکن کھانے کے بعد آدمی سی سی کر کے ناچنے لگتا ہے۔

آتش : (جلال سے) جس روز سے تم شادی کر کے دوپائے سے چوپائے بنے ہو، اس روز سے آٹھوں پہر لقمہ و نثر میں عورتوں کے حسن کی تھیدہ خوانی کیا

ترکی حور

کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوہر نواز قسمت کی مہربانی سے تمہیں بیوی خوبصورت مل گئی ہے۔

جلال : تو حضرت بارات بھی تو مشطیں جلا کر لے گیا تھا۔ اندھیرے میں بیاہ نہیں کیا جو پری کے بدلے افریقہ کی شیدن میری دم میں نتھی کر دے۔ بیوی خوبصورت نہ ہوتی تو سسر پر شادی کے خرچے کی ناش کر دیتا۔

اتمش : شاباش۔ داماد ایسا ہی نالائق ہونا چاہیے۔ (انور سے) یہ تو دو مہینے ہوئے شادی کر کے بے فکرے ساڑ سے کولہو کے تیل بن چکے۔ اب تم کب گھر بسانے کی تیاری کرو گے؟

انور : جس دن پسند کے لائق بیوی مل گئی۔

جلال : بھائی صاحب۔ پسند اور ناپسند کے پھیر میں آدمی زندگی بھر کنوارا رہ جاتا ہے۔ بیوی بھی کیا کوئی گھوڑی ہے جو چال اور دانت دیکھ کر خریدو گے۔

انور : شادی گڑیا گڈے کے بیاہ کی نقل نہیں، جوانی کا کھیل، زندگی کا سرسری تماشا۔ انسانی ہستی کا عظیم ترین انقلاب اور مستقبل کو بہتر یا بدتر بنانے والا حالات و واقعات کا آغاز عمل ہے۔ اس لیے شریک زندگی کے انتخاب میں حسن پسند نگاہوں کی رائے کے بدلے انجام ہیں عقل کے مشورے پر کام کرنا چاہیے۔ اگر شادی کی دعوت کھانی ہو تو دعا کرو کہ خدا مجھے ایسی بیوی دے.....

جلال : (ہات کاٹ کر) جو خوبصورت اور مال دار ہو۔

انور : نہیں۔ جو نیک سیرت اور نیک کردار ہو۔

اتمش : تو یہ کہو کہ دعوت کھلانے کا ارادہ نہیں ہے (جلال سے) چلو بھائی کسی قال والے سے پوچھیں کہ ایسی لڑکی کس خوش نصیب باپ کے گھر میں پیدا ہوئی ہے۔

(دونوں ہنستے ہوئے ایک طرف کو جاتے ہیں۔ دوسرے جانب سے ایک سپاہی آتا ہے)

سپاہی : جناب والا۔ ایک نوجوان شریف لڑکی جس کا مسکن اسلام پور اور نام لیلیٰ ہے، آپ کی خدمت میں باریابی چاہتی ہے۔
انور : لیلیٰ اور اتنی دور کا سفر۔ اسے یہاں کوئی ضرورت لائی ہے یا میرا خیال۔
کاش آخری وجہ ہو۔ (سپاہی سے) آنے دو۔

(سپاہی باہر جاتا ہے)

(خود کلامی) حسن، نیکی، عصمت اور خودداری، ان چاروں کو الگ الگ نام سے پکاریں گے۔ اگر ایک نام سے پکارنا ہو تو وہ نام صرف لیلیٰ ہے۔ کتنی شریف اور کتنی دل فریب۔ جب اسے دیکھتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ خوبصورتی اور پاکیزگی دو معصوم بچوں کی طرح ایک دوسرے کے گلے میں بائیں ڈال کر سامنے کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ اور وہ جب گفتگو کے لیے اپنے نازک ہونٹوں کو جنبش دیتی ہے، اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوگفتہ پھول کی خوش رنگ پتھری پر موسیقی رقص کر رہی ہے۔

(لیلیٰ کمرے میں داخل ہوتی ہے)

لیلیٰ : میرے محسن اپنی ادنیٰ کنیز کا نیاز مندانہ سلام قبول کیجیے۔
انور : نیک لیلیٰ۔ خوش آمدید۔ تمہاری زیارت سے حشاق دیدار دل کو اتنی ہی مسرت ہوئی جتنی پانی سے بھرے بادلوں کو دیکھ کر سوکھے کھیت کے کنارے بیٹھے ہوئے دل شکستہ کسانوں کو خوشی ہوتی ہے۔ کھو میری کس خدمت کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے تم نے تن تھا اچھے بڑے سفر کی زحمت گوارا کی۔

لیلیٰ : شوہر کی فکر اور دن رات کی محنت سے بد نصیب رشیدہ کے چہرے کی تازگی اور دل کی خوشی تو مدت ہوئی ختم ہو چکی۔ اب اس کی تندرستی بھی ایک ایک قدم قبر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس لیے میں یہ کہنے آئی ہوں کہ اگر آپ کے دل میں بہن کی محبت اور اس کی مصیبت کے لیے رُم موجود ہے تو ایک

ترکی جد

مرتبہ پھر سمجھا بجا کر گھر لے جانے کی کوشش کیجیے اور اس غریب کو قبل از وقت موت سے بچا لیجیے۔

انور : وہ شوہر کی محبت میں پاگل ہو رہی ہے۔ میں اُسے لاکھ سمجھاؤں، پہاڑ سے گرتی ہوئی پانی کی چادر کی طرح اپنے رستے سے کبھی واپس نہ لوٹے گی۔

لیلی : درخت انسان لگاتا ہے۔ اور ہوا پانی روشنی کے ذریعے سے پھل پھول خدا پیدا کرتا ہے۔ آپ کوشش کیجیے اور نتیجہ کو اُس کارساز پر چھوڑ دیجیے۔

انور : سورج کا زمین کے گرد گھومتا ممکن ہے۔ لیکن بہن رشیدہ کے خیال کا بدلنا بالکل ناممکن ہے۔ پھر بھی تم امید بندھاتی ہو تو اچھا۔ ایک بار اور کوشش کروں گا۔

لیلی : لیکن کب؟ کس دن؟ کیا گھر جل چکنے کے بعد پانی لے کر پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔ اگر اپنے فرض کا احساس ہے تو آپ کو آج ہی سب سے پہلی

ٹرین میں اسلام پول روانہ ہو جانا چاہیے۔

انور : بہتر ہے۔ میں آج ہی روانگی کا انتظام کروں گا۔ لیکن ایک شرط ہے۔

لیلی : شرط۔ وہ کیا؟

انور : تم نے یہاں تک آنے میں جو تکلیف برداشت کی ہے اس کے شکریے میں قصص ایک ناچیز تحفہ نذر کرنا چاہتا ہوں۔ قول دو کہ وہ تحفہ قبول کروگی۔

لیلی : بڑی خوشی اور فخر کے ساتھ۔

انور : تو میں سچائی، وقاداری اور محبت سے بھرا دل پیش کرتا ہوں۔ کہو کہ میری زندگی کے ساتھی میں نے قبول کیا۔ سر جھکا کر چپ کیوں ہو گئیں؟

لیلی : دنیا میں نیکی و محبت کی قدر نہیں۔ خاندان، خطاب اور دولت کی قدر ہے۔ جب میرے اور آپ کے درمیان امیری اور غریبی کے دو سمندر موجیں مار

رہے ہیں تب ہم کس طرح اس زندگی میں ایک ہو سکتے ہیں؟

انور : شادی کے پاک رشتے سے بندھ کر۔ اس طرح۔

(انور بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ لیلی خاموش ہو جاتی ہے۔ دونوں

گاتے ہیں)

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

اے میرے جیون ادھار۔

ان چمن پہ نثار۔

جھین لیو من جاوو ڈار کے۔

چتون من ہر گئی۔ سدھ بدھ بر گئی۔

چندر کھ نہار کے۔

من میں تھرو پریم بست ہے۔

نہن میں صحب پیاری۔ رسیلی۔ نیاری۔

پریم پیالہ پی گئی میں ہو گئی متواری۔

ساجن باندھ لیو بندھن۔ میں پیار کے۔

اے میرے جیون ادھار...

تیسرا ایکٹ - دوسرا سین

قید خانہ

(ایاز دو قیدیوں کے ساتھ آتا ہے)

ایاز : سچ یار۔ جیل بھی بڑی دلکی کی جگہ ہے۔ جب قیدیوں کا غول پاؤں کی بیڑی اور کڑے چمن چمن بجاتا ہوا چلتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موچوں والی عورتوں کی فوج جرمی سے لڑنے جارہی ہے۔

قیدی ۱ : اچھا تو یہ کہو تم نے جیل خانے کا کیا نام رکھا ہے؟

ایاز : سنو سرکاری آدمی اسے جیل کہتے ہیں۔ شریف لوگ اسے دنیا کا جہنم کہتے ہیں۔ گھڑی گھڑی یہاں آنے والے بد معاش اسے اپنی سرال کہتے ہیں۔ اور میں اسے آدمی کا طویلہ کہتا ہوں۔

قیدی ۲ : طویلہ۔ تو کیا یہاں قیدیوں کے بدلے گھوڑے گدھے بندھے ہوئے ہیں۔

ایاز : ارے بھائی۔ قیدیوں سے گھوڑے گدھوں کی قسمت بھی اچھی ہوتی ہے۔ کیونکہ کمزور گدھے کو لادی اٹھانے کے بدلے چلی بیٹنی اور گھوڑوں کو گھاس کھانے کے بدلے گھاس کاٹی نہیں پڑتی۔

قیدی ۲ : کہتے تو ٹھیک ہو۔

ایاز : دعا کرو کہ اگر چھوٹنے کے بعد پھر تمہاری قسمت میں جیل آنا لکھا ہو تو اب کی آدمی کی جون کے بدلے گھوڑے گدھے کی جون میں آؤ۔

قیدی ۱ : دوست تمہاری ہنسی کی باتوں میں قید کی تکلیف بھی گدھے کے سینک کی طرح اُڑن چھو ہو جاتی ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ تم اڑتالیس گھنٹے کے

بعد پھر سے اڑ کر جیل کا جھرا خالی کر دو گے۔

ایاز : ہاں دوست۔ میں صرف چھ مہینے کے لیے جیل کی مٹی ملی ہوئی روٹی اور پانی سے بھکاری ہوئی بے نمک کی بھاجی کھانے آیا تھا۔ دو دن رہ گئے ہیں اگر کل رات تک میاں ملک الموت نے کٹھری کی چھت سے چھاتی پر کود کر سوتے میں گلا نہ دبا دیا تو پرسوں اپنا کیل اور تھالی کسی نئے مہمان کے لیے چھوڑ کر اس سرکاری مسافر خانے سے رخصت ہو جاؤں گا۔

قیدی ۲ : چھ مہینے ہی رہتا تھا تو جیل آنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ تم تو گویا جیل کے کھانے کا نمک چکھنے آئے تھے۔

ایاز : تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی اسی طرح جیل میں پڑا رہوں جیسے لوگوں کا دل ٹھوڑوڑ کی ٹیپ میں پڑا رہتا ہے۔

قیدی ۱ : وہ دیکھنا سامنے سے کوئی نیا قیدی آرہا ہے۔

قیدی ۲ : چلو جیل کی برادری میں ایک اور ممبر بڑھا۔

(غانم سپاہیوں کے ساتھ قیدی کے لباس میں آتا ہے)

ایاز : یہ کون؟ غانم۔ مسٹر شیطان کے ایڈی کا نمک۔ آئیے آئیے۔ نئے تماشے کے اشتہار کی طرح ہم تو آپ کے آنے کا راستہ ہی دیکھ رہے تھے۔

افسر : دیکھو نمبردار۔ اس کو چکی خانے لے جاؤ۔ یہ بہت دبلا چلا آدمی ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب نے رحم کر کے حکم دیا ہے کہ اس سے صرف ہانسیں سیر گیچوں روز پھولائے جائیں۔

ایاز : جمدار صاحب۔ اس کو چکی کے عوض کولہو پر دیجیے۔ اس لیے کہ اس نے جیل کے باہر بہتوں کی دولت کا تیل نکالا ہے۔ یہاں گھانی میں اس کا تیل لکنا چاہیے۔

افسر : دیکھو یہ نیا آدمی ہے۔ خوش قسمتی سے پہلی بار جیل آیا ہے۔ اگر پاؤ آدھ پاؤ کم پیسے تو سختی نہ کرنا۔

ایاز : ہاں۔ میں بھی یہ صلاح دیتا ہوں۔ کام برابر نہ کرے تو بہت نری سے دس

ترکی حور

پانچ گالیاں دے دینا اور نہایت مہربانی کے ساتھ دس بیس لائیں اور سو دو سو گھونٹے لگا دینا۔

افسر : ٹھیک ہے۔ بہت نیک رائے دے رہا ہے۔

ایاز : جمہدار صاحب۔ لوگ دنیا میں جگے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تو ماں کے پیٹ ہی سے شرافت کا کوٹ پتلون پہنے پیدا ہوئے ہیں۔ پھر یہ دس نمبر کے حلال زادے جیل میں کیسے آئے۔

افسر : ناظم نامی ایک مجڑے ہوئے رئیس نے کسی بے وقافی پر جل کر شمیم رٹھی کی ناک کاٹ لی۔ اور اس نے اس کٹی رٹھی کا بدلہ لینے کے لیے دانت سے ناظم کی ناک کا صفایا کر دیا۔ انھیں دو ناکوں کے بدلے میں اسے کان پکڑ کر دو برس کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

(افسر چلا جاتا ہے)

قیدی ۱ : دیکھو سکندر، تیمور، نپولین دنیا میں بڑے بڑے بہادر گذرے ہیں۔ مگر تم ان سب سے زیادہ بہادر ہو۔ کیونکہ انھوں نے اپنے دشمنوں کا سر کاٹا ہے اور تم نے ناک کاٹی ہے۔ بہادر قیدی۔ میں تمام قیدیوں کی طرف سے تمہیں جیل آنے کی مبارک باد دیتا ہوں۔

ایاز : تمہارے آنے سے اندھیرے جیل میں روشنی ہوگئی۔ لیکن بڑھاپے میں بچارے شیطان کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ تو یہ سمجھتا ہوگا کہ میرا پالا پوسا اکلوتا بیٹا مر گیا۔

عائم : افسوس۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ گناہ کے جج سے ہمیشہ مبراہی اور ذلت ہی آگتی ہے۔ بے اصول زندگی یار ماری اور رٹھی کی دوستی کا بھی نتیجہ ہے۔

ایاز : عالی جناب جیل تحریف لانے کا رنچ نہ کیجیے۔ اگر اس لمبی ناک پر آنسوؤں کی بوند دکھائی دے گی تو لوگ کہیں گے کہ جاپانی کتے کی دم میں کچڑ لگی ہوئی ہے۔

عائم : تو آدمی ہے یا بچہ۔ پہلے مجھے دیکھ کر مسکراتا بھی نہ تھا اور آج بتیسی نکال

کلیات آغاشر کا میری - جلد چہارم

کر میری مصیبت پر ہنستا ہے۔

ایاز : تو مسٹر رحم دل۔ تو آپ کیا دوسروں کی مصیبت پر رویا کرتے تھے — بیٹا

اب قسمت کے اڑنگے میں آئے ہو۔ دو برس کے اندر قیدیوں کے ہاتھ سے

جوتے کھاتے کھاتے کھوپڑی آنا چھاننے کی جھلنی بن جائے گی۔

قیدی ۲ : چلی بیگم بلائیں لینے کے لیے یاد کر رہی ہیں — چلو بڑھو۔

غانم : او خدا — یہ دو برس کیسے کشیں گے؟

ایاز : چلی پیٹے اور بھگی کے ہاتھ سے جھاڑو کھاتے۔

(سب جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ - تیسرا سین

عارف کا گھر

(رشیدہ بیمار زمین پر چنگ کی پٹی کے سہارے بیٹھی ہے۔ پاس ہی عارف افسردہ بیٹھا ہے)

عارف : (خود کلامی) جب کتاب زندگی کے ورق الٹا کر اس کے ابتدائی صفحوں میں بدبختی کی خبر کا مبتدا اور تباہی کے معلول کی علت تلاش کرتا ہوں۔ جب اشک بار حال اور تجسم ریز ماضی کو پہلو بہ پہلو رکھ کر زندگی کے تدریجی انقلاب پر نظر ڈالتا ہوں، جب خود کو شراب کے نشے میں آوارہ گرد مجرم کی طرح گلی گلی بسکتے، بیمار بیوی کو دوا اور غذا کے بغیر بھری جوانی میں سسک سسک کر مرتے، راستہ چلتوں کو اپنی ذلیل حالت پر ہنستے، عزیزوں اور دوستوں کو نظر بچا کر اپنے پاس سے نکل جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ تب ہی چاہتا ہے کہ ان تمام شراب کے کارخانوں کو جو اپنی جبینیں بھرنے کے لیے ملکوں قوموں اور گھرانوں کو تباہ کر رہے ہیں، آگ اور بارود سے اڑا دوں۔ اور ان پاجیوں کو جو اپنے نفع اور حرے کے لیے دوسروں کو شراب پینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ملت مار کر خدا کی خدائی سے باہر کر دوں — دنیا میں جگہ، قلم، دبانے جتنی جانوں کا نقصان نہیں کیا، اُس سے زیادہ زندگیاں اس شراب نے برباد کر دی ہیں۔ قدرت کے منشاء آفرینش کے خلاف اتاج اور پھلوں کو سزا کر خمار اور عرق کی شکل میں تبدیل کر دینا، یہ دماغ کی طاقت ایجاد کا بدترین استعمال اور دنیا کی دریافتوں میں مہلک ترین دریافت

ہے۔ جس نطفہ شیطان نے شراب الہام کی وہ یقیناً گناہ کا پہلا فرزند اور نسل انسانی کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ شراب جسم کا سایہ نہیں جس کو اپنے سے دور کر دینا ناممکن ہو۔ مذہب نہیں جس کا ترک کر دینا گناہ ہو۔ اناج اور پانی نہیں جس کے چھوڑ دینے کا نتیجہ موت ہو۔ پھر بھی صرف چند منٹ کی مصنوعی مسرت کے لیے بدبخت انسان اس غیر ضروری اور ناکارہ شے کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میری بھی یہ حالت ہے۔ اُف کیسی عبرت ناک حالت۔ جس طرح قوی بیکل مگر مجھ دریا تیر کر پار جاتے ہوئے آدمی کا پیر پکڑے اور پوری طاقت صرف کر دینے پر بھی اسے کنارے کی طرف نہ جانے دے، اسی طرح شراب نے مجھے اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ اس سے بھاگنا چاہتا ہوں اور نہیں بھاگ سکتا۔ ہر روز چھوڑ دینے کا ارادہ کرتا ہوں اور نہیں چھوڑ سکتا۔ جیب کی نقدی اور بوتل کی شراب دونوں ختم ہو چکیں۔ لیکن نشہ کی لاؤ لاؤ ختم نہیں ہوئی۔ چلوں۔ کلال کی خوشامد کروں۔ ممکن ہے کہ ہمیشہ کا گاہک سمجھ کر ادھار دے دے۔

(عارف جاتا ہے۔ رشیدہ دیرے دیرے اُٹھتی ہے)

رشیدہ : (خود کلائی) پہلے سر میں درد ہوا۔ پھر بخار آنے لگا اور اب دھیمی دھیمی کھانسی بھی شروع ہو گئی ہے۔ بیماری اور فکروں نے جو تک کی طرح بدن کی نس نس کو طاقت اور لہو سے خالی کر دیا ہے۔ دو قدم چلنا دو کوس کی مسافت معطوم ہوتی ہے۔ پانی کی لہر کی طرح ہمت کر کے اُٹھتی ہوں اور دو ہی منٹ میں بے دم ہو کر گر پڑتی ہوں۔

(عارف خصے میں کھولتا آتا ہے)

عارف : لالچی، خود غرض، مجھے وہم بھی نہ تھا کہ طوطے کی طرح آنکھیں پھرا کر صاف جواب دے دے گا۔

رشیدہ : کس پر ناراض ہو رہے ہو؟ کہاں گئے تھے؟

عارف : کلال سے شراب اُدھار مانگتے گیا تھا۔ لیکن اس پاجی نے کہا کہ قرض دینے سے روپیہ بھی جاتا ہے اور دوستی بھی۔ نقد لاؤ۔ میں اُدھار نہیں دوں گا۔

رشیدہ : جب تم شراب مانگنے کے لیے گھر سے نکلے، اس وقت تمہیں یہ خیال نہ آیا کہ میں اپنے کو ذلیل کرنے جا رہا ہوں۔

عارف : اس میں ذلت کی کون سی بات تھی۔ شراب والے سے شراب اُدھار مانگنے گیا تھا، اُس کے پاس بھیک مانگنے نہیں گیا تھا۔

رشیدہ : ادھار اور بھیک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں حالتوں میں مسکین صورت بنا کر دوسرے آدمی کے سامنے گزرنا اور ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے — چھوڑ دو چھوڑ دو۔ میرے پیارے۔ اب بھی انسان کو حیوان اور آباد گھر کو ویران بنانے والی شراب چھوڑ دو۔ دیکھو۔ بیویاں اپنے شوہروں سے آرام مانگتی ہیں، کپڑے مانگتی ہیں، زیور مانگتی ہیں، لیکن میں نے بیاہ کے دن سے اب تک تمہارے پیار کے سوا کچھ نہیں مانگا۔ آج ان قدموں میں بیٹھ کر اور دامن پھیلا کر تم سے شراب چھوڑ دینے کی بھیک مانگتی ہوں۔ کہو کہو۔ کیا تم اس بھکارن رشیدہ کو یہ بھیک نہ دو گے؟

عارف : رشیدہ اشو۔ میں بچہ، جاہل، پاگل نہیں، سب سمجھتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ اتنا آگے بڑھ گیا ہوں کہ پیچھے لوٹنا ناممکن معلوم ہوتا ہے (سر پکڑ کر) اُف کتنا درد۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ کیا تمہارے پاس چار آنے پیسے بھی نہیں ہیں؟

رشیدہ : میں نے قسم کھائی۔ پھر بھی اعتبار نہ آیا۔ چند آنے پیسے کیا، دنیا کی بادشاہت کے لیے بھی تمہاری جھوٹی قسم نہ کھاؤں گی۔

(کنزوری کی وجہ سے سر تھام کر ایک اسٹول پر بیٹھ جاتی ہے)

عارف : (اپنے آپ سے) یہ ہمیشہ نیکی کے نیچے پیسے رکھا کرتی ہے۔ دیکھوں شاید بھول میں کچھ آنے پڑے رہ گئے ہوں (نکیہ الٹ کر دیکھتا ہے تو پانچ سو کا نوٹ نکلتا ہے) یہ کیا؟ پانچ سو کا نوٹ؟ جس محتاج عورت کو تن ڈھانکنے بھر

کپڑے اور پیٹ بھرائاج کا بھی سہارا نہیں، اس کے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے۔ سمجھ گیا۔ نیکی کا طمع اڑ کر بے وفا دل کا کھوٹ ظاہر ہو گیا۔ دولت۔ دولت۔ آج میں نے مان لیا کہ جس طرح تو سونے چاندی سے بازاری عورتوں کی عصمت مول لے سکتی ہے، اسی طرح گھر کی چار دیواری میں رہنے والی بیویوں کی پارسائی بھی خرید سکتی ہے۔

رشیدہ : سر کا درد بڑھ جائے گا۔ دماغ کو آرام دو۔ اتنا کیا سوچ رہے ہو؟
عارف : سوچ رہا ہوں کہ اندھیرے میں چھری مارنے والے دشمن اور پارسا بن کر بے وفائی کرنے والی بیوی دونوں میں سے کون زیادہ قاتل ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ شیطان کی روح اور عورت کا دل دونوں میں سے کون زیادہ ناپاک ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ عارف کی بیوی رشیدہ اور بازار کی بیسوا دونوں میں کون زیادہ کمینہ ہے۔

رشیدہ : یہ کیا۔ بے انتہا نشے اور حد سے گذرے ہوئے غصے میں بھی جس زبان سے کبھی تو کر کے نہیں پکارا۔ آج اسی زبان سے رشیدہ کے لیے گالیاں نکل رہی ہیں۔ کیا مجھ سے محبت اور خدمت میں کوئی کمی یا ایک شریف عورت اور شریف بیوی کا فرض ادا کرنے میں کوئی قصور ہوا ہے؟

عارف : چاند کی پوری روشنی اندھیری رات میں، عورت اور بیوی کی خوبیاں غریبی اور مصیبت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جو دکھ کے وقت طوفان میں چٹان کی طرح نیکی پر قائم نہیں رہتی۔ اُسے اپنے کو عورت اور بیوی کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قصور مجھ سے پوچھتی ہو۔ مجھ سے نہیں، اپنے بے وفا دل سے پوچھ اور دل دوسرے کے پاس ہو تو اس کے دیے ہوئے نوٹ سے پوچھ۔

رشیدہ : (نوٹ دیکھ کر) انور کا نوٹ۔ جو خوف تھا وہی ہوا۔
عارف : تو تو گلے میں ہانپیں ڈال کر اور قسم کھا کر کہتی تھی کہ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہاں سے آیا۔ چپ کیوں ہو گئی؟ جواب دے۔ (پاس پڑی ہوئی بھری اٹھا کر) حرام زادی۔ بول۔ مرنے سے پہلے تجھے اپنے گناہ کا اقرار کرنا ہوگا۔

ترکی حور

رشیدہ : میرے پیارے وہم نہ کرو۔ میرا اتنا ہی قصور ہے کہ تمہاری ناراضگی کے خوف سے آج تک ظاہر نہیں کیا۔ یہ نوٹ میرے بار بار انکار کرنے پر بھی ضد کر کے انور دے گیا ہے۔

عارف : اپنے برہنہ گناہ پر بھائی کے نام کا پردہ ڈالتی ہے۔ گھر، سکھ، دولت، سب کچھ کھو دینے کے بعد میرے پاس صرف بیوی کا پیار رہ گیا تھا۔ تو نے وہ بھی دیگر کو دے کر آج مجھے پوری طرح کنگال کر دیا۔ بے حیا، فاحشہ جس دل میں تو نے غیر کی محبت کو جگہ دی ہے اس دل میں میری بھڑی کو بھی جگہ دینی ہوگی۔ شرم اور عصمت مرگئی۔ تب تو بھی مر۔

(عارف چھری سمجھ کر رشیدہ پر وار کر دیتا ہے)

رشیدہ : اُف۔ خدا انھیں معاف کر۔

(رشیدہ گر کر بیہوش ہو جاتی ہے اسی وقت لیلیٰ اور انور آتے ہیں)

انور : میرے خدا۔ میں کیا دیکھتا ہوں۔ (رشیدہ کے قریب جا کر) یہ کیا۔ خون۔ قتل۔

لیلیٰ : (جھنجھوڑ کر) رشیدہ۔ رشیدہ۔ آہ کچھ نہیں۔ مار ڈالا۔ ظالم شرابی شیطان نے دنیا کی حور کو مار ڈالا۔

انور : بے رحم، وحشی حیوان یہ کیا کیا؟ اس خون کی قیمت تجھے اپنے خون سے ادا کرنی ہوگی۔ (گریاں پکڑ کر)۔

بلا رہی ہے جہنم کی راہ صاف تجھے

خدا کی مار جو اب میں کروں معاف تجھے

لیلیٰ : معافی۔ اس سنگ دل کو معافی۔ اس کو معاف کرنا دنیا کے بے رحم شوہروں کو غریب بیویوں پر ظلم کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ میں ابھی پولیس کو بلا کر لاتی ہوں۔ اس کے رہنے کی جگہ عورت کا پاک دل نہیں۔ پھانسی کی کوٹھری ہے۔

(جوش میں پولیس کو بلانے جاتی ہے)

کلیات آغا شہر کاٹھیری - جلد چہارم

انور : بول خونی بول۔

جک کے چیتے جی نہ ان قدموں سے جس کا سر اٹھا
کس طرح اُس باوقا کے قتل پر غنجر اٹھا
زندگی کے سارے شکھ ملتے تھے جس کی چھاؤں سے
تو نے اُس نخل دقا کو روند ڈالا پاؤں سے

عارف : باوقا بیوی شوہر کے بے وفا ہو جانے پر اپنے لیے امیر عاشق تلاش نہیں
کرتی۔ عورت کی آبرو جو شوہر کی امانت ہے، روپے لے کر غیر مرد کو نہیں
دیتی.....

انور : تو کیا اُس نے ایسا کیا؟

عارف : ہاں۔

انور : ثبوت؟

عارف : یہ پانچ سو کا نوٹ۔

انور : جلد باز احمق۔ یہ نوٹ تو خرچ کی تکلیف دیکھ کر میں زبردستی دے گیا تھا۔
یقین نہ ہو تو نوٹ کی پشت پر دیکھ میرا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ (عارف کے
ہاتھ سے چھری چھٹ کر گر جاتی ہے)۔

لہو رو کر خدا سے شکوہ بیداد کرتے ہیں
کھلے ہیں زخم کے منہ سن کہ کیا فریاد کرتے ہیں

(لیلیٰ پولیس کو لے کر واپس آتی ہے)

لیلیٰ : وہ رہا قاتل۔ یہ دیکھو اس چھری سے خون ہوا ہے۔

افسر : مقتول، گواہ، ثبوت سب موجود ہیں۔ مجرم کو پھنکڑی لگاؤ۔

(پاسی عارف کو پھنکڑی لگاتے ہیں)

انور : (افسر سے) دیکھیے دیکھیے۔ اس ناشکرے انسان کو دیکھیے۔ اس سونے کی پتلی

ترکی حور

نے جو زمین پر ٹوٹی پڑی ہوئی ہے۔ امیر باپ کی لڑکی ہو کر شوہر کے لیے
فقیری اختیار کی۔ زندگی اور جوانی کے شکھ چھوڑے۔ قاتلے کیے۔ چکیاں
بائیں اور اس شریف نما کینے نے اس کی محبت اور خدمت کا یہ بدلہ دیا۔ ۔

بلاوت نے جلا دے دی ہے شمشے کے گھینے میں

وگر نہ شرم ہے دل میں، نہ دل ہے اس کے سینے میں

لیلیٰ : دیکھو۔ دیکھو۔ یہ ہوش میں آ رہی ہے۔

رشیدہ : (ہوش میں آ کر) معاف کرو۔ میرے پیارے معاف کرو۔ (آنکھ کھول کر)

یہ گھر میں پولیس کیسی؟ ارے یہ کیا۔ انھیں کیوں گرفتار کر لیا ہے؟

انسر : خون کے جرم میں۔ تم بچ گئیں تو بھی اسے سخت سے سخت سزا ملے گی۔

رشیدہ : سزا ملے گی۔ میرے سرتاج کو۔ میرے شکھ سہاگ کے مالک کو۔ کس لیے؟

انسر : اس لیے کہ اس نے جان لینے کے ارادے سے تمہیں چھری ماری ہے۔

رشیدہ : چھری ماری۔ انھوں نے کس وقت، کس نے دیکھا۔ نہیں جھوٹ ہے۔ انھوں

نے مجھے چھری نہیں ماری۔

لیلیٰ : بہن بہن یہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیا ابھی تک محبت کا پاگل پن نہیں گیا؟

انسر : اگر طرم نے چھری سے وار نہیں کیا تو پھر تم کس طرح گھائل ہوئیں۔

رشیدہ : بیماری اور کمزور کی وجہ سے مجھے چکر آ گیا تھا۔ چھری زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

اُسی کے اوپر گری، اور زخمی ہو گئی۔

انور : اس کی بات کا یقین نہ کیجیے۔ اس زمانے میں امیروں کی پڑھی لکھی آزاد

لڑکیاں شکھ اور دولت کے لیے بیاہ کرتی اور شوہر کو اپنا مجازی خدا سمجھنے کے

بدلے صرف دل بہلانے والا ساتھی سمجھتی ہیں۔ لیکن پڑھی لکھی لڑکی ہونے پر

بھی یہ ان میں سے نہیں ہے۔ اس کے دل کا ذرہ ذرہ خاوند کی محبت سے

لبریز ہے۔ اس لیے یہ وفاداری کے چوڑے میں شوہر کی جان بچانے کے لیے

جھوٹ بول رہی ہے۔

انسر : میں بھی سمجھتا ہوں۔ مگر کچھ نہیں کر سکتا۔ جھڑی کھول دو۔ جیسے شمشے کا فانوس

آدمی میں چراغ کو بجھنے نہیں دیتا ویسے ہی وفادار بیوی کی محبت شوہر پر کوئی
آج آنے نہیں دیتی۔ مبارک ہے وہ ملک جو اس بدکاری اور آزادی کے
زمانے میں بھی نیکی اور صحت کے پھولوں سے مہک رہا ہے۔ اور مبارک
ہیں وہ مائیں جن کی کوکھ سے ایسی شریف اور نیک لڑکیاں جنم لیتی ہیں۔

(انسر سپاہیوں کے ساتھ دائیں چلا جاتا ہے)

انور : دیکھ دیکھ۔ اپنے ظلم اور اس کی محبت کو دیکھ۔ نالائق بیٹے کو باپ دل سے دور
کر دیتا ہے۔ نالائق بھائی کو بھائی ترک کر دیتا ہے۔ نالائق آدمی کو اس کے
بچپن کے ساتھی اور جوانی کے دوست چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن ایک وفادار بیوی
ہی کی ذات ہے جو عشق بچپاں کی نازک تیل کی طرح بُرے سے بُرے
شوہر کے قدموں سے لپٹی رہتی ہے۔

تو نہیں سنتا کسی کی تھک گئے سب بول کر

حاصل دماغی پر نظر کر اب بھی آنکھیں کھول کر

عارف : کھل گئیں۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ اے دولت اور تندرستی کے دشمن۔ اے
ذلت اور بربادی کی جڑ۔ اے دنیا کی آدمی سے زیادہ مصیبتوں کی تنہا سبب
دور ہو۔ میرے دل اور میرے گھر سے ہمیشہ کے لیے دور ہو۔ (بوتل اور
گلاس بٹخ دیتا ہے) معاف کر میری حور، اپنے گناہ گار شوہر کو معاف کر۔

(عارف رشیدہ کے قدم پکڑ لیتا ہے)

تیسرا ایکٹ - چوتھا سین

راستہ

زیاد : شیر جب تک گولی کھا کر نہ گرے، شکاری اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ چالاک اور دلیر رشیدہ میری غلطی سے مجھے زخمی کر کے اپنی عصمت بچالے گئی۔ لیکن جب میں سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوں تب تک وہ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گی۔

طارق : میں نے آپ کے حکم کے مطابق آٹھ وفادار بہادر جن لیے ہیں۔ اگر ان آٹھ کے مقابلے میں اٹھائیس آدمی تلواریں لے کر کھڑے ہو جائیں تو یہ سب ان کی گردنیں توڑ کر رشیدہ کو زبردستی اٹھا لائیں گے۔

زیاد : تو یہ کام آج ہی ہونا چاہیے۔

طارق : آج ہی ہوگا۔ ہم صرف رات کے اندھیرے اور سناٹے کا انتظار کر رہے ہیں۔

زیاد : اچھا جاؤ اپنے دل کو ہمت سے گرم اور اپنی تلواروں کو مقابلے کے لیے تیار رکھو۔ اگر تم رشیدہ کو اٹھا لائے۔ تو میں تمہارے سروں پر انعام کی بارش برسا دوں گا۔ اور اگر نہ لاسکے تو تمہارے سروں کو بوٹ کی ٹھوکروں سے اڑا دوں گا۔ جا۔ ہا ہا ہا ہا۔

تیسرا ایکٹ - پانچواں سین

عارف کا مکان

رشیدہ : ابا جان۔ تین مہینے سے بیماری کے بستر پر پڑے ہوئے ہیں اور انور نے اُن کے سخت بیمار ہونے کا حال آج ظاہر کیا۔

عارف : تمہارے والد نے محبت سے یاد کیا ہے تو میں تمہیں ساتھ لے کر خوشی سے چلنے کو راضی ہوں۔ لیکن وہ روپے پیسے سے میری مدد کریں گے تو میں شکریے کے ساتھ واپس کر دوں گا۔

رشیدہ : کیوں؟

عارف : کیونکہ میں اپنی کھوئی ہوئی دولت اپنی محنت اور کوشش سے دوبارہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ مفت میں ملی ہوئی دولت آدمی کو نکما اور اپاہج بنا دیتی ہے۔ انسان جس دولت کو محنت سے پیدا کرتا ہے، اُسی دولت کی قدر بھی کرتا ہے۔

(ایاز داخل ہوتا ہے)

ایاز : اگر دولت کی قدر کرنا سیکھ گئے ہو تو اب دولت ناراض ہو کر کبھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑے گی۔

رشیدہ : یہ کون؟ ایاز۔ ہاں وہی۔ وفا کا ٹکڑا۔ انسانوں میں فرشتہ۔

(رشیدہ دوڑ کر ایاز سے لپٹ جاتی ہے)

ایاز : میری بچی۔ بچی کے شور اور ہیز یوں کی جھکار میں بھی تمہاری یہی محبت

ترکی حور

بھرے الفاظ تسلی کی آواز دے کر میری ڈھارس بندھاتے تھے۔ میں قید خانے سے رہا ہو گیا ہوں۔ مگر تمھاری نمک خواری سے اور غلامی کی قید سے رہا نہیں ہوا۔ لوہے کی بیڑیاں ٹوٹ گئی ہیں لیکن وفاداری کی ہتھکڑی باقی رہے گی۔

عارف : آنکھیں چار کرتے شرم آتی ہے (پاس جا کر) ایاز۔ شراب کے نشے اور غصے میں جو غلطی ہوئی ہے میں اس کے لیے نادم ہوں۔ معافی کے لائق نہیں ہوں۔ پھر بھی مجھے معاف کرو۔

ایاز : میرے آقا۔ معافی کے نام سے اپنے گھر کے غلام کو شرمندہ نہ کیجیے۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد راستے میں آپ کے شراب چھوڑ دینے اور نیک زندگی اختیار کرنے کا حال سن کر مجھے جو خوشی حاصل ہوئی۔ اس خوشی اور آپ کی بہتری کے لیے میں ایک نہیں ایک ہزار مرتبہ جیل جانے کو تیار ہوں۔

عارف : ایاز۔ دنیا میں بدنصیب وہ ہے جسے غلطیوں میں گھرا ہوا دیکھ کر بھی کوئی نصیحت نہیں کرتا اور اس سے زیادہ بدنصیب وہ آدمی ہے جو نصیحت سن کر اُس پر عمل نہیں کرتا۔ اگر میں تمھاری نصیحت سنتا تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔

ایاز : غانم کی بری صحبت اور شراب کی بدولت زندگی بسر کرنے کے لیے آج آپ کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے — اسی دن کے لیے میں نے دنیا کی بدنامی اور جیل کی مصیبت سے بے پرواہ ہو کر آپ کی تجویز سے بچپس ہزار کے نوٹ نکال کے زمین میں چھپا دیے تھے۔ آپ نے مجھے چور سمجھا۔ لیکن میں چور نہیں تھا، آپ کا خیر خواہ تھا۔ آپ کے بچپس ہزار کے نوٹ میرے پاس بطور امانت موجود ہیں۔ لیجیے۔ یہ ہیں آپ کے روپے۔

(ایاز عارف کو بچپس ہزار کے نوٹ دیتا ہے)

رشیدہ : قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ یہ جب گزرتی ہے تو موسم خزاں کی طرح خوشی کے باغ کا سارا سنگھار چھین لیتی ہے۔ اور جب مہربان ہوتی ہے تو نیم بہار بن کر مرجھائی ہوئی زندگی کی گودِ راحت کے پھولوں سے بھر دیتی ہے۔

ایاز : اب اس روپے سے کنگالی کو خوش حالی میں بدلنے کے لیے دیانت اور محنت کے ساتھ کوئی روزگار شروع کر دیجیے۔ اور میری اس نصیحت کو جو پہلے بھی کی تھی یاد رکھیے۔

آندھیاں بھی ساتھ ہیں دولت کے بادل کے لیے
ہے وہی دانا بچا رکھے جو کچھ کل کے لیے

(گاتا)

دنیا میں جب دھن پانا۔ کل کے لیے بچانا
دولت بھی اک کھیتی ہے۔ جو بوئے اُسے پھل دیتی ہے۔
رکھ دھن جو ہو پھل کھانا۔

مُرے دن میں نہ بھائی اور نہ جایا کام آتا ہے
فقط اپنا کمایا اور بچایا کام آتا ہے
کبھی ہنستے ہوئے ملتے ہیں جب تک چار پیسے ہیں
نہ پوچھے گا کوئی بھی مفلسی میں آپ کیسے ہیں
مطلب کا یار زمانہ۔ کل کے.....

نہیں رہتی ہے پھل بھی ندی جب سوکھ جاتی ہے
جو دولت ہے تو تم دولہا ہو اور دنیا براتی ہے
جو کل سے بے خبر ہو کر نہیں ہیں آج آپے میں
وہ در در بھیک مانگے گا غریبی اور بڑھاپے میں
مت دولت مفت گنونا۔ کل کے.....

جہاں سکھ تھا وہاں لالے پڑے ہیں زندگانی کے
ہزاروں گاؤں اور گھر بہہ گئے ریلے میں پانی کے
جو تم دولت اڑاتے ہو اگر اس میں کھانا ہے
تو دو ان کو کہ جن کے پاس کپڑا ہے نہ کھانا ہے
نہیں دولت مفت گنونا۔ کل کے.....

(ایاز اور عارف کا جانا اور طارق اور اس کے ساتھیوں کا آنا)

طارق : وہ کھڑی ہے۔ اٹھا لے چلو۔

رشیدہ : یہ کیا؟ تم کون؟ ایاز۔ ایاز۔

طارق : پُچ۔

رشیدہ : چھوڑو۔ بزدل کینو۔ مجھے چھوڑو۔

طارق : تیری طرف سے زیاد کے ساتھ کون لڑے گا؟

رشیدہ : میری ہمت۔

طارق : کون بچائے گا؟

رشیدہ : میرا خدا۔

طارق : اچھا معلوم ہو جائے گا۔ دروازہ کھولو۔

رشیدہ : میں کبھی نہ جاؤں گی۔

طارق : تجھے جانا ہوگا اور اس طرح۔

(رشیدہ کو زبردستی کھینچتے ہوئے لے جاتا)

تیسرا ایکٹ - چھٹا سین

زیاد کا محل

زیاد : گلاب کی پگھڑی جیسی نازک اور برگد کے تنے کی طرح مضبوط۔ جتنی خوبصورت اتنی ہی بہادر۔ اس دن میرا مقابلہ کر کے رشیدہ نے ثابت کر دیا کہ عورت کے سینے میں بھی شیر کا دل ہوتا ہے۔ (طارق کا آنا) کہو کیا خبر ہے۔ شکست یا فتح۔

طارق : جب حضور کا اقبال ساتھ ہے تو ہمیشہ فتح ہی ہوگی۔

زیاد : تو کیا تم رشیدہ کے گھر میں ڈاکہ ڈال کر حسن کی دولت اٹھا لائے۔

طارق : جی ہاں۔ مغرور رشیدہ ہمارے قبضے میں ہے۔ کہیے اس کے لیے کیا حکم ہے؟

زیاد : میں اُس کے حسن کی پوری بہار دیکھنا چاہتا ہوں۔ کنیزوں سے کہو کہ اسے

غریب لباس کے بدلے قیمتی زیور اور موتیوں سے جھلک کرتی ہوئی امیرانہ پوشاک پہنا کر اسے عورت سے پری بنائیں۔ میں وہیں آتا ہوں۔

(طارق کا جانا)

(خود کلامی) رشیدہ۔ مغرور رشیدہ۔ آخر تو دوبارہ میرے قبضے میں آئی گئی۔

تیسرا ایکٹ - ساتواں سین

محل کا کمرہ

(کنئیریں رشیدہ کا لباس تبدیل کر رہی ہیں)

رشیدہ : نہیں میں اسے نہیں پہنوں گی۔

زیاد : ہا ہا ہا ہا۔ رشیدہ۔

رشیدہ : پاجی۔ کیئے۔ بے حیا۔

(انور کا آنا)

انور : خبردار۔ بد معاش۔

زیاد : کون؟ انور۔ بس زندگی کا خاتمہ سمجھ۔ میری پیاسی چھری تیرا خون چوسے گی۔

انور : میرا خون تیری چھری کے لیے نہیں۔ لڑائی کے میدان میں اپنے ملک اور قوم

کی خدمت پر بہانے کے لیے ہے۔

زیاد : تجھے مرنا ہوگا۔

انور : بہادر نامرد کی چھری سے نہیں مرتے۔

زیاد : روک وار۔

انور : خبردار۔

(انور کا زیاد اور پھر طارق پر حملہ کر کے دونوں کو مار دینا)

زیاد : آہ۔

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

طارق : یہ کیا؟

انور : خبردار۔

طارق : آہ۔

تیسرا ایکٹ - آٹھواں سین

عاف کا مکان

(رشیدہ، انور، لیلیٰ اور مصاحبین کا آتا)

(گاتا)

ہاں ساقی میخانہ بھر دے مرا پیانہ
بدمست گھٹا ہے یا اڑتا ہوا سے خانہ
ہوتی ہیں شب غم میں یوں دل سے مرے باتیں
جس طرح سے سمجھائے دیوانے کو دیوانہ
کیا تم نے کہا دل سے کیا دل نے کہا مجھ سے
بیٹھو تو سناؤں میں اک روز یہ افسانہ
مطرب سے یہ کہتا ہے حشر اپنی غزل سن کر
ہے میری جوانی کا بھولا ہوا افسانہ

رشیدہ : میرے پیارے بھائی۔ تم نے دنیا کے رنگا رنگ کے جواہر میں سے عورت کی
بے بہا اور بے لوث محبت اور نیکی کا انتخاب کیا ہے۔ (لیلیٰ سے) اور میری
شریف بہن۔ تم نے انسانوں میں بہترین شخص کو اپنی قسمت کا مالک بنایا
ہے۔ خدا تمہارے انتخاب اور ارادے کو کامیاب کرے۔

(رشیدہ انور کے ہاتھ میں لیلیٰ کا ہاتھ دیتی ہے)

مصاحبین : یارب العالمین۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔

(پردہ)

رستم سهراب

رستم سہراب (1929)

یہ ڈراما ملنس کی بھینٹی شاخ 'دی امپیریل تھیٹر ٹیکل کمپنی آف باپے' کے لیے لکھا گیا تھا اور بیہیں سے پہلی بار اسٹیج بھی ہوا۔ اس ڈرامے کو اس کے ادبی مزاج اور ڈرامے کی تکنیک دونوں اعتبار سے آغا حشر کے کمال فن کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ اسے ناقدین ادب اور ڈرامے کے ماہرین نے منفرد طور پر سراہا ہے۔ اردو میں لکھا گیا یہ آغا حشر کا آخری ڈراما ہے۔ یہ ڈراما 'عشق و فرض' کے نام سے بھی مشہور ہوا اور ایک روایت کے مطابق نیرنگ خیال، لاہور میں شائع بھی ہوا، لیکن اس نام سے مشہور ڈراما دراصل اس مکمل ڈرامے کے دوسرے باب کے تیسرے سین سے شروع ہو کر ساتویں سین پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ صرف سہراب اور گرد آفرید کے عشق کی المیہ داستان ہے، جو گرد آفرید کے مر جانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ مکمل ڈرامے کی کہانی فردوسی کے شاہ نامے کے ایک حصے سے اخذ کی گئی ہے۔ آغا حشر نے اس ڈرامے میں کامک کا استعمال نہیں کیا ہے، جس کی وجہ سے اس میں از ابتدا تا انتہا سنجیدگی برقرار رہتی ہے۔ اردو میں یہ رزمیہ ادب کی بہترین مثال بھی ہے۔

آغا حشر کے ذخیرے میں اس کے دو مطبوعہ اور دو قلمی نسخ دستیاب ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں سے ایک تاج کمپنی، نیا محل دہلی سے 1966 میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ڈرامے کا تعارف عشرت رحمانی نے لکھا ہے۔ دوسرا مطبوعہ نسخہ آئینہ ادب، لاہور نے 1987 میں شائع کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ دونوں نسخے آغا حشر کے انتقال کے بہت بعد کے ہیں، اس لیے انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ قلمی نسخوں میں پہلا نسخہ منظور احمد عظیم

آبادی کا لکھا ہوا ہے، جس میں تاریخ تحریر موجود نہیں۔ اسے لکھنے کے لیے سرخ اور نیلی روشنائی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا ایکٹ پنل سے لکھا ہوا ہے۔ یہ معتبر بھی ہے اور صاف ستھرا بھی۔ لیکن دوسرا نسخہ چونکہ خود آغا جمیل کاشمیری نے اسی مسودے سے تیار کیا ہے اور ان کی باریک بین نگاہوں نے اس پر نظر ثانی بھی کی ہے، اس لیے اسے ہی اس جلد میں شامل ڈرامے کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی 19 صفحات خود آغا جمیل کاشمیری کے لکھے ہوئے ہیں۔ باقی 86 صفحات ان کی نگرانی میں ان کے صاحب زادے آغا نہال کاشمیری نے نقل کیے ہیں۔

کردار

مرد

ایرانی افواج کا سپہ سالار	رستم
رستم کا بیٹا	سہراب
سمنگان کا حاکم	شاہ سمنگان
سمنگان کا ایک سردار	ہیلسم
تورانی فوجی	ہومان
تورانی فوجی	بارمان
توران کا بادشاہ	افراسیاب
ایران کا بادشاہ	کیکاؤس
ایرانی سردار	کستہم
قلعہ سفید کے لشکر کا رکن	بہرام
قلعہ سفید کا محافظ	بحیر
سردار	طوس
سردار	گودرز

خواتین

سہراب کی ماں	تہینہ
قلعہ سفید کے حاکم کی بیٹی	مُرد آفرید
چند سپاہی - دیہاتی اور کنیریں	

پہلا ایکٹ - پہلا سین

تورانی سرحد پر ایک سرسبز و شاداب پہاڑی مقام

(آسمان میں صبح کا آفتاب اور گھوڑے کی پیٹھ پر رستم دکھائی دیتا ہے)

رستم : دنیا کے لیے روشنی، پھولوں کے لیے مسکراہٹ، پرندوں کے لیے زحرے، دریاؤں کے لیے ترنم ریز روانی، سوسے ہوئے قوائے عمل کے لیے بیداری کا پیغام لانے والا آفتاب، افق مشرق کی پیشانی پر تاج زر افشاں کی طرح چمک رہا ہے — کتنا پر جلال نظارہ — یہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب نہیں، ایک نور کی کتاب ہے، جس میں دنیا جاگنے کے بعد اپنے ماضی کے خواب کی تعبیر پڑھ رہی ہے۔ ستاروں کے ملک سے آیا ہوا ایک نورانی فرشتہ ہے، جس سے کائنات کی ہر شے زندگی کی برکتیں مانگ رہی ہے — آسمان کے مانند اس زمین پر بھی ہر روز اسی طرح طلوع و غروب کے منظر دکھائی دیتے ہیں۔ انسانوں کی قسمت کا ستارہ اور قوموں کے اقبال کا آفتاب بھی یوں ہی گم نامی کی رات کا سیاہ پردہ ہٹا کر شہرت کی فضا میں چمکتا، کامیابی کے سنہرے دنوں پر حکومت کرتا اور آخر دنیا کی یادداشت اور تواریخ کے صفحوں پر اپنے دھندلے یا روشن نشان چھوڑ کر شامِ فنا کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔

دنیا بے ثبات میں ہر شے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے، ہر صبح کی ہے شام

رنک زوال سے ہیں رنکے گل بھی خار بھی
دھوکا ہے اس چمن کی خزاں بھی، بہار بھی

(رستم گھوڑے کی پیٹھ سے اترتا ہے)

آفتاب کی سنہری کرنوں کے ساتھ چاروں طرف خوبصورتی اور رنگینی بکھری ہوئی ہے۔ پرندوں کے ترانوں پر ہوا میں موسیقی رقص کر رہی ہے۔ زمین پر صبح کی روشنی، پھولوں کی خوشبو اور بلبل کے نغموں کا سیلاب بہہ رہا ہے۔ یہ مطلق ہوتا ہے کہ یہ جنگل قدرت کا بنایا ہوا ایک شعر، یہ بلند پہاڑ اُس شعر کا مضمون، یہ بہتے ہوئے چشمے اس شعر کی روانی اور یہ سرخ، سبز، زرد پھول اُس شعر کے حسین استعارے ہیں۔

(بیار سے گھوڑے کی گردن تھپتھپاتا ہے)

میرے بچپن کی رفتی، جوانی کے دوست، میدان جنگ کے وفادار ساتھی، وہ دیکھو، ہرے بھرے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں تمہارے لیے دور تک سبز ٹھنڈی کا دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ خوشبو میں نہائے ہوئے ہوا کے جھونکے، بار بار تمہیں بلانے آرہے ہیں۔ جاؤ، اُن کی دعوت قبول کرو۔

(گھوڑے کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے)

سردی، گرمی، بھوک، پیاس کی تکلیفوں سے بے پرواہ ہو کر آسمان سے ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح جو فضا میں راستہ بھول گیا ہو، دو مہینے سے شکار کے پیچھے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں — بس شکار اور سفر دونوں ختم ہوئے — تھکے ہوئے جسم کو تھوڑا آرام دینے کے بعد آج ہی ایران روانہ ہو جاؤں گا۔

(دُحال کا تکیہ بنا کر زمین پر لیٹ جاتا ہے)

نیند، پیاری نیند۔ تم فطرت کی لاڈلی بیٹی ہو، برکتوں کے ملک کی ملکہ ہو،

آرام کی سلطنت کی شہزادی ہو۔

راہ میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو ٹھکراتی ہوئی
آؤ، آؤ مسکراتی، پھول برساتی ہوئی
روح کو تسکین دو اور جسم کو آرام دو
زندگانی کو خدا کا بہترین انعام دو

(دھیرے دھیرے سو جاتا ہے۔ چند تورانی سردار جو ایران کی
سیاحت سے واپس ہو کر اپنے وطن سمنگان کی طرف جا رہے ہیں،
داخل ہوتے ہیں)

سردار ۱: دنیا کے عجائبات میں، تم بھی ایک عجیب چیز ہو۔ بہشت کو دیکھنے کے بعد بھی
کہتے ہو کہ بہشت خوبصورت نہیں ہے۔

سردار ۲: ہاں۔

سردار ۱: تب یقیناً تم ایران کے سفر میں آنکھیں ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔ مجھے تو
یہ محسوس ہوتا تھا کہ جشید اور فریدوں کی سرزمین میں نہیں، کسی شاعر کے
خیال کی رنگین دنیا میں سیر کر رہا ہوں۔

سردار ۲: جس طرح موت اور زندگی، ظلمت اور نور، اہرن اور یزداں میں ازل سے
جنگ ہو رہی ہے، اُسی طرح قدیم سے ایران اور توران بھی ایک دوسرے کی
دشمنی کو اپنی زندگی کا واجب الادا قرض سمجھتے ہیں۔ ہم تورانی ہیں۔ تورانی کے
گلے پر خنجر رکھ دو، تب بھی ایران کی تعریف نہ کرے گا۔

سردار ۱: تعریف نہ کرے گا! کیوں؟

سردار ۲: کیونکہ وہ ہمارے وطن کے دشمنوں کا ملک ہے۔

سردار ۱: ایرانی قوم، تورانی قوم کی دشمن ہے۔ لیکن ایران کے پر عظمت پہاڑ،
خوبصورت شہر، شاداب جنگل، پریوں کی زلفوں کی طرح لہراتے، گل کھاتے
ہوے دریا ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ کیا اس سفر میں تورانی سمجھ کر ایران کے
آسمان نے تمہیں اپنے سورج چاند کی روشنی نہیں دی۔ ایران کے چشموں نے

تمہاری پیاس نہیں بجھائی۔ ایران کی زمین نے تمہیں بیٹھے، سونے کی جگہ دینے سے انکار کیا۔ تم دشمنی سے اپنے ہونٹوں کو سچ بولنے کی اجازت نہ دو، لیکن میں توران کے شہنشاہ افراسیاب کے سامنے بھی بے خوف ہو کر کہہ دوں گا کہ دنیا کا بہشت ایشیا ہے اور ایشیا کا بہشت ایران ہے۔

سردار ۲: بس بس۔ میں ایران کی تعریف میں قصیدہ سننا نہیں چاہتا۔ تم شاعر نہیں، سپاہی ہو۔

سردار ۱: میں تمہارے جیسا چھوٹا دل، تنگ نظر، پست خیال لے کر اس دنیا میں نہیں آیا ہوں۔ اچھے کو اچھا کہنا شاعری نہیں، انصاف ہے۔ تم جتنے ایران کے دشمن ہو، اُس سے زیادہ انصاف اور عقل کے دشمن ہو۔

سردار ۲: تمہارے لفظ زہر کی طرح کڑوے اور چھری کی نوک کی طرح تیز ہیں۔ (میان سے تلوار کھینچ کر) واپس لو، معافی مانگ کر ان لفظوں کو واپس لو۔ ورنہ مجھے اس کا جواب تلوار سے دینا ہوگا۔

سردار ۱: تو اس جواب کا جواب بھی تلوار ہی کی زبان سے سننا ہوگا۔

(دونوں سردار ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں)

سردار ۲: (روکتے ہوئے) یہ کیا! — تلوار اور طاقت کا ایسا ذلیل استعمال!! — کیا دنیا میں اب ہمارا کوئی دشمن نہیں رہا۔ جو تلوار کو زنگ سے بچانے کے لیے ہم نے آپس ہی میں جنگ شروع کر دی۔ تورانیوں کے پاس حربہ، لشکر، دولت، طاقت، ہمت، سب کچھ ہے۔ صرف ایک چیز 'اتفاق' نہیں ہے۔ اس لیے دشمنوں کے مقابلے میں ان کی ہر فتح، شکست بن جاتی ہے — تلواریں پھینک دو۔ ٹوٹی ہوئی محبت کو جوڑنے کے لیے ہاتھ ملاؤ — جو قوم ہمدردی اور اتفاق کے ساتھ ایک دل، ایک خیال ہو کر زندگی بسر کرنا نہیں جانتی — یاد رکھو اس کی قسمت کے نوشتے پر دائی زلت کی مہر ہو چکی۔ وہ آزاد دنیا میں غلامی کے لیے پیدا ہوئی ہے اور آخری سانس تک غیر قوم کی غلام بنی رہے گی۔

رستم سہراب

مگر دلوں میں اتفاق اور خواہشوں میں میل ہے
زندگی کی راحتوں کو فتح کرنا کھیل ہے
کامیابی کے لیے احساسِ حالت چاہیے
ایک ہو جاؤ اگر دنیا میں عزت چاہیے

(دونوں سردار تلواریں میان میں رکھ کر ہاتھ ملاتے ہیں)

سردار ۱: دوست۔ ندامت کے ساتھ میں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں۔
سردار ۲: یہ لڑائی نہ تھی۔ ہماری دوستی نے ایک لمحہ کے لیے تلوار کی جنگ کا خواب
دیکھا تھا۔
سردار ۳: ہمیں شام ہونے سے پہلے سمنگان پہنچ جانا چاہیے۔ تلواریں تیز کر چکے۔ اب
قدموں کو تیز کرو۔

(آگے بڑھتے ہیں۔ سوائے ہوئے رستم پر نظر پڑتی ہے)

سردار ۱: کون؟ — یہ انسان ہے! یا قدرت کے جلال، پہاڑ کی مضبوطی، شیر کی ہیبت
نے انسان کا جسم اختیار کر لیا ہے!!
سردار ۳: یہ معلوم ہوتا ہے کہ گوشت اور ہڈی سے گھرا ہوا طاقت کا سمندر، نیند میں
چھاتی پھلا کر دھیرے دھیرے سانس لے رہا ہے۔
سردار ۱: اس کے چہرے کی طرف جتنا دیکھو، اتنا ہی تعجب بڑھتا ہے۔ قدرت بھی پیدا
کرنے کے بعد، مدتوں اسے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی رہی ہوگی۔
سردار ۳: (گھوڑے کو دیکھ کر) وہ دیکھو۔ ہرن کی آنکھیں، مور کی گردن، گینڈے کی
چھاتی، چیتے کی کمر، ہنس کی چال، تمام خوبصورتیوں کو ایک آئینے میں دیکھنا
ہو، تو سامنے دیکھو۔
سردار ۱: کیسا شاندار گھوڑا۔ گویا ہری ہری گھاس پر جنگل کا بادشاہ گھوم رہا ہے۔
سردار ۲: اسے باندھ کر سمنگان لے چلو۔ بادشاہ کی نذر کریں گے۔
سردار ۱: لیکن یہ چوری ہے۔

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

سردار ۲: یہ چوری نہیں ہے۔ کیونکہ چور کو سزا ملتی ہے اور ہمیں بادشاہ سے انعام ملے گا۔

(گھوڑے کو لے کر سب جاتے ہیں۔ رستم آہستہ آہستہ بیدار ہوتا ہے)

رستم: جس طرح گرمی کی گود میں دم توڑتے ہوئے کھیت، بارش ہونے کے بعد زندہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح جاگنے کے بعد سونا اور محنت کے بعد آرام انسان کے جسم میں نئی زندگی اور نئی طاقت پیدا کر دیتا ہے (اُٹھ کر) آفتاب ایران کے شہنشاہِ اعظم کی کاؤس کے اقبال کی طرح بلند ہوتا جاتا اور اس کی دھوپ بچی کی ہمت کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔

(رستم گھوڑے کو پکارتا ہے)

آؤ آؤ۔ جنگ، سیر، سفر، ہر جگہ ساتھ دینے والے دوست، آؤ — ایران کا راستہ ہماری واپسی کا انتظار کر رہا ہے — نہیں سنا — کہاں ہو؟ — کیا دور نکل — گئے؟ دیکھوں۔

(رستم گھوڑے کی تلاش میں جاتا ہے۔ دو دیہاتی آتے ہیں)

دیہاتی ۱: گھوڑا تھا یا خوب صورت طوفان! اس کی نسوں میں لہو کی جگہ بجلی بھری ہوئی تھی۔

دیہاتی ۲: اس کے جسم کے ہر جھکے کے ساتھ دو چار آدمی زمین پر گیند کی طرح لڑھکتے دکھائی دیتے تھے۔

دیہاتی ۱: اور ہر لات پر دو چار پسلیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

دیہاتی ۲: جب گھوڑا اتنا بہادر ہے، تو اس کا مالک کتنا بہادر ہوگا؟

دیہاتی ۱: یہ کون آرہا ہے؟ — ماتھے پر شکن، بھوؤں میں کھنچاؤ، آنکھوں میں سرخی، چہرے پر غصے کی تمناہٹ!! کیا اس جنگل کو اس کے کسی جرم کی سزا دینا

چاہتا ہے؟

(رستم واپس آتا ہے)

رستم : کہیں دکھائی نہیں دیا۔ کہیں پتہ نہیں ملا۔ کیا میں یہ یقین کر لوں کہ جس طرح انسان کو بڑھاپے میں تندرستی چھوڑ دیتی ہے۔ دوسری جگہ لیاقت سے زیادہ تنخواہ مل جانے پر آقا کو نمک حرام نوکر چھوڑ دیتا ہے۔ مصیبت آجانے پر خوشامدی معاصب اور جھوٹے دوست چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح دنیا سے دعا بازی سیکھ کر آج میرے رخصت نے بھی مجھے چھوڑ دیا — نہیں نہیں — یہ ناممکن ہے — پھر کہاں ڈھونڈوں؟ کس سے پوچھوں؟ — آسمان سے پوچھا — زمین سے پوچھا۔ چشمے کی لہروں، ہوا کے جھونکوں، جنگل کے درختوں سے پوچھا۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔ سب پُپ ہیں — سنو سنو، درخت سنو۔ تمہارے ہی سبز سائے کے نیچے میری زندگی کا سایہ غائب ہوا ہے۔ اُسے پیدا کرو۔ ورنہ اس جنگل میں آگ لگا کر تمہیں دھوئیں اور برہادی میں دفن کر دوں گا۔

زمین کتیز مری ہے، فلک غلام مرا
اجل کی طرح ہے بے رحم، انتقام مرا
زمانہ جس سے لرزتا ہے میں وہ رستم ہوں
نہیں سنا ہو تو اب سن لو مجھ سے نام مرا

دیہاتی ۱: یہاں سے نکل چلو۔ یہ آدمی بھوکے شیر کی طرح خوفناک ہو رہا ہے۔

(دونوں دیہاتی بھاگتا چاہتے ہیں۔ رستم انہیں روکتا ہے)

رستم : ٹھہرو —

دیہاتی ۲: آپ آگ کے گولے کی طرح گرم ہو رہے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے ہو جیے۔ ہم لوٹ کر آتے ہیں۔

رستم : (زمین پر لات مار کر) میں حکم دیتا ہوں۔ ٹھہرو۔ (دونوں خوف سے کانپتے)

دیہاتی ۱: جناب کانپتا کون ہے؟ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اس لیے ذرا ٹانگوں کو سردی معلوم ہوتی ہے۔

رستم : (ڈانٹ کر) تم کون ہو؟

دیہاتی ۲: (گھبرا کر) ہم... ہم... آدمی ہیں۔

رستم : (زمین پر دوبارہ لات مار کر) میں کب کہتا ہوں، تم گھاس پتھر ہو۔

(دونوں خوف سے گر پڑتے ہیں)

دیہاتی ۱: گھر سے نکلنے وقت آج ضرور ہم نے کسی منحوس کا منہ دیکھا تھا۔
رستم : بزدلو اٹھو، کھڑے ہو۔ اور جو پوچھوں، اس کا جواب دو۔ اُٹھتے ہو یا.....

(گھونسا تانتا ہے)

دیہاتی ۲: اٹھو بابا۔ ہم زمین سے نہ اٹھے تو یہ ہمیں دنیا ہی سے اٹھا دے گا۔

رستم : تم دونوں کہاں رہتے ہو؟

دیہاتی ۱: اس جنگل سے تھوڑی دور پر ایک گاؤں میں۔

رستم : تم قریب کے گاؤں میں رہتے ہو؟

دیہاتی ۲: جناب ہم دونوں غریب کسان ہیں۔ بادشاہ کے محل میں پیدا نہیں ہوئے۔

جنت کے لائق نہیں۔ جہنم میں جانا نہیں چاہتے۔ پھر گاؤں میں نہ رہیں گے

تو کہاں رہیں گے؟

رستم : تم یہیں کے رہنے والے ہو، تو ضرور دیکھا ہوگا؟

دیہاتی ۱: کسے دیکھا ہوگا؟

رستم : خبردار — میرے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرنا (گلا پکڑ کر) اقرار

کرو کہ.....

دیہاتی ۲: مگر گردن توڑنے سے پہلے یہ تو بتا دیجیے، کس بات کا اقرار کریں؟

رستم : کہ تم نے میرے وقادار گھوڑے کو دیکھا ہے۔

رستم سہراب

دیہاتی ۱: ارے! تو کیا وہ شیرنی کے دودھ سے پلا ہوا گھوڑا، آپ ہی کا تھا!!!؟

رستم: ہاں۔ وہ کہاں ہے؟

دیہاتی ۲: تورانی سرداروں کے قبضے میں۔

دیہاتی ۱: وہ اسے گرفتار کر کے اپنے بادشاہ کو نذر دینے کے لیے سمنگان لے گئے ہیں۔

رستم: تو بکتا ہے۔ جموٹا ہے۔ پاگل ہے۔ ناممکن کو ممکن نہیں بنایا جاسکتا۔ طوفان زنجیروں میں نہیں جکڑا جاسکتا۔ بجلی رسیوں میں نہیں باندھی جاسکتی — اس دنیا میں کسی ماں نے ایسا جری و بے خوف لڑکا پیدا نہیں کیا، جو رستم کے رخش نامی گھوڑے پر اپنی سواری کا زین کس سکے۔ تیری آنکھوں نے تجھے دھوکا دیا، اور تو مجھے دھوکا دے رہا ہے۔

دیہاتی ۲: میں۔ نہیں سچ بات کا یقین نہ کر کے، آپ خود اپنے کو دھوکا دے رہے ہیں۔

رستم: تیری سچائی کا ثبوت؟

دیہاتی ۱: ثبوت اور گھوڑا، دونوں آپ کو سمنگان میں ملیں گے۔

(دونوں دیہاتی چلے جاتے ہیں)

رستم: سمنگان! کون سمنگان؟ توران کی ایک چھوٹی سی ریاست۔ زمین کے نقشے میں ایک دھندلا سا نشان۔ دنیا کے جغرافیہ میں ایک حقیر نقطہ!! — (دُعا اور گرز اٹھا کر) دیکھوں گا۔ دیکھوں گا۔ سمنگان دیکھوں گا۔ کہ تیرے قلعے کی دیواریں، تیرے بادشاہ کے تخت کے پائے، تیرے بہادروں کے دل اور بازو کتنے مضبوط ہیں؟ — اپنے سپاہیوں سے کہہ دے کہ اپنی کمائیں چڑھالیں، اپنے ترکشوں میں تیر بھر لیں، اپنی تلواروں پر سان دے لیں۔ تیرے آسمان کو لہو کی جھینٹوں سے اور تیری زمین کو لاشوں سے ڈھانک دینے کے لیے رستم آندھی اور طوفان بن کر تیری طرف آرہا ہے۔ اب دنیا میں فنا کا تاریک سایہ تیری آخری جائے پناہ۔ اور بربادی تیرا

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

آخری ورثہ ہے۔۔

میرے گا خون کہ غصہ ہے تشنہ لب میرا
کہیں پناہ نہ دے گا تجھے غضب میرا
گہرا ہے شعلوں میں تو بھی، ترا مقدر بھی
بجھا سکے گا نہ اس آگ کو سمندر بھی

(انتہائی جوش و خروش کے ساتھ رستم سنگان کی طرف روانہ
ہوتا ہے)

پہلا ایکٹ - دوسرا سین

شاہ سمنگان کی سال گرہ کا جلسہ

(امراء سلطنت حاضر ہیں۔ حبشی و تاتاری غلام کندھوں پر شراب کی زرتگر مصراحیاں اور ہاتھوں میں طلائی جام لیے کھڑے ہوئے ہیں)

شاہ سمنگان : سمنگان کے ستارو! تاج کے وقادارو!! یہ دنیا ازل سے ابد کی طرف جانے والا ایک راستہ ہے۔ اس راستے پر خدا کے سوا، خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سفر کر رہی ہے۔ آج میری عمر کے مسافر نے بھی زندگی کے سفر میں اس راستے کی پچاس منزلیں طے کر لی ہیں۔

کل بڑھاپا بھی نہ ہوگا، نوجوانی کی طرح
ساتھ دنیا کے بے جاتے ہیں پانی کی طرح
کس طرف کو جا رہے ہیں ہم، پتہ کوئی نہیں
اس سفر کی ابتدا ہے، انتہا کوئی نہیں

وزیر : ۔

حیات جادوئی دے خدا اس دار فانی میں
ہماری عمر بھی مل جائے تیری زندگانی میں

علیم : ۔

خوشی کا دن مسرت کا زمانہ بار بار آئے
ہزاروں بار یوں ہی اس گلستاں میں بہار آئے

کلیات آفاشر کا شیری - جلد چہارم

(کنیزوں کا رقص۔ رقص کے بعد وزیر ادب سے بادشاہ کے روبرو
اور ساتی امراء دربار کے روبرو جام شراب پیش کرتے ہیں)

وزیر: (ساغر پیش کر کے)

غلام سلطنت ہوں اور یہ نذر عاجزانہ ہے
مے رنگیں نہیں، یہ ساز ساغر کا ترانہ ہے

امیر: (پیالہ ہاتھ میں لے کر)۔

شراب ناب کے جلووں سے ساغر میں اُجالا ہے
ہزاروں چودھویں کے چاند ہیں اور ایک ہالا ہے

علیم: (جام بلند کر کے)۔

یہ وہ شے ہے، گرے تو خاک سے اکسیر پیدا ہو
ہر اک قطرہ سے ایک اک حسن کی تصویر پیدا ہو

(پیالہ ہونٹوں تک لے جاتے ہیں۔ رستم غصے اور جوش میں داخل
ہوتا ہے)

رستم: بس۔ دنیا میں تمہاری خوشی کے دن ختم ہو چکے۔ پیالے پھینک دو۔ صراحیاں
توڑ دو۔ اپنی ہنسی کو آنسوؤں میں بہا دو۔ (بادشاہ سے) تم ہی سمنگان کے
بادشاہ ہو؟ (درباریوں سے) تم ہی اس تخت و تاج کے قوی بازو محافظ ہو
(دوبارہ بادشاہ سے) یہی آنکھیں ہیں جو اپنے سوا تمام دنیا کو حقارت سے
دیکھتی ہیں (دوبارہ درباریوں سے) یہی ہاتھ ہیں، جو شیر کی کلائی مروڑنے کا
دعوئی کرتے ہیں۔

کمانیں بھی ہیں، ڈھالیں بھی ہیں، کندھوں پر تیر بھی ہے
کرد ثابت کہ ان سینوں میں دل بھی ہے جگر بھی ہے
بڑھو جوہر دکھاؤ آج، اگر تلوار باندھی ہے

رستم سہراب

میلیم : میں آیا ہوں کہ دیکھوں کون بجلی، کون آندھی ہے
شامی دربار میں آج تک کسی نے اس جوش و دلیری کے ساتھ گفتگو کی
جرات نہیں کی۔ تم مظلوم ہو، فریادی ہو، دیوانے ہو؟ کون ہو؟
رستم : میں کون ہوں؟ اس تخت کے لیے زلزلہ — اس سلطنت کے لیے تہلکہ۔
اس تہنیت کے ترانوں سے گوشتی ہوئی محفل نشاط میں موت کی گرج۔

عدو کو پھونک دے وہ برق شعلہ فام ہوں میں
خدا کے قہر کا اک نقش انتقام ہوں میں
فنا کے ہونٹ سے نکلا ہوا پیام ہوں میں
اجل کے ہاتھ کی شمشیر بے نیام ہوں میں
یہ بزم عیش چمکتی ہے جو ستاروں سے
جلے گی اب مری تلوار کے شراردوں سے

میلیم : ادب سیکھ، ادب سیکھ۔ یہ ہمارے بادشاہ کا انتہائی رحم ہے کہ ابھی تک تجھے
اس گستاخی کی سزا نہیں دی گئی۔
رستم : عورتوں کی طرح تمھاری زبان میں طاقت ہے۔ مگر مجھے سزا دینے کے لیے
تمھارے بازوؤں میں طاقت نہیں ہے۔

ہستی ناچیز بھرے گی فنا کے سامنے
شع کی لو سر اٹھائے گی ہوا کے سامنے
گھاس کا تنکا سزا دے! اور کسے؟ طوفان کو!!
تم نے دیکھا ہی نہیں اب تک دلیر انسان کو

میلیم : بس۔ اس سے زیادہ تحمل نہیں ہو سکتا۔ تیری گستاخی برداشت کی حد سے آگے
بڑھ رہی ہے۔

زبان اور سر کٹا دیتی ہیں تلخ و تیز تقریریں
نہ لہرائیں کہیں ناگن کی صورت سر پہ شمشیریں
ہماری بھی رگوں میں زندگی کا خون بہتا ہے

سمجھ رکھا ہے کیا تو نے ہمیں بے جان تصویریں؟

رستم : زمین پر اگی ہوئی گھاس، جیسے پتروں سے روندنا ہوا یہاں تک آیا ہوں، میں اس سے بھی زیادہ تمہیں بے حقیقت سمجھتا ہوں۔ سنو، تم سمنگان کے شاہی دربار میں نہیں، قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے مجرموں کی طرح میرے غصے کی عدالت میں کھڑے ہوئے ہو۔ اگر دنیا میں زندہ رہنے کی خواہش ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، تو میرے غضب کے سامنے گھٹنے ٹیک کر، سر جھکا کر، ہاتھ جوڑو، پیکر ندامت و زبانِ التجا بن کر اپنے قصور کے لیے معافی اور اپنی زندگیوں کے لیے رحم مانگو۔

شاہ سمنگان : اے شخص۔ میں بڑی دیر سے تیری دیوانگی آمیز گستاخیوں کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں — کسی مقدمے میں انصاف، کسی قصور کی معافی، کسی خدمت کا انعام۔ بیان کر، تو کیا چاہتا ہے؟

رستم : میں اپنا رخس نامی گھوڑا چاہتا ہوں۔ تیری سلطنت میں شریفوں کا چہرہ لگا کر پھرنے والے ڈاکو اسے تورانی سرحد سے چُرا لائے ہیں۔ اگر تو نے آج ہی، اسی وقت، اسی جگہ اُسے حاضر نہ کیا، تو اس دنیا میں تیری ہستی اور اس زمین پر سمنگان دکھائی نہ دے گا۔

قسم خورشید کی نوری زہ جس کے بدن پر ہے
قسم مہتاب کی جو دسب شب کا گرز پُزر ہے
قسم ہے کھکشاں کی، جو کمان چرخِ اخضر ہے
قسم ہے آسماں کی، جو شفق کے خون سے تر ہے
دکھائی دو گے یوں تم آبِ خنجر کی روانی میں
بہیں آتشِ زدہ کشتی کے تختے جیسے پانی میں

شاہ سمنگان: تو اس دعوے سے باتیں کر رہا ہے۔ گویا تباہی تیرے اشارے اور موت تیرے غصے کا نام ہے۔ انسان اتنا خوفناک نہیں ہوتا۔ میں تیرا نام جانتا چاہتا ہوں؟

رستم سہراب

رستم : میرا نام سننے ہی اس دربار کی دیواریں کانپ اٹھیں گی۔ یہ شراب اور غرور کے نشے سے سرخ چہرے زرد ہو جائیں گے اور تو آندھی کے تھپڑے سے ہل گئے ہوئے درخت کی طرح تھر تھراتا ہوا تخت سے نیچے گر پڑے گا۔

روح یوں لرزے گی گویا دب گئی ہے برف میں
اس قدر ہیبت ہے میرے نام کے ہر حرف میں
شور سے گونجا ہوا ہر شہر، ہر دیرانہ ہے
نام میرا شیر کا اک نعرۂ مستانہ ہے

شاہ سمنگان : چاہے تیرے نام کے ہر حرف میں ایک زلزلہ اور ہر نقطے میں ایک کوہ آتش فشاں پوشیدہ ہو۔ چاہے تیرا نام سننے ہی ہمارے کانوں کے پاس ہزاروں بادل ایک ساتھ گرج اٹھیں، پھر بھی ہم تیرے نام سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

رستم : ان بازوؤں کی طاقت نے شہرت کی سنہری روشنائی سے ایران اور توران کے ذرے ذرے پر میرا نام لکھ دیا ہے۔ میں سام و زریمان کا جگر بند، زال و روداہ کا فرزند، زابلستان کا جبار، فارس کا مددگار۔

شاہ یکاؤس کے اقبال کی تنویر ہوں
فاتح ملک شجاعت، مالک شمشیر ہوں
تیر و ترکش میرے خادم، گرز ہے ہدم مرا
کام ہے میدان نوازی نام ہے رستم مرا

(سب چونک پڑتے ہیں۔ بادشاہ گھبرا کر تخت سے اتر آتا ہے)

شاہ سمنگان : (تخت سے اترتے ہوئے) رستم! رستم!! کیا وہی رستم جس کی عظمت مآب ہستی پر آج ایران فخر کر رہا ہے؟ جس کے کوہ حکم بازوؤں کے سامنے دنیا کی تمام طاقتیں اپنی کمزوری اور مجبوری کا اقرار کر رہی ہیں؟ جس کی تلوار فاتحین عالم کے جسوں سے روجوں کا خراج طلب کر رہی ہے؟

رستم : ہاں۔ میں وہی رستم ہوں۔ گھوڑا دو یا جنگ کرو۔ بولو۔ زندگی اور موت دونوں میں کسے پسند کرتے ہو؟

شاہ سمنگان : نامور رستم۔ ایرانی اور تورانی کھواروں کے ٹکرانے کی جگہ شاہی دربار نہیں میدان جنگ ہے۔ آئیے۔ بیٹھیے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں — میں میزبان اور دوست کی حیثیت سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

رستم : اس دنیا میں میرا سب سے بڑا دوست میرا وفادار گھوڑا ہے۔ جب تک وہ نہ مل جائے، میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔

شاہ سمنگان : آپ دو روز کے لیے ہماری مہمانی قبول کیجیے۔ گھوڑا موجود ہے۔ سمنگان سے رخصت ہونے کے پہلے آپ کا گھوڑا، آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔

رستم : اپنا وعدہ پورا کرو گے؟

شاہ سمنگان : اگر انسان ہونے کا دعویٰ ہے۔

رستم : مہمان بنا کر دھوکا تو نہ دو گے؟

شاہ سمنگان : اگر کمینہ کہلانے کی شرم ہے۔

رستم : اپنی دوستی کا ثبوت دو۔

میلسم : ٹھہریے، جلالت مآب ٹھہریے۔ اس تاج و تخت کی حفاظت کرنے والے جاں

نثاروں کی طرف سے سمنگان کی وفادار رعیت کی طرف سے، تورانیوں کی

حمیت اور غیرت کی طرف سے، یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ آپ کس

کی مرضی سے توران کے سب سے بڑے دشمن کو اپنا مہمان بنا رہے ہیں؟

شاہ سمنگان : اس سوال کا مطلب؟

میلسم : جس طرح رعایا اپنے بادشاہ کی اطاعت گزار ہوتی ہے، اُسی طرح بادشاہ بھی،

ملک کی آواز اور رعیت کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔ جب تک بادشاہ اور

رعیت کی رائے و خواہش میں اتفاق نہ ہو، حکومت کی عمارت امن و اطمینان

کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتی۔

شاہ سمنگان : میں دوبارہ پوچھتا ہوں کہ ان لفظوں کا کیا مطلب ہے؟

رستم سہراب

عظیم : آسمان کی سلطنت میں تھا حکومت کرنے والے آفتاب کی طرح آپ خود مختار و آزاد نہیں۔ بلکہ آفتاب سے روشنی اکتساب کرنے والے چاند کی مانند، توران کے شہنشاہ افراسیاب کے زیر اثر و ماتحت ہیں۔ اس لیے توران کے دشمن کو مہمان بنا کر، دنیا میں تورانیوں کو بزدل اور بے حمیت ثابت نہ کیجیے۔ اس شرم ناک جرأت کو نہ سمجگان کی رعیت معاف کرے گی اور نہ توران کا شہنشاہ افراسیاب۔

رستم : افراسیاب! کون افراسیاب؟ — وہی جو صد ہا مرتبہ اپنی نامردی سے میدان جنگ کو ذلیل کر چکا ہے۔ جو کتنی ہی بار، رستم کی تلوار سے زندگی کی بھیک مانگ چکا ہے۔ جو زندوں کی دنیا میں صرف اپنی ذلت اور شکست پر آنسو بہانے کے لیے جی رہا ہے۔

سرکشی میں جو فلک ہے، روندے جانے میں زمیں
جس میں ہمت ہے نہ غیرت، جس کی دنیا ہے نہ دیں
جا۔ ذرا اس کو، جو تجھ سا بزدل و نامرد ہے
وہ ترا افراسیاب، ان ٹھوکروں کی گرد ہے

عظیم : (درباریوں سے) جس کے پہلے ہی لفظ پر تلوار کو میان سے تڑپ کر باہر نکل آنا چاہیے تھا۔ اس کی یاوہ گوئی کا جواب دینے کے لیے ابھی تک تمھاری زبانوں اور ہاتھوں کو حرکت نہیں ہوتی!! کیا تم بے حس ہو۔ مردہ ہو۔ انسان نہیں، زندگی کے خیالی سائے ہو؟

شرم ہے تم پر -- اگر دنیا میں یہ زندہ رہے
ہاں بڑھو -- توران کا اقبال تابندہ رہے

(عظیم اور اس کے ساتھی رستم پر حملہ کرتے ہیں۔ رستم حملہ آوروں کو شکست دینے کے بعد عظیم کو زمین پر گرا کر خنجر نکالتا ہے۔ شاہ سمجگان رستم کا ہاتھ تھام کر التجا آمیز نگاہوں سے عظیم کے لیے رحم طلب کرتا ہے)

پہلا ایکٹ - تیسرا سین

سمنگان کا شای محل

(شہزادی تہینہ اور کنیریں آتی ہیں)

تہینہ : نیلا آسمان، ہنسا ہوا چاند، جھلگاتے ہوئے تارے۔ کتنی حسین رات ہے۔ دن کے سوتے ہی دنیا کی خوبصورتی جاگ اٹھتی ہے — یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ درخشاں نظارہ قدرت کی شاعری ہے اور رات چاندنی کی چادر اوڑھے ہوئے اس حسین شاعری کا مطالعہ کر رہی ہے۔

کنیرا : اور مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سمنگان کی شہزادی کے حسن کا مقابلہ کرنے کے لیے، نیلم کے تحت پر بیٹھی ہوئی رات کی ملکہ۔ چاند کا آئینہ سامنے رکھ کر اپنے سیاہ بالوں میں تاروں کے موتی پرو رہی ہے۔

تہینہ : تم نے میرے حسن کی تعریفیں کرنا کس سے سیکھا؟

کنیرا : حسن کے مصاحب سے۔

تہینہ : کون مصاحب؟

کنیرا : آپ کا آئینہ۔ وہی آئینہ جس کے اندر آپ کا چہرہ اس طرح نظر آتا ہے، گویا چاندی کے چشمے میں سونے کا پھول تیر رہا ہو۔

تہینہ : آئینہ تو خوشامدی ہوتا ہے۔

کنیرا : معاف کیجیے۔ وہ بدصورت چہرے کی کبھی خوشامد نہیں کرتا۔

تہینہ : اری بیوقوفو! عورت کا حسن وہم کا خواب، خیال کی حماقت، یقین کی دیوانگی ہے۔ وہ خوبصورتی جو عمر بڑھنے کے ساتھ کم ہو جاتی، ڈوبتے ہوئے دن کی

رستم سہراب

روشنی کی طرح پھمکی پڑ جاتی اور بجلی کی طرح چمک کر، پھول کی خوشبو کی طرح اڑ جاتی ہے۔ میں اُس آنی اور فانی خوبصورتی کو عورت کے ساتھ جوانی کا مذاق سمجھتی ہوں۔

بہار دل ربائی، ایک دھوکا، ایک سایہ ہے
یہ کچا رنگ مٹی کے کھلونوں پر چڑھایا ہے
کہاں کا حُسن؟ پاگل ہے جو اترائے جوانی پر
ہوا سے بن گئی ہیں کچھ لکیریں، بے پانی پر

(ایک اور کنیز آتی ہے)

کنیز ۲: حضور۔ سننے ہی اچوک اٹھے گا۔ میں آپ کے لیے اس پرانی دنیا کی ایک نئی خبر لائی ہوں۔

تہینہ: نئی خبر!

کنیز ۲: جی ہاں۔ نئی، اچھوتی، کنواری خبر۔ اس دنیا کے سارے جھگڑوں کی جڑ تین چیزیں ہیں۔ زر، زمین، زن۔ سلطنت کے لیے، دولت کے لیے، عورت کے لیے تو لڑائیاں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن ایک گھوڑے کے لیے خون خرابہ ہوتے آج ہی دیکھا۔

تہینہ: لڑائی ہوئی! — کہاں؟

کنیز ۲: دربار میں۔

تہینہ: کس سے؟

کنیز ۲: ہمارے وزیر جنگ عیلم اور ایران کے سپہ سالار رستم سے۔

تہینہ: ایران کے دربار کی زینت رستم، سمنگان کے دربار میں کیسے آگیا؟

کنیز ۲: اپنے کھوئے ہوئے گھوڑے کی تلاش میں۔

تہینہ: تو لڑائی کی وجہ؟

کنیز ۲: انسانیت و شرافت کا فرض سمجھ کر ہمارے بادشاہ نے گھر آئے ہوئے قومی

دشمن کو مہمان بننے کے لیے دعوت دی۔ اس دعوت کو عیلم اور اس کے ہم

خیال سرداروں نے توران کی بے عزتی سمجھا۔ اسی بنیاد پر بات بڑھ گئی اور ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔

تہینہ : کہاں رستم اور کہاں سمنگان! تو ضرور کوئی خواب دیکھ کر آئی ہے۔
کنیرہ : تلواروں کی گھٹا میں رستم کو بجلی کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر مجھے بھی اس نظارے پر خواب ہی کا دھوکا ہوا تھا۔ لیکن اپنے حریف کو شکست دینے کے بعد، جب رستم کو جہاں پناہ کے ساتھ آرام کے لیے محل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ تب یقین ہوا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہی، جاگ رہی ہوں۔

تہینہ : وہ سمنگان میں کب تک رہے گا؟
کنیرہ : پرسوں شام تک۔ کیونکہ گھوڑے کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے بادشاہ نے دو روز کا وعدہ کیا ہے۔

تہینہ : میں برسوں سے رستم کا پُر جلال نام اور اُس کی جرأت و دلیری کے عجیب و غریب کارنامے سن رہی ہوں۔ جب دشمن بھی بے اختیار ہو کر اس کی بے مثال بہادری کی تعریف کرتے ہیں تو میں سوچ میں پڑ جاتی ہوں، کہ وہ کتنا اقبال مند اور کیسا شاندار آدمی ہوگا۔ جس کی شہرت نے تمام دنیا کو فتح کر لیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار اسے چھپ کر دیکھوں اور معلوم کروں کہ دنیا اس کی اتنی تعریف اور اتنی عزت کیوں کر رہی ہے؟

کنیرہ : آپ رستم کو دیکھنا چاہتی ہیں؟
تہینہ : اگر ممکن ہو — لیکن چھپ کر — اور وہ بھی صرف ایک بار۔
کنیرہ : لیکن یہ خیال رہے کہ رستم نے دنیا کو فتح کرنے کی قسم کھائی ہے۔ آپ بھی دنیا کی حسین ترین شے ہیں۔ کہیں وہ محبت کی طاقت سے آپ کو بھی فتح نہ کر لے۔

تہینہ : تو مجھ سے مذاق کرتی ہے۔
کنیرہ : یہ مذاق نہیں، پیشین گوئی ہے۔ کیونکہ میں حسن و عشق کی قیمت کا حال بتانے والی نجومی ہوں۔

پہلا ایکٹ - چوتھا سین

آراستہ خواب گاہ

(رات کا وقت ہے۔ خواب گاہ کی کھڑکیوں سے شہر سمنگان کے گھروں کی روشنیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ شاہ سمنگان اور رستم بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور چند غلام قریب ہی ہاتھ باندھے حکم کے منتظر کھڑے ہیں)

شاہ سمنگان : عیلم کی زندگی اسے واپس دے کر آپ نے ثابت کر دیا کہ جو بہادر ہوتا ہے، وہ رحم دل بھی ہوتا ہے۔ ہاتھ میں انتقام کا حربہ اور بازوؤں میں سزا دینے کی طاقت ہو کر دشمن کو معاف کر دینا، یہ دنیا کی فتوحات میں سب سے بڑی فتح ہے۔

رستم : لیکن معافی ملنے کے بعد بھی عیلم کا چہرہ حسد کی آگ کے دھوئیں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ میرا تجربہ اس یقین کی طرف رہنمائی نہیں کرتا کہ وہ میری عطا کردہ معافی کی قدر کرے گا۔

شاہ سمنگان : اگر قدر نہ کی تو میں سمجھوں گا کہ اُسے اپنے کندھوں پر اپنا سر بوجھ معلوم ہو رہا ہے۔ (شراب کا پیالہ بڑھا کر)۔

ہاں نگاہ لطف ہو اس ساغر لبریز پر
کیجیے ہونٹوں سے مہر الفت کی دستاویز پر

رستم : (جواب میں پیالہ بھر کر) آپ بھی دوستی کی دستاویز کی شرط پوری کیجیے۔

موج شراب مست ہے جام شراب میں
اک نازنین جھوم رہی ہے شاب میں
گردش میں بلبلے ہیں، کہ تاروں کا رقص ہے
سرخ ہے یا کھلی ہے شفق آفتاب میں

شاہ سمنگان : اب رات کی آنکھوں میں نیند کا غمار دکھائی دے رہا ہے۔ اجازت دیجیے
کہ میں آپ کو شب بخیر کہوں؟
رستم : اس میزبانی کا شکریہ۔
شاہ سمنگان : میری دعا ہے کہ آپ آرام کی نیند سوئیں اور مسرت کا خواب دیکھ کر ہنستے
ہوئے بیدار ہوں۔

(شاہ سمنگان غلاموں کے ساتھ جاتا ہے)

رستم : موت کیا ہے؟ ایک لمبی نیند — اور نیند کیا ہے؟ ایک مختصر موت — سوتا
اور مرنا، دونوں ہی موت کی دو شکلیں ہیں۔ لیکن کیسے تعجب کی بات ہے کہ
انسان، ایک کو آرزو اور التجاؤں سے بلاتا اور دوسرے کا نام سنتے ہی خوف
سے کانپ اٹھتا ہے۔ (پلنگ پر بیٹھ کر) ۔

آسماں کے ہاتھ میں ہے چاند کا زریں ستار
گوںخ اُنھے نغمہٴ راحت سے اس کا تار تار
رات تھوڑی رہ گئی ہے، صبح ہے جانا مجھے
ہاں سناؤ۔ اے ستارو! نیند کا گانا مجھے

(رستم سو جاتا ہے۔ عیلم اپنے ہمراہیوں کے ساتھ چوروں کی
طرح داخل ہوتا ہے)

عیلم : خاموش۔ آہستہ۔ پیروں کے نیچے کی زمین بھی تمہارے پاؤں کی آواز نہ
سن سکے۔

ہمراہی ۱: ہاتھ میں چمکتے ہوئے خنجروں کی طرح، ہمارے پاؤں بھی ہمارے قبضے میں

ہیں۔ بڑھو۔

عظیم : ٹھہرو — بڑھنے سے پہلے اپنی احمیت اور ہمت کا ایک بار پھر امتحان کر لو۔
رستم کے ہاتھ سے سر دربار ذلیل ہونے کے بعد، قسمت کا ایک طرف فیصلہ
سمجھ کر تم اپنی بے عزتی پر صبر کر چکے تھے۔ لیکن میں نے اپنی شجاعت آمیز
تقریر سے تمہاری روح پر شرم کی ضرب لگا کر سوئے ہوئے جذبہ غیرت کو
بیدار کیا۔ تمہاری مردہ ہمتوں میں جان ڈالی۔ تمہارے خون میں جو پانی بن
گیا تھا، پھر سے سرخی اور گرمی پیدا کی اور تم سب نے اپنی ذلت کا بدلہ
لینے کے لیے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی.....

ہمراہی ۲ : دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنی ذلت بھی یاد ہے۔ اور قسم بھی۔
ہمراہی ۳ : دنیا کا خیال ہے کہ سیاہ چیز پر کوئی رنگ نہیں چڑھتا۔ آج ہم اس خیال کو
غلط ثابت کرنے کے لیے، رستم کے خون سے رات کی سیاہ چادر کو سرخ
بنانے آئے ہیں۔

عظیم : تب جاؤ۔ پہلے اُس کے گزر اور ترکش پر قبضہ کر لو (ساتھی رستم کے گرزو
ترکش کو اٹھا لیتے ہیں) دیکھتے ہو، کس اطمینان اور آرام کے ساتھ سو رہا
ہے۔ دشمنوں کے ملک میں، دشمنوں کی چھت کے نیچے تم نے کسی انسان کو
اس طرح نڈر ہو کر سوتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا۔ گویا یہ فیصلہ کرنے کے بعد
سویا ہے کہ دنیا میں اور سب کچھ ہے، لیکن فکر خوف اور موت نہیں ہے۔

(عظیم رستم کو چھری مارنے جاتا ہے۔ تہینہ کی آہٹ سنائی
دیتی ہے)

ہمراہی ۱ : ہوشیار کوئی آرہا ہے۔

عظیم : یہ کون؟ تہینہ! — رستم کی خواب گاہ میں سمنگان کی شہزادی۔ جس طرح
اس کے باپ نے دشمن کو مہمان بنا کر سارے تودان کو بے عزت کیا، کیا اسی
طرح یہ بھی جوانی کے نشے سے اندھی ہو کر رستم کی آغوش میں اپنے حسن و
عصمت کو ذلیل کرنے آئی ہے!!!۔

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

ہمراہی ۲: ہم نے تو سنا تھا کہ صورت کی طرح اس کی سیرت بھی حسین ہے۔
ہمراہی ۳: چھپ جاؤ اور سنو۔ اس کی باتوں سے اس کا ارادہ ظاہر ہو جائے گا۔
ہیلم: اگر یہ ناپاک ارادہ اور پُر گناہ خیال لے کر یہاں آئی ہے تو قسم ہے
سمنگان کی عزت کی۔

نہ رہنے دوں گا کوئی نقش اس شای جگینے میں
یہ خنجر بھونک دوں گا سب سے پہلے اس کے سینے میں
ہزاروں کھیل دیکھے، دیکھنا تم یہ تماشا بھی
ترہتا ہوگا رستم کے بغل میں اس کا لاشہ بھی

(سب چھپ جاتے ہیں۔ تہینہ خوفزدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی
ہوئی داخل ہوتی ہے)

تہینہ: شرم اور دل کی جنگ کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ شرم کہتی ہے، لوٹ چل اور
دل کہتا ہے آگے بڑھ (سوچتی ہے) اگر وہ جاگ کر پوچھ بیٹھا کہ تم کون
ہو؟ کیوں آئی ہو؟ تو دیوانوں کی طرح حیرت سے اس کا منہ تنکے یا شرم
سے سر جھکا لینے کے سوا اور کیا جواب دے سکوں گی — نیند، میٹھی نیند۔
تیری پلائی ہوئی شراب سے رستم کی آنکھیں مدہوش ہو رہی ہیں۔ میں التجا
کرتی ہوں کہ میرے واپس جانے تک تو اس نشے کو قائم رکھ۔ ہمت مجھے
سہارا دے۔ (آہستہ آہستہ قریب جا کر رستم کو دیکھتی اور حیرت زدہ رہ جاتی
ہے) میں سمجھتی تھی کہ ایسا چہرہ دیکھوں گی جس کے نقش و نگار میں شیر کی
ہیبت، موت کی سختی، دوپہر کی دھوپ کا جلال اور آسمان کا غرور دکھائی دے
گا۔ لیکن کیا دیکھا؟ نیند کی انگوشی میں ایک بیش قیمت ہیرا، جو بہادری، نیکی،
شرافت کی روشنی سے چمک رہا ہے۔ ایک زمین کا چاند جس کے سامنے
آسمان کا چاند بھی کرنوں کا دامن پھیلا کر مردانہ حسن کی بھیک مانگ رہا
ہے۔

رستم سہراب

تجلی صبح کی اور دبدبہ ہے بادشاہوں کا
یہ چہرہ دیکھنے سے نور بڑھتا ہے نگاہوں کا
(تہینہ جھک کر غور سے رستم کو دیکھتی ہے۔ رستم جاگ اٹھتا ہے)

رستم : (پلنگ سے دھیرے دھیرے اٹھ کر) آنکھوں! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں!۔

بہار روح ہے، یا نور، صبح زندگانی کا
تبسم چاند کا، یا نشہ ہے جام جوانی کا
عجب چہرہ ہے، جس کو حسن کی کرنوں نے گھیرا ہے
یہ جلوہ ہے کہ جادو، چاندنی ہے یا سویرا ہے
(تہینہ جانا چاہتی ہے۔ رستم اسے روکتا ہے)

ٹھہرو ——— اندھیری رات میں حسن کا چراغ لے کر آنے والی حینہ ٹھہرو
تم — تم — کون ہو؟ —

تہینہ : اس سے زیادہ آپ کو جاننے کی ضرورت نہیں کہ میں سمنگان کی ایک شریف
لڑکی ہوں۔

رستم : تمہارا نام؟

تہینہ : تہینہ۔

رستم : اور جس کی زندگی کے باغ میں یہ حسین پھول کھلا ہے۔ اس باغبان کا نام؟

تہینہ : شاہ سمنگان۔ (رستم چونکتا ہے) دوست اور دشمن ہر ایک کی زبان اقرار کرتی

ہے کہ آپ انسانوں میں عظیم ترین انسان اور دنیا کی پرستوت ہستیوں میں
عجیب و غریب ہستی ہیں۔ آپ کے حوصلے اور جرأت کے قصے سن سن کر
میرے دل میں مدت سے خواہش تھی کہ دنیا کے سب سے زیادہ اقبال مند
اور تلواریں طاقت کے تنہا مالک کی ایک بار زیارت کروں — آج وہ تمنا
کامیاب ہوئی۔ اجازت چاہتی ہوں۔

(دھیرے دھیرے دروازے کی طرف لوٹتی ہے)

کلیات آغاشر کا شیری - جلد چہارم

رسم : جس کی زبان آج تک شکست کے لفظ سے آشنا نہیں ہوئی، کیا میں وہی رسم ہوں۔ اودہ — کتنا عجیب انقلاب!! دنیا کے فاتح کو آج ایک عورت کے حسن نے فتح کر لیا ہے۔

یہی ہے جس سے ہر شے ہے حسین و زورگار اتنی
کہاں سے لائی دنیا، ورنہ حسن اتنا، بہار اتنی
سنو۔ ٹھہرو۔ چلیں منہ پھیر کر کیوں خستہ جانوں سے
سمنگاہ کا یہی دستور ہے کیا سیمہانوں سے

تہینہ : سمنگان اچھی طرح اپنے مہمانوں کی عزت کرنا جانتا ہے۔ کیا یہ مہمانی آپ کے لیے زحمت و تکلیف کا باعث ہوئی۔
رسم :

ہو گیا بے گانہ کیوں، آرام و ضبط و ہوش سے
پوچھیے یہ حال میری حیرت خاموش سے
جب سے میں جاگا ہوں، لب ہیں اور آو سرد ہے
جس جگہ پہلو میں دل تھا اب وہاں پر درد ہے

تہینہ : مرض سے بے پروائی مرض کا علاج نہیں ہے۔ اجازت دیجیے کہ میں شاعری حکیم کو طلب کروں۔

رسم : روح کی بیماری کا علاج پیغمبر کرتے ہیں۔ جسم کی بیماری کا علاج حکیم کرتے ہیں۔ اور دل کی بیماری کا علاج محبت کی نظر کرتی ہے۔
بس اب اس زندگی میں زندگی کا مدعا تم ہو
مرے غم کی شفا تم ہو، مرے دل کی دوا تم ہو

(تہینہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

تہینہ : (غصے سے جھٹکا دے کر) میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ تمہاری شرافت پر اعتماد کرنا میری غلطی تھی۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ تمہارا ظاہر آفتاب کی طرح روشن اور

رستم سہراب

باطن رات کی طرح تاریک ہے۔ یاد رکھو عورت کا جسم کمزور ہے لیکن غیرت سے لبریز عورت کی روح کمزور نہیں ہے۔ اپنی عصمت و آبرو کی حفاظت کے وقت سمگان کی ہر شریف لڑکی رستم سے زیادہ طاقت ور ہے۔

رستم : (حیرت سے) یہ کیا! — رستے قائم کرنے میں عورت کی عقل اتنی جلد باز ہوتی ہے! تعجب ہے کہ تم نے پاک محبت کے اظہار کو جرم کی نمائش اور سیہ کار دل کی آواز سمجھا۔ میں مکینہ نہیں۔ شریف ہوں۔ شریف اپنے ہی خون سے اپنے جسم کو رنگ دے گا لیکن ذلت کے دھبوں سے اپنے نام و عزت کو داغ دار نہ کرے گا۔

تہینہ : معاف کرنا۔ میں یہ سمجھی.....

رستم : تم جو بھی سمجھیں۔ غلط سمجھیں۔ رواج، مذہب اور شادی کے مقدس قانون کے مطابق جو لڑکی میری قسمت میں برابر کی شریک ہو کر زندگی سے موت تک میرے رنج و راحت کی حصہ دار ہوگی، اس کے سوا رستم ہر جوان لڑکی کو اپنی بہن اور ہر بوڑھی عورت کو اپنی ماں کے برابر قابل احترام سمجھتا ہے۔

کبھی ہوگا نہ داغ جرم سے چہرہ نجل میرا
نہ گندی ہے نظر میری، نہ ہے ناپاک دل میرا

تہینہ : دنیا کی ہر دو شیزہ لڑکی، آپ جیسے شریف اور بہادر کی کنیز بننا اپنی خوش نصیبی سمجھے گی۔ لیکن اس بات کو فراموش نہ کیجیے کہ میں تورانی ہوں اور آپ ایرانی۔

رستم : تو کیا محبت کو ایران اور توران کے لفظوں میں قید سمجھتی ہو؟ محبت ملک و قوم کے خیالات کی بھڑی، جماعت کی رائے کی پابندی، رواج کی غلامی، رسوں کی اطاعت نہیں کرتی۔ محبت کا کوئی مذہب، کوئی قانون، کوئی قوم، کوئی وطن نہیں ہے۔ محبت خدا کے رحم کی طرح ذات اور قوم کو نہیں، صرف دل کی خوبیوں کو پہچانتی ہے۔ محبت مذہبی تعصب، کلی نفرت، قومی دشمنی، ذاتی غرور،

ہر تاریکی کو آفتاب کی روشنی بن کر دور کر دیتی ہے۔ محبت پورب اور بچہم کی طرف بہتے ہوئے دو دریاؤں کو ایک بنا کر، ایک ہی راستے پر چلنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔

محبت کی نگاہوں میں اندھیرا بھی سویرا ہے
نہ تورانی، نہ ایرانی، نہ میرا ہے نہ تیرا ہے
نئی تحریر لکھیں آؤ! قسمت کے نوشتے میں
زباں سے ہاں کہو، بندھ جائیں دو دل ایک رشتے میں

تہینہ: اس بات کا جواب دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ ایشیا کی لڑکی، شادی کے بعد شوہر کی اور شادی کے پیشتر والدین کے حکم کی اطاعت کرتی ہے۔
رستم: رستم اور تہینہ کی شادی ممکن ہے کہ ایران کے بادشاہ کیکاؤس اور توران کے شاہ افراسیاب کی دیرینہ دشمنی کو پائدار محبت سے بدل کر ایران و توران کو ہمیشہ کے لیے گلے ملا دے۔ اس لیے مجھے کامل یقین ہے کہ تمہارے دور اندیش و صلح پسند والد اس رشتے کو جس سے دونوں ملک امن و محبت کی برکتوں سے فردوس ارضی بن جائیں گے، ضرور منظور کریں گے۔ یہ شادی جنگ کی دنیا میں دائمی صلح کا اعلان، خیالات کی تبدیلی کا نوروز، عداوت کے تاریک افق پر محبت کی صبح کا طلوع ہے۔

نامیدوں کو نوید راحت و آرام دیں
ایک ہو کر آؤ دنیا کو نیا پیغام دیں

(تہینہ شرما کر سر جھکا لیتی ہے۔ حلیم اپنے رفیقوں کے ساتھ پوشیدہ مقام سے باہر نکلتا ہے)

حلیم: غافل ہے۔ ہانده لو۔

(حلیم کے ساتھی عقب سے رستم کو موٹی زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں)

تہینہ : تم کون؟

رستم : یہ کیا؟

عیلم : غرور کا جواب۔ توران کی ذلت کا بدلہ۔

تری نخوت، تری تقدیر نے دھوکا دیا تجھ کو
سنگاں کی زمیں پر لائی تھی تیری قضا تجھ کو
نہ کوئی دوست ہوگا اب نہ کوئی ہم وطن ہوگا
زمین تیرا جنازہ، آسمان تیرا کفن ہوگا

رستم : احسان فراموش، دعا باز، جس طرح کتے کے سامنے روٹی کا ٹکڑا پھینک دیتے
ہیں اسی طرح میں نے دربار میں تیری جھینٹی ہوئی تلوار اور تیری حقیر زندگی
رحم کر کے تجھے دے دی تھی۔ اگر تیری ماں کے دودھ میں غیرت کا ایک
قطرہ بھی ہوتا، تو ذلت کو بے حیائی کی فتح سمجھ کر دوبارہ میرے روبرو آنے
کی کبھی جرأت نہ کرتا۔

گیڈر نے بھر سے روپ بھرا ہے ہے دلیر کا
چہرہ لگا کے آیا ہے گردن پہ شیر کا
آنکھیں ہیں لال، خوف سے، پر رنگ زرد ہے
بے شرم! تو شریف و جری ہے، نہ مرد ہے

عیلم : اب یہ بکواس اس زنجیر کے لوہے میں نری اور اس دل میں تیرے لیے رحم
نہیں پیدا کر سکتیں۔

مری شرافت پہ کرلے حملے، دہن میں جب تک ترے زباں ہے
یہ لن ترانی، یہ بد زبانی، بھی ہوئی آگ کا دھواں ہے

رستم : شرافت؟ ان قدموں میں بیٹھ کر جن ہونٹوں سے اپنے بزدل اور ذلیل ہونے
کا اقرار کر چکا ہے، ان ہونٹوں سے شرافت کے لفظ کو بے عزت لگے کر۔
کہنے تو اس دنیا ہی میں پیدا نہیں ہوا جس میں شرافت اور شریف رہتے
ہیں۔

بے غیرتی کی آگ سے دوزخ ہے دل کا گرم
بازو میں تیرے زور، نہ آنکھوں میں تیری شرم
اس کا بدن کثیف، ترا دل کثیف ہے
کتا گلی کا تھ سے زیادہ شریف ہے

ہیلم : ہاتھی کو پکڑنے کے لیے جنگل میں گڑھا کھودنا، سامنے سے آتے ہوئے شیر
پر دور سے تیر چلانا، بھیڑیے کے پنجے میں پنجہ ڈال کر لڑنے کے بدلے
دس قدم پیچھے ہٹ کر اسے برچھا مارنا، اگر یہ نامردی اور کمینہ پن نہیں ہے
تو دشمن کو شمشیر کے بدلے، تدبیر سے شکست دینا بھی شرافت کے خلاف
نہیں ہے۔

فتح پانے کے لیے یہ آخری اوزار ہے
گرز و خنجر کی طرح دھوکا بھی اک ہتھیار ہے

رستم : دھوکا شیر دل شریفوں کا نہیں، لومڑی کا دل اور بچھو کی روح رکھنے
والے کمینوں کا حربہ ہے۔ ایک شریف دعا اور فریب سے دشمن پر فتح
حاصل کرنے کو فتح نہیں، اپنی شرافت کی شکست اور اپنی تلوار کی بے
عزتی سمجھتا ہے۔

جری کو آمد اور جان پیاری ہے کینے کو
بہادر جانتا ہے موت بے شری کے جینے کو

ہیلم : اب تیرا جینا اور مرنا دونوں ہمارے قبضے میں ہے۔ اپنی روح سے کہہ کہ جسم
سے نکل کر موت کی پیشوائی کرے۔

(رستم کے سینے میں تلوار بھونکنے کے لیے بڑھتا ہے)

تہینہ : خبردار — (ہیلم کی کھائی میں زور سے گھونسنہ مارتی ہے۔ اُس کے ہاتھ
سے تلوار چھوٹ کر گرتی ہے اور تہینہ تلوار پر پاؤں رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)
انسانیت کی پیشانی پر شرم کے دھبے! تو شیر کو دھوکے سے زنجیر میں جکڑ کر

رستم سہراب

اس کے خون سے اپنی ذلیل تلوار کے منہ پر بہادری کا غازہ ملنا چاہتا ہے۔
زوف ہے تمھ پر — مجھے آج معلوم ہوا کہ سمنگان کی مائیں تیرے جیسے
کینے لڑکے بھی پیدا کرتی ہیں۔

چاہتا ہے تو کہ سر جھک جائے سارے ملک کا
نام رسوا کر رہا ہے تو ہمارے ملک کا
یہ فریب، اتنا حسد، انسان کو انسان سے
یوں دغا کرتے نہیں حیوان بھی مہمان سے

ہیلسم : بدکار! بدچلن!! ملک کے دشمن کو اپنی عزت نذر کر دینے کے بعد ہمیں ملک
کی عزت کرنا سکھا رہی ہے۔

تہینہ : بدکار۔ بدچلن؟ کیا کہا؟ موذی، نمک حرام۔

(غصے میں دوڑ کر ہیلسم کا گلا پکڑ لیتی ہے)

ہیلسم : (گلا چھڑا کر) باندھ لو۔

(ہیلسم کے دو ساتھی دو طرف سے تہینہ کی کلا یاں پکڑ لیتے ہیں)

تہینہ : (ہاتھ پکڑنے والوں سے) چھوڑ دو۔ کینو مجھے چھوڑ دو۔ اس پاجی کو اپنے
گندے منہ کے ہر لفظ کا ثبوت دینا ہوگا۔ میں اس سے اپنی عزت کا جواب
مانگتی ہوں۔

رستم : بد بخت و بیوقوف رحم و درگزر کو بھی مجبوری سمجھتے ہیں — ادھر دیکھ —
ہیلسم! میری برداشت پر غلط بھروسہ نہ کر۔ میں اور سب کچھ دیکھ سکتا
ہوں۔ لیکن بچے کی تکلیف، بوڑھے پر ظلم اور عورت کی بے عزتی کبھی نہیں
دیکھ سکتا۔

ہیلسم : —

دیکھنا ہی ہوگا، جو کچھ ہے تری تقدیر میں
دیکھنے ہی کے لیے باندھا ہے اس زنجیر میں

رستم : ۔

باندھ رکھے کے لے کافی یہ تدبیریں نہیں
گھاس کے پتے ہیں یہ لوہے کی زنجیریں نہیں
(زنجیر توڑ کر گرز اٹھانے کے لیے دوڑتا ہے)

گرز و ترکش کیا ہوئے؟ اچھا میری ہمت تو ہے
ہاتھ میں حربہ نہیں، پر ہاتھ میں طاقت تو ہے
(گرز نہ پا کر چھت کا ستون کھینچ لیتا ہے اور اسی سے عیلم اور
اُس کے ساتھیوں پر حملہ کرتا ہے)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ - پہلا سہین

توران کا شای محل

(ہومان، بارمان اور تورانی فوج کے سردار بادشاہ کا انتظار کر رہے ہیں)

ہومان : انسان کے خون اور سروں کی بارش کے بعد جنگ کا آسمان صاف ہو گیا تھا۔ موت تھک کر سو گئی تھی۔ زندگی سلامتی کے سائے میں اطمینان کی سانس لے رہی تھی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ صلح کے خاموش سمندر میں پھر طوفان آیا چاہتا ہے۔

بارمان : شای فرمان کے بموجب تورانی فوج کے بارہ ہزار مچلے سپاہی زرہ بکتر پہنچے، لگا میں ہاتھوں میں لیے، گھوڑوں کی پیٹھ پر دوسرے حکم کا انتظار کر رہے ہیں — معلوم نہیں کہ یہ تباہی اور بربادی پھیلانے والی انسانی آندھی کس طرف بھیجی جائے گی۔

ہومان : مودب۔ جہاں پناہ تشریف لا رہے ہیں۔
بارمان : چہرے سے ناراضگی اور غصہ ظاہر ہو رہا ہے۔ دیکھیں کیا حکم ہوتا ہے؟ ہونٹوں سے مہربانی برستی ہے یا بجلی؟

(وزیر سلطنت کے ساتھ جوش اور غصے کے عالم میں افراسیاب کا داخلہ)

افراسیاب : توران کے دیرینہ دشمن رستم کو اپنا مہمان بنا کر زبانِ عمل سے تورانیوں کی

جتنی کا دنیا میں اعلان کرنا، بے عزتی کو انتہائی درجے تک پہنچانے کے لیے اس کی غیر آسودہ خواہش نفسانی کو اپنی بیٹی تہینہ کا حسن و شباب نذر دینا، اس ذلت بخش شادی کے شرمناک نتیجے سہراب کی پیدائش کا حال پندرہ برس تک اپنے آقا و شہنشاہ سے پوشیدہ رکھنا، کیا یہ بجرمانہ جسارت نہیں ہے؟ کیا یہ تورانیوں کے احساس خودداری کی صریح توہین اور شہنشاہ توران سے علانیہ بغاوت نہیں ہے؟ سمنگان کے شاہی محل میں رہنے والے کتے، عاقبت بنی تیری سفارش کر رہی ہے۔ اس لیے میری رگ رگ میں گر جتا ہوا غصے کا طوفان، ایران کی تباہی تک خاموشی اختیار کرے گا — اس کے بعد تیرے لیے نہ معافی ہے، نہ زندگی — ہومان! — بارمان!!

بارمان : (دست بستہ) دلی نعت۔

افراسیاب : میرا حکم تھا کہ تورانی لشکر کے بارہ ہزار جنگ آزما، سامان حرب کے ساتھ سفر کے لیے پا پہ رکاب رہیں۔ — کیا مابدولت کے حکم ثانی کے لیے وہ مستعد اور گوش برآواز ہیں؟

ہومان۔ بارمان : (ہاتھ جوڑ کر) خداوند۔

افراسیاب : سمنگان کے بادشاہ کا نواسہ سہراب، جس کی تلوار کی جھنکار فتح و اقبال کو اپنا غلام بنانے کی دھمکی دے رہی ہے۔ کیساؤس کے پُرخوت سر کو شاہی تاج سے محروم کرنے کے لیے ایران کی زمین کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے روندنا چاہتا ہے۔ میرا خط اور تحفہ لے کر تم آج ہی بارہ ہزار تورانی نبرد آزماؤں کے ساتھ اس کے امداد و حوصلہ افزائی کے لیے سمنگان روانہ ہو جاؤ — — — — —
نوفز سہراب کا سینہ نئی امیدوں اور بلند ترین ارادوں سے معمور ہو رہا ہے۔ اس کی امیدوں کو اپنی جرأت افزا باتوں سے زندہ و مشتعل رکھنا۔ یہی تمھاری سفارت کا فرض خصوصی ہے۔ اس سے کہنا کہ تم اپنے شیر گیر ہاتھوں سے ایران کی مغرور چھاتی پر توران کی عزت کا جھنڈا گاڑنے جا رہے ہو۔ اس لیے توران کا شہنشاہ افراسیاب تمھاری کامیابی کے لیے دعا کرتا اور حصول فتح سے قبل ہی تمھیں ایران کے فتح کی مبارک باد دیتا ہے۔

رستم سہراب

ہومان : جہاں پناہ نے جو حکم دیا ہے، ہم دونوں غلام اس کے ایک ایک حرف کی تعمیل کریں گے۔

افراسیاب : سنو۔ قدردانی یا ہمدردی کے جذبے نے مجھے سہراب کی مدد پر آمادہ نہیں کیا۔ سانپ کا بچہ بھی سانپ ہی ہوتا اور بڑا اور توانا ہو کر سانپ ہی کی طرح ڈستا ہے۔ رستم کے خون و طاقت کا وارث سہراب زندہ رہا تو ایک دن وہ بھی توران کے عظمت و اقبال کے لیے سیلاب ادبار اور توران کے تاجدار کے لیے دوسرا رستم ثابت ہوگا۔ توران کے روشن مستقبل کی طرف مجھے ایک غیر محسوس تاریک سایہ بڑھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ پہلے جوان بیٹے کے ہاتھ سے بوڑھے باپ کو قتل کرا دوں۔ اس کے بعد دعوت میں بلا کر، زہر یا خنجر سے سہراب نما خطرے کا بھی خاتمہ کر دوں۔ اس لیے کوشش کرنا کہ جب تک میدان کارزار کی فضا قسمت کے آخری فیصلے کی گونج سے کانپ نہ اٹھے، باپ بیٹے ایک دوسرے کو شناخت نہ کر سکیں۔ پہلے رستم، پھر سہراب۔ دونوں کی موت ہی میں توران کی زندگی ہے۔ سمجھ گئے؟ جاؤ۔ دیوان خانے میں انتظار کرو۔ میں بہت جلد تجھے کی کشتیاں اور اپنا خط تمہارے پاس بھیجتا ہوں — سب کچھ فراموش ہو جائے، لیکن دو باتیں حافظے سے کم نہ ہوں — میرا حکم — اور اپنا فرض۔

ہومان۔ ہارمان : شاعی اقبال کی فتح۔

(دونوں سر جھکا کر جاتے ہیں)

افراسیاب : رستم اور سہراب کی جنگ اس حیرت زار دنیا کا ایک عجیب واقعہ ہوگا — شباب باخند و فرسودہ طاقت باپ۔ نوجوان، شجاعت پروردہ بیٹے کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ رستم گرمی کے موسم کا سوکھا ہوا دریا ہے اور سہراب دونوں کناروں سے چھلکتی ہوئی برسات کی ندی ہے۔ اُس کی جوانی کی شام ہو چکی اور اُس کی جوانی کی صبح ہو رہی ہے۔ اُس کی طاقت کا آفتاب چھڑے کی ٹکٹوں اور ٹھریوں کی لہروں میں ڈوب رہا ہے، اور اُس کی طاقت کا

آفتاب شباب کے افق رنگیں پر طلوع ہو رہا ہے۔ (وزیر سے) سنتے ہو۔ میرا حکم ہے کہ آج سے ہر وقت گھوڑوں کی پیٹھ پر زین اور تورانی سرفروشوں کے جسم پر زره بکتر اور ہتھیار سجے رہیں۔ رستم کی موت کی نوید ملتے ہی میں بجلی کی طرح ایران کے سر پر ٹوٹ کر اس کے ماضی کی شوکت، حال کے غرور، مستقبل کی تمناؤں کو ریزہ ریزہ کر دوں گا — اور وہی دن میری زندگی کا بہترین دن ہوگا۔

وزیر : اعلیٰ حضرت۔ یہ سلطنت کا قدیم نمک خوار حضور کی خیر سگالی اور ملک کی بہبودی کے لیے کچھ عرض.....

افراسیاب : خاموش۔ تو ہمیشہ عرض اور گزارش کی آڑ میں مابدولت کے جوش کو سرد کرنے کے لیے ناخوش گوار نصیحتوں سے لبریز وعظ شروع کر دیتا ہے — بول۔ عرض کر۔ لیکن یہ خیال رکھ کہ ”ایران پر حملہ کرو۔“ اور ”کیکاؤس کو تباہ کر دو۔“ ان دو کیف پرور اور حوصلہ انگیز جملوں کے سوا اور کچھ سنتا نہیں چاہتا۔ وزیر : غلام کی یہ التجا ہے کہ بندگان عالی اپنے ملک و رعیت کے مالک ہیں، لیکن آسمان کی گردش، انقلابات عالم کی رو اور خالق کائنات کی رائے اور مصلحت کے مالک نہیں ہیں۔ یہی باعث ہے کہ اپنی مجموعی عسکری قوت، اپنے خزانے کا گراں بہا اندوختہ، اپنے رعیت کے لاکھوں نوجوان کی شباب نارسیدہ زندگیاں برباد کر کے بھی، آپ آج تک ایران کے نوحہ تقدیر کا ایک حرف بھی تبدیل نہ کر سکے۔ جب خدا کی مرضی آپ کی خواہش سے متفق نہیں ہے، تو ایران پر حملہ کرنا، خدا کی مرضی سے جنگ کرنا ہے۔

افراسیاب : میں سہراب کو اپنے غضب کا حربہ بنا کر ایران سے اپنی پچھلی شکستوں کا بدلہ ضرور لوں گا۔ میرا دماغ گزشتہ ذلتوں کی یاد سے دوزخ بنا ہوا ہے۔ میرا دل اندوہ ناکامی کی مریوں سے مجروح ہو رہا ہے۔ میری روح انتقام کی پیاس سے تڑپ رہی ہے۔ میں اس جلن کے لیے ٹھنڈک، اس زخم کے لیے مرہم، اس قحطی کے لیے تسکین چاہتا ہوں۔

وزیر : خادم التجائے معانی کے ساتھ دوبارہ اسی خیال کا اعادہ کرنا چاہتا ہے کہ

رستم سہراب

جلالت مآب کے ارادے کی آفرینش ناممکنات کی دنیا میں ہوئی ہے۔

افراسیاب: (برافروختہ ہو کر) یعنی؟

وزیر: دنیا کی تمام نعمتوں اور برکتوں کی تخلیق کسی ایک انسان کے لیے نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے جو کچھ ہے اس کی حفاظت کیجیے۔ اور جو نہیں ہے اور نہیں مل سکتا، اسے جبراً حاصل کرنے کا خیال ترک کر دیجیے، یہی سلطنت کے لیے پیغام بہبودی اور ملک کی زخمی سماعت کے لیے نعمتِ امن ہے۔

افراسیاب: میں خدا کی مرضی کو مجبور کروں گا کہ ایران کی قسمت کی تحریر افراسیاب کے قلم سے دوبارہ لکھی جائے۔ افراسیاب کی غلامی، یہی ایران کی آخری قسمت ہے۔

وزیر: عالم پناہ — بادشاہ رعایا کا باپ ہوتا ہے۔ کتنی بدنصیب ہے وہ رعایا جس کا شفیق باپ اولاد کے خون پسینے کی کمائی کا روپیہ اولاد کی فوز و فلاح میں خرچ کرنے کے بدلے قہر و غضب کی نمائش، سامانِ ہلاکت کی آرائش اور وبائے جنگ کی افزائش میں ضائع کر رہا ہے — میں دو زانو ہو کر اور رحم و انصاف کا واسطہ دے کر عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ اس مسلسل جنگ کے ہولناک تماشے کو جو ہمیشہ ناکامی و پشیمانی کے امید سوز نظارے پر ختم ہوتا ہے، آئندہ کے لیے بند کر کے تباہ حال رعایا کو شکر گزار کیجیے — رعیت کا دل جیتنا شاہانہ فتوحات میں سب سے بڑی فتح ہے۔

افراسیاب: تیری بچھلی وفاداریوں اور خدمتوں کا خیال کر کے، تیری بے مغز گفتگو میں اب تک از راہِ رحم سنتا رہا — بکنا بند کر — کیا تو میرے رحم کو غضب سے بدلنا چاہتا ہے؟

وزیر: خداوندِ نعمت۔ حصولِ خطاب و ترقی درجات کے لیے حق گوئی کا فریب دے کر اپنے آقا کے غلط ارادوں، غلط امیدوں کی، غلط راستے کی طرف رہنمائی کرنا اور اس کے حوصلوں کی خوشامد کی زبان سے شہ دے کر یقینی تباہی سے ٹکرا دینا خدمت نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی لالچوں کو ٹھکرا کر، صداقت کا آئینہ بن کے، اس کی بشریت کی کمزوریوں کو اُس کے سامنے ظاہر کر دینا، یہی حقیقی جاں نثاری اور سچی آقا پرستی ہے۔ میں جاں نثار ہوں، خوشامدی نہیں

ہوں۔

افراسیاب: مظلوم ہوا۔ ضرور تو رشوت لے کر کیا کوس سے مل گیا ہے۔ لے جاؤ۔ اس دوست کے لباس میں چھپے ہوئے دشمن کو۔ قتل کر دو۔ یہ زندہ رہا تو اپنی نامردانہ باتوں سے تمام توران کو بزدل بنا دے گا۔

(افراسیاب غصے میں چلا جاتا ہے)

وزیر: رعایا کی خواہشات کو پاگل کا خواب۔ زمین کو اپنے غلاموں کی بستی۔ اپنی رائے کو دنیا کا ناقابل تنسیخ قانون۔ وقت کے چکر کو اپنے اشارے کا محکوم سمجھنے والے، برخود غلط حکمرانوں سے تمام زندگی کی خیر خواہی اور بے داغ و قادیاری کا آخر میں یہی انعام ملتا ہے — جلاوطنی، قید، قتل۔ یہی بہترین خدمات کے بہترین صلے ہیں۔ یہ پیکرِ ظلم، یہ مجسمہٴ غرور، یہ خودداری و غلط کاری کے بولتے ہوئے پٹے، حق گوئی، کو دنیا کا سب سے بڑا جرم سمجھتے ہیں — یہ چوری، ڈاکہ، دھوکا، قتل، بغاوت، ہر گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن، سچائی، کا جرم کبھی معاف نہیں کرتے۔ (سپاہی سے) چلو۔ سچ بولنے کی سزا دینے کے لیے مجھے موت کی عدالت کی طرف لے چلو۔

ریت کی دیوار پر بنیاد ہے ہر بات کی
بادشاہوں کی عنایت دھوپ ہے برسات کی

(سپاہیوں کے حصار میں وزیر کا جانا)

دوسرا ایکٹ - دوسرا سین

سمنگان کا شای محل

(شاہِ سمنگان، تہینہ کنیریں اور افراسیاب کے سفیر ہومان اور بارمان موجود ہیں)

شاہِ سمنگان : بادلوں کی کمان سے نکل کر زمین کی طرف آتا ہوا بجلی کا تیر اور سہراب کے ارادے میں پیدا شدہ طوفان کا بہاؤ ہماری منتوں سے اپنا رخ اور راستہ نہیں بدل سکتا۔ اس کے حوصلے آندھی کی طرح پُڑھو، اس کی آرزوئے جنگ، شکار پر جست کرتے ہوئے شیر کی مانند یقین فتح کے نشے سے مخمور اور اس کا جوش، خشک جنگل میں لگی ہوئی آگ کی طرح رو بہ ترقی ہے۔ وہ ابھی سے محسوس کر رہا ہے کہ اقبال اس کی پیشانی کو، فتح اُس کی تلوار کے قبضے کو، ایران کے قلعوں کی کنجیاں اس کی انگلیوں کو، تاج کیانی کے جواہر اس کے قدموں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ اس کے گرز کی ضرب سے ایرانوں کی روہیں اور اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک سے کیاؤس کے محل کی دیواریں کانپ رہی ہیں — اس لیے بیٹی اپنی ماما کو اس کی سرکش مرضی کے ساتھ صلح کرنے کے لیے مجبور کرو۔ کیوں کہ وہ اس سفر کو خیر مقدم کے نعروں کی طرف سے پیغامِ دعوت اور اپنے بیداری کے خواب کی امید افروز تعبیر سمجھ رہا ہے۔

تہینہ : اولاد کی محبت، ماں کی روح کا تبسم ہے۔ آج یہ تبسم فریاد بن کر آنسوؤں کی زبان سے سہراب کی ضد کی فٹیں کر رہا ہے۔ لیکن اس کی ضد کسی منت، کسی

دلیل، کسی التجا سے رحم پر مائل نہیں ہوتی۔ ابا جان۔ اس کے ارادے کو
مادرانہ اطاعت سے بغاوت پر آمادہ دیکھ کر میری زبان نے مجبوری سے
ایران جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن مامتا کی آگ سے جلتا ہوا دل
ابھی تک اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ہومان : محترم بانو۔ توران کے شہنشاہ افراسیاب نے اپنی شفقت و نوازش کے ثبوت
میں محبت کے تحفوں اور شاعی گرامی نامے کے ساتھ، تورانی فوج کے جو بارہ
ہزار منتخب و جنگ آزمودہ بہادر بھیجے ہیں۔ ان میں کا ہر جری بارہ ہزار
دلبروں کی طاقت و تجربہ کا مالک ہے۔ ان بارہ ہزار تورانی شیروں کے ساتھ
آپ کا نامور فرزند جس زمین پر قدم رکھے گا، اُس زمین کے آستانِ عظمت
پر آستان بھی سجدہٴ نیاز ادا کرنے کے لیے مجبور ہو جائے گا۔

بارما :

سر جھکا دے گا زمانہ بچہ سائی کے لیے
آئے گی خود فتح پڑھ کر پیشوائی کے لیے
غم نہ کیجیے آپ اس کے نیک و بد کے واسطے
قسمت و اقبال حاضر ہیں مدد کے واسطے

(جوش کے عالم میں سہراب کا داخلہ)

سہراب : رستم کا فرزند۔ اپنے بازو اور تلوار کے سوا کسی سے مدد کا طلب گار نہیں ہے
(ہومان اور بارما سے) میں نے صرف ناشکر گزاری و غرور کے الزام سے
بچنے کے لیے تاجدار توران کی فوجی امداد قبول کر لی ہے۔ لیکن بہادر آئینہ کی
طرح صاف گو ہوتا ہے۔ اس لیے میری صاف بیانی سے رنجیدہ نہ ہونا۔
میں نے اس اعانت کی پذیرائی کر کے اپنے عزم و شجاعت کی سخت دل شکنی
کی ہے۔ سہراب تورانی لشکر کے اعتماد پر نہیں، اپنی جرأت و طاقت کے
بھروسے پر ایران کی نخوت کو لٹکانے جا رہا ہے۔ خدا میرا محافظ، ہمت میری
سپر، تلوار میری رہنما، میدان جنگ میرا راستہ، یقین کامیابی میرا توشہ، حوصلے

رستم سہراب

میرے رفیق سفر اور کیاؤس کا تخت میرے سفر کی آخری منزل ہے۔ اس سفر کے آغاز کا نام ہے استقلال اور اس سفر کے خاتمے کا نام ہے فتح۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ آپ اپنے زور بازو سے دنیا کی تاریخ میں شاندار اضافہ کریں گے۔

سہراب : ماں۔ جس رستم کی آفرینش پر آسمان زمین کو مبارک باد دیتا ہے، جس رستم کا نام سن کر شجاعت غرور کے نشے میں مصوم اٹھتی ہے، جس رستم کے نام پر طاقت فخر اور تلوار ناز کرتی ہے۔ اس رستم، اس شریف ترین انسان، اس فاتح اعظم کا فرزند ہونا میرے لیے موجب غم امت نہیں، باعث افتخار تھا۔ پھر معاف کرنا، نسایت کی کمزوری، شباب کے گناہ، زندگی کے شرمناک جرم کی طرح میری حقیقت کو پردے میں رکھنے کی کیا وجہ تھی؟۔

دل میں رکھا راز، دنیا کو خبر ہونے نہ دی

شام گمنامی کی تم نے، کیوں سحر ہونے نہ دی

تہینہ : اس سوال کا جواب ماں سے نہیں، ماں کی مامتا سے پوچھ۔ اگر ایک غریب چوری ہو جانے کے خوف سے اپنی زندگی کی پونجی دنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھتا ہے، تو یہ غلطی یا جرم نہیں، مجبوری ہے۔ یہ اندیشہ میری روح میں پیوست تھا کہ تیری پیدائش کا راز ظاہر ہو جانے سے تیرا باپ تجھے میری گود سے اپنے بازوؤں میں کھینچ کر میری دولتِ تسکین و متاعِ حیات مجھ سے چھین لے گا۔ اور مجھ بدنصیب کی آنکھیں شوہر کے چہرے کی طرح بیڑے کی صورت دیکھنے کے لیے بھی بے رحم قسمت کے سامنے ہمیشہ فریاد کرتی رہیں گی۔

سہراب : ماں، رستم جیسا باپ۔ اور سہراب جیسا بیٹا۔ ان دو آفتاب و ماہتاب کی موجودگی میں دنیا کو حقیر ستاروں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خدا اور مخلوق کے سامنے کیاؤس کو تخت سے اتار کر اپنے عالی مرتبہ باپ کو ایران کا بادشاہ اور تھیں ایران کی شہنشاہ بیگم بنانے کا عہد کرچکا ہوں۔ اس عہد کو پورا کرنے

کے لیے اب تم سے آخری مرتبہ اجازت مانگتے آیا ہوں — یہ کیا ماں! روتی ہو؟ رو نہیں۔ مائیں لائق کے لیے نہیں، نالائق اولاد کے لیے روتی ہیں۔ تمہارا بیٹا عزت کی دنیا فتح کرنے جا رہا ہے۔ اس لیے یہ رونے کا نہیں، خوش ہونے کا وقت ہے۔ ہنستے ہوئے ہونٹوں سے اجازت دے کر مجھے میدان جنگ کی طرف رخصت کرو۔ سمنگان کے قلعے کے دروازے پر فوج اور ایران کی زمین پر شہرت تمہارے سہراب کا انتظار کر رہی ہے۔

تہینہ : سہراب۔ مجھے خوف ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد اپنے باپ کی طرح کہیں تو بھی غریب تہینہ کو فراموش نہ کر دے۔ کیونکہ ایران کی زمین جادو کی زمین ہے۔ اس ظلم خاموشی میں پہنچتے ہی انسان سحرزدہ ہو کر اپنے پیاروں کی یاد کو محبت کے ہاتھ کی بدخط طفلانہ تحریر سمجھ کر حافظے سے مٹا دیتا ہے۔

سہراب : ماں، ماں۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم میرے جسم و جان کا شیرازہ، میری نجات کا وسیلہ، میری زندگی کی برکت ہو۔ میری ہستی تمہاری ہستی کا عکس اور میری روح تمہاری روح کا سایہ ہے۔

تہینہ : (یکا یک رستم کی یاد سے بے قرار ہو کر) طلوع مسرت و بازگشت ماضی کی امید و اشتیاق میں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی زندگی کے سولہ برس گزر گئے۔ لیکن میری شب انتظار کی صبح نہ ہوئی — یا خدا عورت کا دل اتنا کمزور و مجبور محبت۔ اور مرد کا دل اتنا بے رحم و وفا نا آشنا ہوتا ہے!! آہ۔ عورت محبت کا نشہ پی کر تمام عمر ہوش میں نہیں آتی۔ اور مرد..... پیالہ ہونٹوں سے جدا ہوتے ہی اس شراب کی لذت و سرور کو فراموش کر دیتا ہے۔

سہراب : ماں۔ تم بے آواز لفظوں میں اپنے دل سے کیا مشورہ کر رہی ہو؟
تہینہ : (شعبدی سانس لے کر) خدا کی مرضی پوری ہو (مہرہ نکال کر) یہ تیرے باپ کی دی ہوئی نشانی ہے۔ اس نے سمنگان سے رخصت ہوتے وقت تاکید کی تھی کہ اگر تمہاری گود کی زینت لڑکی ہو تو یہ مہرہ اس کے سر کے بالوں میں — اور لڑکا ہو تو اُس کے بازو پر باندھ دینا — ہاتھ بڑھا —

رستم سہراب

سولہ برس سے آج ہی کے دن کے لیے اس محبت کی یادگار کی حفاظت کر رہی تھی — اس مہرے اور نظر میں شناسائی ہوتے ہی، باپ بیٹے کو، خون خون کو شناخت کرے گا۔ (سہراب کے بازو پر مہرہ باندھ دیتی ہے) سہراب۔ ہر بچہ ملک و ملت کی امانت ہوتا ہے۔ اس لیے جسمانی پرورش کے ساتھ بچے کی روحانی تربیت اور دماغی و اخلاقی نشو و نما کی بھی ماں ذمہ دار ہے۔ میں نے تیرے جسم کی حوصلہ زاء اور قوت آفریں ورزشوں سے، دماغ کی ضیائے علم سے، دل کی شریف ترین جذبات سے اور روح کی خصائل انسانیت سے تعمیر کی ہے۔ خدا کی سپاس گزار ہوں کہ میری سولہ برس کی محنت برباد نہیں ہوئی۔ آج میں سعید، فیاض، دلیر، بلند فطرت نوجوان کی شکل میں اپنی شانزدہ سالہ تمناؤں اور مادرانہ دعاؤں کو دیکھ رہی ہوں — بیٹا۔ مجھے تیرے دل کی رفعت اور خیالات و احساسات کی عظمت آج ہی پر اعتماد ہے۔ اس لیے تجھے حقیقی فاتح اور سچے سپاہی کا فرض سکھانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن صرف اس خیال سے کہ زندگی کی غفلت آور مصروفیتوں میں میری آواز تیرے دل کی خوبیوں کو بیدار کرتی رہے، رخصت کرنے سے پیشتر تجھے نصیحت کرتی ہوں کہ خدا کی بخشی ہوئی طاقت کو اعتدال، رحم اور انصاف کے ساتھ استعمال کرنا۔ تلوار کو بے کسوں اور کمزوروں کا محافظ و پشت پناہ سمجھنا۔ اور ظلم خواہ کتنی ہی حلیم اور کیسی ہی شریفانہ صورت میں سامنے آئے ہمیشہ اُسے ذلیل جاننا۔

دیکھنا خنجر و طاقت پہ نہ الزام آئے

لب پہ شاباش ہو، سہراب کا جب نام آئے

سہراب : پیاری ماں۔ میں لوہے کے ہتھیاروں سے سج کر میدان جنگ کی طرف ناموری کی تلاش میں جا رہا ہوں — یہ کہنی حربے دشمن کی ہتھوں کو، جسموں کو، فوجوں کو، قلعوں کو فتح کر سکتے ہیں۔ لیکن عزت اور شہرت پر فتح پانے کے لیے مجھے ایک اور حربے کی ضرورت ہے۔

کلیات آغا شہر کا شیری - جلد چہارم

تہینہ : میرے نیچے۔ وہ کون سا حربہ؟

سہراب : (تہینہ کے قدموں میں بیٹھ کر) ماں کی دعا۔

تہینہ : (سہراب کے سر پر ہاتھ رکھ کر)۔

دعا دیتی ہوں تجھ کو وقت خادم، بخت یادور ہو

زمانہ پاؤں کے نیچے، خدا کا ہاتھ سر پر ہو

دوسرا ایکٹ - تیسرا سین^۱

ایرانی سرحد پر قلعہ سفید

(رات کا وقت۔ قلعے میں جلسہ مشاورت۔ تورانی لشکر کے روز افزوں فاتحانہ اقدام اور اپنی پیہم ہزیمت یاہیوں سے خاطر شکستہ ہو کر ایرانی اکابر حکومت و عمائدین فوج مسئلہ صلح پر مصروف بحث ہیں)

بہرام : سہراب۔ زوال کا نغیب، تخریب کا علم بردار، فنا کا پیامی، موت کی سانس کا شعلہ ہے۔ ہمارا قلعہ سفید ویرانہ عبرت، ہمارے نگارستانِ عیش مقتلِ آرزو، ہمارے محلات و باغات گھوڑوں کے طویلے بن جائیں۔ ہماری مالی آسودگی، معاشرتی شیرازہ، ملکی نظام، قومی وقار، جنگی ذخیرے، سر برآوردہ افراد اور بہترین سپاہیوں کی قیمتی زندگیاں برباد ہوں — ان یقینی الم ناک نتائج کے سوا اس لشکر کشی و صف آرائی کا اور کوئی حاصل نہیں ہے۔ سہراب کی تلوار کی جھنکار کو ہمیں اپنی شومی قسمت کی طرف سے اعلانِ جنگ تصور کرنا چاہیے۔

کستہم : لیکن ہم نتیجے کے ظہور سے اول ہی کیوں یقین کر لیں کہ تقدیر ہمارے خلاف اس جنگ کا فیصلہ کر چکی ہے۔ جب تک ہمارے پاس قلعہ سفید کی بلند و مستحکم دیواریں ہیں، حوصلوں میں توانائی ہے، آزادی کی محبت ہے۔ سرفروشی کا جذبہ ہے، جوشِ فدائیت کی فراوانی ہے۔ اس وقت تک ایک کم عمر

۱۔ ”عشق و فرض“ کے نام سے کھیلا گیا ڈراما یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ (مرتبین)

فونیز قوت کے سامنے تلواریں پھینک کر ایران و توران کی نظر میں اپنے دعویٰ شجاعت کو ذلیل نہ کرنا چاہیے۔

سردار ۱: بے شک۔ حوصلوں کی پستی ذلت کی طرف مرد کا پہلا قدم ہے۔ مجھے ابھی تک ارادوں کی پسائی کا کوئی مقول سبب نظر نہیں آتا۔ دنیا امید کی جلوہ گاہ ہے، مایوسی کا ظلمت کدہ نہیں ہے۔ احساس کا نام زندگی اور جوش عمل کا نام کامیابی ہے۔

سردار ۲: آپ کی رائے مرض کی صحیح تشخیص ہے۔ دشمن کے حملے کا خوف، حملے سے زیادہ ہیبت ناک ہوتا ہے۔ یہ صرف ہمارا واہمہ ہے جو ہمارے سامنے شکست یافتہ مستقبل کی اٹھک بار تصویر پیش کر رہا ہے۔

بہرام: امید آپ کی توقعات کو فریب دے رہی ہے — ہوا میں گرہ دینے کی ناکام و بے نتیجہ کوشش نہ کیجیے۔ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کرنا، یہ آپ کی پہلی غلطی اور سہراب کو طفل شیر خوار یا معمولی نبرد آزما سمجھنا، یہ دوسری غلطی ہے۔ میں ملک کی بہبودی کے لیے بہترین مشورہ دے کر اپنی ذمہ داری اور قومی فرض سے سبک دوش ہو چکا۔ ہر شخص اپنی رائے کا مالک ہے۔ لیکن خاموش ہونے سے پیشتر ایک بار پھر متنبہ کرتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے لیے امن و آشتی کا دروازہ بند کر رہے ہیں۔ وقت کی آنکھیں بدل چکی ہیں۔ سہراب کے قوائے حربی اور فتوحات جلیلہ کو بچ سمجھ کر اس سے برسرِ جنگ ہونا، جنگ نہیں، خودکشی ہے۔

کسٹم: (حاضرین سے) مجھے اپنی رائے کے درست و بے خطا ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ قیاس کی پیشین گوئی صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی — سنیے جلد مشورت کے سامنے میں نے اپنا ذاتی خیال پیش کر دیا۔ اب آپ لوگ متفق ہو کر خود فیصلہ کر لیں کہ پیش نظر مشکلات میں کیا کرنا چاہیے۔ جنگ یا صلح؟

سردار ۳: جب لشکر بے حوصلہ، اسباب مدافعت کمزور، حالات ناموافق، تدبیر خلاف، امید فتح موہوم اور قوی بازو دشمن کے حملے کامیاب ہیں — تو ایسے برگشتہ وقت میں ضرورت صلح کا احساس نہ کرنا، اپنی آرائش حیات اور ذرائع نجات

رستم سہراب

سے دست بردار ہونا ہے — میری رائے صلح کے حق میں ہے۔
 سردار رح: سہراب کا حملہ ایک اتفاقی آندھی ہے، جو تھوڑی دیر مطمئن فضا میں اضطراب پیدا کر کے اپنی طاقت کی نمائش کے لیے دوسری طرف روانہ ہو جائے گی۔
 اس لیے ابلہانہ جوش سے مشتعل ہو کر ہنگامی آفت کو دائمی مصیبت نہ بنانا چاہیے۔ ورنہ زندگی کی غلطیوں میں یہ سب سے زیادہ ہولناک غلطی ہوگی۔
 کسہم: (بہرام سے) جب کثرت رائے جنگ کی مخالف ہے، تو آپ ہماری جانب سے صلح کے قاصد بن کر جائیے۔ سہراب سے کہیے کہ دوستی کی نسیم بہار سے دشمنی کا موسم خزاں ختم ہوا۔ ہم جان و مال کی سلامتی کے وعدے پر اپنا قلعہ حوالے کرنے کو تیار ہیں۔

بہرام: وقت کی یہی پکار تھی۔ ضرورت و مصلحت کا یہی مطالبہ تھا ————— ملک کی بنیادیں آنے والے زلزلے کی دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ آپ نے اس فیصلے سے بند باندھ کر خون و تباہی کے سیلاب کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ بربادی کے ہاتھ کے حربے چھین لیے۔ بدبختی کی امیدیں توڑ دیں — میں آپ کی دانائی و مآل اندیشی کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میری زبان سے سہراب کا شکریہ آمیز جواب سننے کے لیے آمادہ رہیے۔

(غصہ اور جوش کے ساتھ گرد آفرید کا داخلہ)

گرد آفرید: ٹھہرو۔ کہاں جاتے ہو؟

بہرام: صلح کرنے۔

گرد آفرید: کس سے؟

بہرام: سہراب سے۔

گرد آفرید: سہراب سے! ایران کے بدترین بدخواہ سے!! قوم کی آزادی کے غاصب سے!!! جبر و استبداد کے نمائندے سے؟ — طاقت ور سے کمزور کا، پتھر سے شیشے کا، آندھی سے نیچے کا کبھی اتحاد نہیں ہوتا۔ صلح برابر والوں میں ہوتی ہے، اور طاقت کا ثبوت دینے کے بعد ہوتی ہے — یہ غیر مساوی صلح پست

ہمتی کا اظہار بے کسی ہے۔ ذلت کی پرستش کا معاہدہ ہے۔ ملک فروشی کی دستاویز ہے۔ تمہاری عزت کی پیشانی پر داہنی غلامی کی مہر اور تمہاری مادر وطن کے پُر جلال چہرے پر شرم کی سیاحی کا داغ ہے۔

مردود ہے وہ کوشش، ملعون ہے وہ خامہ
آزادی وطن کا لکھنے جو بیچ نامہ
عزت سمجھ رہے ہو غیروں کی بندگی میں
مر جاؤ -- گر ہے جینا ذلت کی گندگی میں

بہرام : مگرد آفرید۔ حریف کی طاقت اور ملک کی کمزوری کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد رائے ظاہر کرو۔ غلط جوش عقل کی گمراہی ہے — جس سہراب نے اس قلعہ سفید کے محافظ ہجیر جیسے طاقت کے پہاڑ کو گھوڑے سمیت اٹھا کر مٹی کے ڈھیلے کی طرح زمین پر پھینک دیا۔ اس محبوب تقدیر و خداوند شمشیر کو ہم پاشکتہ تدبیروں اور مجنونانہ تقریروں سے فتح نہیں کر سکتے۔

مگرد آفرید : فتح جرأت و عزیمت سے ملا کرتی ہے۔ سوچنے رونے اور بیوہ عورت کی طرح ہائے کرنے سے نہیں ملتی۔ فتح بے عزتی کے غلاموں کی مالکہ اور ہمت کے آقاؤں کی کنیز ہے۔ بزدل قسمت سے فتح کی بھیک مانگتے اور جبری قسمت کے منہ پر تھپڑ مار کر فتح کو اپنی ملک اور حق سمجھ کر زبردستی حاصل کرتے ہیں۔

جرأت ہے جس کے پاس وہی فتح مند ہے
جھک جائے گا جہان جو ہمت بلند ہے
اٹھو، بڑھو، دکھاؤ کہ طاقت ہے پاؤں میں
ملتی ہے فتح مرد کو، خنجر کی چھاؤں میں

بہرام : لیکن جب صلح کر لینے سے ہمارا قلعہ، وجاہت، ثروت، زندگی، ہر شے شامت و ہلاکت سے محفوظ رہتی ہے تو فولاد پیکر سہراب سے پنچہ کشی کر کے ہمیں دنیا میں اپنی حماقت کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

رستم سہراب

گُرد آفرید: شرم کر! شرم کر!! خود غرضی کے بازار میں دولت و راحت کے مصنوعی سٹکوں پر قوم کا اقتدار و حرمت فروخت کر دینے کو تو شرارت کا سودا جانتا ہے؟ پاؤں کتے کی طرح گلے میں سہراب کی اطاعت کا پتہ ڈال کر اس کے پاؤں چاٹنے کو عزت کی زندگی سمجھتا ہے؟۔

تری زباں ہے فسانہ نمک حرامی کا
سبق پڑھاتا ہے اوروں کو بھی غلامی کا

بہرام: خبردار۔ گُرد آفرید۔ تو کسی معمولی شخص سے ہم کام نہیں ہے۔ میری شخصیت و حیثیت کا ادب کر۔ جا۔ گھر میں جا۔ سلطنت کے انتظام میں عورت کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

گُرد آفرید: شرافت باختر، بے حیا، تو مجھے عورت کہتا ہے۔ آ، عمل کے آئینے میں ہم دونوں اپنے چہرے دیکھیں اس وقت تیری حقیقت تیرے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔ تیری نگاہیں شرم کے بوجھ سے دب کر زمین میں دفن ہو جائیں گی۔ اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ گُرد آفرید عورت نہیں، بہرام عورت ہے۔ کیونکہ میں عورت ہو کر بھی دنیا کے شریف ترین مرد کی طرح ملک و قوم کے دشمن کا سر اپنے پیروں سے روندنا چاہتی ہوں۔ اور تو مرد ہو کر ایک آبرو فروش عورت کی طرح اپنی پلکوں سے سہراب کے پاؤں کی گرد صاف کرنا اور اس کی پاپوش کو اپنے سر کا تاج بنانا چاہتا ہے۔

بہرام: ذلیل۔ زباں دراز۔

(گُرد آفرید پر تلوار سے حملہ کرتا ہے اور وہ کلائی مروڑ کر تلوار چھین لیتی ہے)

گُرد آفرید: کتا شیرنی پر حملہ نہیں کر سکتا۔ وطن کے دشمن (لات مار کر) جا۔ سہراب کے کفش برداروں کی فہرست میں نام لکھا کر اپنی عزت افزائی پر فخر کر۔ تیری قسمت میں نہ شریفوں کی زندگی ہے۔ نہ بہادروں کی موت ہے۔ بہرام: گُرد آفرید۔ میں اس توہین کا خونناک بدلہ لوں گا۔ تجھ سے بھی۔

اور جو یہ نگارہ دیکھ کر اپنی مجرمانہ خاموشی سے تیری تائید کر رہے ہیں۔ ان سے بھی۔

(نصے میں سانپ کی طرح مل کھاتا ہوا چلا جاتا ہے)

گرد آفرید: ایران کے دلیر۔ یہ دوست نما منافق، جس کے پاس مردانہ روح، شرم، ایمان، کچھ نہیں ہے۔ ذاتی مفاد کی نکتہ داشت جس کا اصول، مطلب پرستی جس کی زندگی کا معیار و معراج، اور دغا جس کا ضمیر ہے، اپنی گویائی کی حرارت سے تمہارے دل میں ہمت کے لہراتے ہوئے چشموں کو خشک کر کے تمہیں بھی اپنی طرح مردودِ خلأق بنانا چاہتا تھا۔ خدا نے تمہیں اس بکوں ساری و خواری سے بچا لیا ہے۔ بہادر! سہراب اس دنیا میں دنیا سے کوئی غلطہ چڑ نہیں ہے۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح مٹی، پانی سے بنا ہوا انسان ہے۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح اپنی زندگی کی مدت اور موت کے وقت سے بے خبر ہے۔ اس لیے بچنے کو پہاڑ اور پہاڑ کو آسمان سمجھ کر اپنی طاقتوں کو حقیر نہ سمجھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔ مست ہمتی کی طرح جھوم کر، آدمی کی طرح تھلا کر، بادل کی طرح گرج کر، بجلی کی طرح نکواریں کھینچ کر حفاظت وطن کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ جہاں بزدلی ہے۔ وہیں شکست ہے۔ اور جہاں جرأت ہے وہیں فتح ہے۔

کسبم : خوف خیال کا خواب ہے۔ تم نے اس خواب سے ہمیں بیدار کر دیا۔

سب : زعمہ باد گرد آفرید۔

گرد آفرید: زعمہ باد۔ ایران۔

(سب جوش میں نکواریں کھینچ لیتے ہیں)

دوسرا ایکٹ - چوتھا سین

میدان جنگ کا ایک حصہ

(ہومان، بارمان اور قلعہ سفید کے محافظ ہجیر کے ساتھ سہراب کا داخلہ، ہجیر کے دونوں ہاتھ بندھے ہیں)

سہراب : تم قلعہ سفید کے محافظ ہو؟

ہجیر : ہاں۔

سہراب : تمہارا نام؟

ہجیر : ہجیر۔

سہراب : قلعے کے حاکم کا نام؟

ہجیر : کژدہم۔

سہراب : اگر قید کی زندگی کو، جس کے سر پر موت کی تلوار لٹک رہی ہے، آزاد زندگی

سے بدلنا چاہتا ہو، تو سمجیہ آمیز خط لکھ کر انجام سے غافل کژدہم کو آگاہ کرو

کہ خوفناک مستقبل، جہاں و بربادی کے جلوس میں قلعے کے پھاٹک کے

سامنے پہنچ گیا — اس لیے رم و معافی حاصل کرنے کے لیے میرے حضور

میں آکر غمراہ اطاعت پیش کر کے۔

ہجیر : قوی کے ساتھ میری قوت حافظہ بھی ضعیف ہو گئی ہے۔ اس لیے عمر کے آخر

دنوں میں غمراہی کا سبق یاد نہیں کر سکتا۔

سہراب : یعنی؟

ہجیر : تم نے میدان جنگ میں شکست دے کر میرے جسم کو قید کر لیا ہے۔ میری

روح تمہارے قید و بند میں نہیں ہے۔ میرا ضمیر اور میرا جذبہ وطن پرستی آزاد ہے اور ہمیشہ آزاد رہے گا۔ غلش و خطرہ سمجھ کر انتہائی عتوبتوں کے ساتھ قتل کر دو۔ یا فتح کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو۔ لیکن میں لالچ سے مغلوب اور تکلیفوں سے دہشت زدہ ہو کر اپنے ملک کی غلامی کے کاغذ پر کبھی دستخط نہ کروں گا۔

سہراب : عقل کی شرکت میں اپنی غلط کار رائے پر نظر ثانی کر۔ موت کے جڑے میں ملک کو نہ جھوک۔ میری اطاعت ہی میں تیرے اہل وطن کی زندگی ہے۔

ہجیر : زمین پر ریختے ہوئے حقیر کیڑوں کی طرح صرف حرکت کرنے اور سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔ آزادی اور اختیار سے محروم ہو کر پامال گھاس کی مانند جینا، انسانیت کی موت ہے۔ میری تمنا ہے اور دعا ہے کہ میرے اہل وطن جئیں۔ لیکن غلام بن کر نہیں، آقا بن کر۔ کتے کی طرح نہیں، شیر کی طرح۔

سہراب : کڑوہم کو خط لکھ کر تسلیم شکست کا مشورہ دینا تیری طرف سے اس ملک کی سب سے بڑی خدمت تھی۔ تیرے انکار نے ثابت کر دیا کہ تو سخت بے وقوف ہے۔

ہجیر : ملک کے نمک حراموں کو ملک کے دشمن بھی احترام کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ میں بے وقوف کہلانا پسند کرتا ہوں لیکن اپنے بے داغ و معزز نام کے ساتھ دغا باز اور قوم فروش کے خطاب کا اضافہ نہیں چاہتا۔

سہراب : اچھا تو اب میرے غضب کی ہولناکیوں کو رحم اِترام نہیں دے سکتا۔ (ہومان اور ہارمان سے) خون ریزی و جہ کاری کے مقید درندوں کی زنجیریں کھول کر قلعہ سفید پر حملہ آور ہونے کے لیے آزاد کر دو۔ اور غم کی سیاہ رات میں برباد شدہ وطن کے تودہ خاک پر آلو کی طرح ماتم کرنے کے لیے اس بدبخت کو قید میں رکھو۔ لے جاؤ۔ یہی ناشکر گزراؤ کی کم سے کم سزا ہے۔ (ہومان۔ ہارمان ہجیر کو لے جاتے ہیں) یہ یقین کے فریب خوردہ، یہ نم مجنون ایرانی، امید کی زمین میں ہنسی بڑھ رہے ہیں۔ لیکن انھیں بہت جلد آنسوؤں کی فصل کاٹنی ہوگی۔

رستم سہراب

مرے قدموں کو بوسہ دے گی جھک جھک کر جیس تیری
بساطِ عجز بن جائیگی سجدوں سے زمیں تیری
اٹھا سکتا نہیں سر، تیغ جو ہر دار کے آگے
سُن۔ او ایران۔ جھک جا، اب مری تلوار کے آگے

(مردانہ لباس میں انتہائی جوش و غضب کے ساتھ گردِ آفرید کا داخلہ)

گردِ آفرید : ایران کی تاریخ، شرفِ انسانیت و فتوحاتِ شرافت کا صحیفہ زریں
ہے، فردوسی و پامانی کا افسانہٴ ذلت نہیں ہے۔ ایران اپنی علمی، اخلاقی، تمدنی
اور جنگی قوتوں کے سامنے دنیا کا سر جھکانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ جھکنے
کے لیے پیدا نہیں ہوا۔

ایران کے قدموں میں ہے جیون سے تا مگ
اس خاک سے پیدا ہوئے طہورث و ہوشک
ہر ذرہ ہے، خورشید کا ہم پایہ و ہم رنگ
ہر قطرہ ہے، طوفانِ قضا پوش، دمِ جنگ
ہر فرد یہاں کوہِ قلن زور شکن ہے
یہ شیروں کا گہوارہ، شجاعت کا وطن ہے

سہراب : تیرے پاس پر شکوہ استعاروں اور فصیح و بلیغ لفظوں کا دافر سرمایہ معلوم ہوتا
ہے۔ لیکن تو اپنی گویائی کے اسراف سے ایرانوں کے حوصلوں کی بے مانگی
اور عزم و ہمت کے افلاس پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ قسمت کے افق پر صبح
زوال کی پہلی کرن دکھائی دے رہی ہے۔ پھر بھی اجتناب ایران ابھی تک زندگی
کو شبِ راحت سمجھ کر دیرینہ عظمت کا خواب دیکھ رہا ہے۔

گردِ آفرید : آفتاب کے عظمت و جلالت کا انکار اپنے بے ہمر ہونے کا اقرار ہے۔ غرور
کے مرض سے تیری چٹائی مظلوم ہو گئی ہے۔ اس لیے تیری نظر پلکوں کی حد
سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

سہراب : جنگ کا میدان شاعروں کی بزم خیالی، منطقیوں کی مجلس، فلسفہ کا مدرسہ نہیں ہے۔ یہاں کی شعریت کا نام زخم، منطق کا نام تلوار اور فلسفہ کا نام طاقت ہے۔ اچھا ظاہر کر تو کون ہے؟ تیری موت کے بعد قلعہ سفید میں کس نام سے تیرا ماتم کیا جائے گا؟

گر د آفرید : ۔

دشمنِ نخت، حریفِ شعلہ سامانی ہوں میں
بس مرا نام و نشان یہ ہے کہ ایرانی ہوں میں
سلیِ خون میں موجِ آہن کی روانی دیکھ لے
آج تو بھی بڑشِ تیغِ کیانی دیکھ لے

(حملہ - خوفناک طویل جنگ - گرد آفرید کی شکست - گھوڑے سے زمین پر گرتے وقت خود غلطہ ہو جانے سے گرد آفرید کے بال کھل کر نکھر جاتے ہیں۔ اور مرد کے لباس میں ایک حسین دو شیزہ کو دیکھ کر سہراب حیرت زدہ ہو جاتا ہے)

سہراب : رعنائیِ نسایت کی جمیل ترین تصویر مردانہ مرتفعے میں! حسن کی دنیا کا ماہ کامل زرہ بکتر کے بادل میں!! موسمِ بہار کے تبسم کی رنگینی جنگی نقاب میں!!! ۔

چمک رہا ہے نگارِ قدرت کا تاجِ زرِ خاک کی جبین پر
کہ شاخِ انجم سے گر گیا ہے کوئی گلِ روشنی زمیں پر
طلوعِ نورِ سحر کا عالم ہے جلوۂ جسمِ نازنین پر
نار ہے حسنِ شامِ جنت، بہارِ گیسوےِ عمریں پر
حسین آنکھوں میں سحرِ مطلق، نظر میں اندازِ دلبری کے
بلوری گردن پہ روئے روشن، چراغ ہے ہاتھ میں پری کے

گر د آفرید : اقبال مند سہراب۔ وہ ایران کی برادر لڑکی جس کے بازوؤں میں طاقت کا طوفان، جس کی تلوار میں بجلیوں کا سیلاب، جس کے حملے میں کوہِ آتش فشاں

رستم سہراب

کا ہنگامہ پوشیدہ تھا۔ جو حریف کو کتاب زندگی کا مہمل لفظ اور فتح کو اپنے
مرکز کی ضرب کی صداے بازگشت سمجھتی تھی، آج اُس کے اعتقاد کی دنیا،
ناکامی کے زلزلے سے تباہ ہو گئی۔ اس کے یقین کا فلک بوس قلعہ بنیادوں
سے اکٹڑ کر عاجزی کی زمین پر سرنگوں ہو گیا — مجھے امان دو — میں
اظہار در ماندگی کے ساتھ اپنی شکست کا اقرار کرتی ہوں۔

سہراب : بہادر نازنین۔ زندگی کی سلطنت میں عورت حاکموں کی حاکم اور فاتحوں کی
فاتح ہے۔ جو خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر اپنی رنگیں مسکراہٹ سے ایک لمحہ
میں آدمی دنیا کو قتل کر سکتی ہے۔ جو شرم آلود نگاہوں کے اشارے سے چشم
زون میں بادشاہوں کا تاج اور دلیروں کی تلوار چھین سکتی ہے، اسے تیر و
ششیر لے کر میدان جنگ میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ حُسن کے مقابلے
میں ہمیشہ مرد کے غرور کو شکست ہوئی ہے۔ اٹھو — یہ میری فتح نہیں،
تمہاری فتح ہے۔

گُرد آفرید : (اپنے آپ سے) کس قدر شریف! جتنا چہرہ خوبصورت اتنا ہی دل خوبصورت
(چوٹ کر) ارے میں کدھر بھی جا رہی ہوں؟

سہراب : فتح یاب حینہ! پگھلیوں کا دروازہ کھول کر باہر نکل آنے والی خوشبو کی طرح
تم اپنی اصل شکل میں عیاں ہو گئیں، تو اب تمہیں اپنا نام و نشان بھی ظاہر
کردینا چاہیے۔ یہ میرا حکم نہیں، بارگاہ حُسن میں مودبانہ درخواست ہے۔

گُرد آفرید : میرے نام میں کوئی ایسی شیرینی اور موسیقی نہیں ہے، جس سے سماعت لذت
اندوز ہو سکے۔ میں قلعہ سفید کے حاکم کژدہم کی بیٹی گُرد آفرید ہوں۔

سہراب : اور — اور — جانتی ہو۔ میں کون ہوں؟
گُرد آفرید : جس گُرد آفرید کی بیبت سے بہادروں کی رگوں کا سرخ خون زرد ہو جاتا
تھا۔ تم اسے شکست دینے والے سہراب ہو۔

سہراب : تمہاری نظر تمہیں مغالطہ دے رہی ہے۔ آفتاب کی چلی میں شمع کی روشنی کی
طرح میری قدیم ہستی تمہارے حُسن کے جلال میں گم ہو گئی۔ اس چہرے کی
پریشیش کے لیے اب میں نے نیا نام، نیا جسم، نئی زندگی اختیار کی ہے۔

مجرور شوق، جور کش روزگار ہوں
 زخمی جگر کا شور، وفا کی پکار ہوں
 دل کو نشہ ہے عشق کا آنکھوں کو دید کا
 سہراب اب غلام ہے گرد آفرید کا

گرد آفرید: (اپنے آپ سے) اس کی باتیں فردوسی نغمہ کیوں معلوم ہوتی ہیں؟ کیا میری
 روح میں کوئی تہدیلی ہو رہی ہے؟

سہراب: پیاری آفرید! عرض تمنا کے جواب میں تمہاری ایک مختصر 'ہاں' عشق کی عقیدت
 مندی کا بہترین انعام ہے۔ میرے دل کو تحفہ محبت سمجھ کر قبول کرو۔

گرد آفرید: (اپنے آپ سے) ایک نامعلوم جذبہ انتقام کے شعلوں کو سرد کیے دے رہا
 ہے۔ مگر نہیں۔ عظمت وطن کے قاتل کا جرم میں کبھی معاف نہیں
 کر سکتی۔ (سہراب سے) سہراب۔ تمہاری تلوار نے گرد آفرید کو فتح کیا تھا،
 لیکن تمہارے شریفانہ سلوک نے، غیر مقلوب نفرت کو شکست دے کر، گرد
 آفرید کی روح کے ہر گوشے اور دل کے ہر ذرے کو فتح کر لیا۔ تم اب
 تک دشمن تھے، لیکن اب میری جان کے مالک اور میرے ملک کے مہمان
 ہو۔ میں تمام ملک کی طرف سے تمہیں اور تمہاری بہادر فوج کو قلعہ سفید میں
 تشریف آوری کی دعوت دیتی ہوں۔ اجازت دو کہ قلعے میں جا کر تمہارے
 شاہانہ خیر مقدم کی تیاریوں سے جذبات کی فضا میں محبت کا بہشت تعمیر
 کروں۔

سہراب: اب میں تمہاری مرضی کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ تمہارا حکم میری زندگی کا واجب
 الاطاعت قانون ہے۔ کیونکہ تم حُسن کی سلطنت کی ملکہ ہو اور میں اس
 سلطنت کی وفادار رعیت ہوں۔

گرد آفرید: تم۔ تم۔ میرے دل کی دنیا کے۔ بادشاہ ہو۔

(دونوں جاتے ہیں)

دوسرا ایکٹ - پانچواں سین

قلعہ سفید کا دروازہ

(ہومان، بارمان اور سرداران فوج مع لشکر موجود ہیں)

ہومان : دنیا کے حربوں میں سب سے زیادہ خوفناک حربہ عورت کا حسن ہے۔
 بارمان : اور حسن ہی کا دوسرا نام عورت کی فتح ہے۔
 ہومان : یہاں بھی حسن و عشق کا معرکہ کارزار شروع ہو گیا ہے۔
 بارمان : پہلی جنگ میں گرد آفرید کو شکست ہوئی تھی۔ اس جنگ میں سہراب کی شکست ہوگی۔

(از خود رفتہ حالت میں سہراب کا داخلہ)

سہراب : محبت! محبت!! تو زندگی کی حلاوت ہے، دل کی جنت ہے، روح کا نشہ ہے، دنیا کا حسن ہے، عروس آفریش کا سنگھار ہے، دوشیزہ فطرت کے رکنتی شباب کی فردوس آفرینی ہے۔

زندہ ہے تجھ سے روح طرب کائنات میں
 تو نغمہ ازل ہے، رباب حیات میں
 آسودگی روح، نشاط نظر نہیں
 دنیا میں کچھ نہیں ہے، محبت اگر نہیں

ہومان : اے ضمیمہ توران! — آپ معبد عشق میں حسن نسوانی کے بت رعنا کے روبرو اظہار عبودیت کے لیے ایران نہیں آئے ہیں۔۔۔ اپنا عہد و ارادہ یاد

کیجیے — میدان مبارزت میں محبت کی فتح پائی، تورانیوں کی فتح نہیں ہے۔
 بارمان : میری بھی گزراش ہے کہ اس ارض دار و گیر، اس ہستی و عدم کی درمیانی
 زمین پر آپ کے دولہ حرب و ضرب کو صنم پرستی میں مشغول دیکھ کر تمام
 تورانی لشکر چشم حیرت بن گیا ہے۔ معاف کیجیے گا — محبت ناکاروں کا
 معطلہ بیماری اور محبت کے لفظ کی تکرار بیمار عقل کا ہڈیان ہے۔

سہراب : تم پتھر ہو، سرد ہو، بے کیف ہو۔ زندگی کی بہترین لذت سے محروم ہو۔
 تمہارے دل میں محبت کی جس ہوتی تو تم بھی اقرار کرتے کہ دنیا کا نور
 عورت کا حسن ہے اور حسن کا حسن گرد آفرید ہے۔

ہومان : افسوس!

سہراب : افسوس ان کے لیے ہے جو محبت کے آب حیات کو زہر سمجھتے ہیں (قلعے کے
 پھاٹک کے قریب جا کر) تعجب! ابھی تک دروازہ بند ہے!!

بارمان : اور دنیا کے خاتمے تک بند ہی رہے گا۔

سہراب : کیوں؟

ہومان : تاکہ دنیا پر ثابت ہو جائے کہ آپ نے گرد آفرید کی نمائش، معنوی، پُر فریب
 محبت پر یقین کر کے، ناقابلِ حلائی غلطی کی ہے۔

سہراب : خبردار! — تم میرے یقین کو دیوانگی کہہ سکتے ہو، میری آنکھوں کو الزام
 دے سکتے ہو۔ میرے دل کو اپنی زبان سے مجروح کر سکتے ہو۔ لیکن گرد
 آفرید کی محبت کو، جھوٹی محبت کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تم نے ان پھول
 کی پتھریلوں سے شہد ٹپکتے نہیں دیکھا۔ ایسے خوبصورت ہونٹ، کبھی جھوٹ
 نہیں بولتے۔

بارمان : اے دام فریب کے خوش اعتقاد اسیر، اب بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیجیے۔
 دشمن کے جنگی قلعے کا دروازہ عورت کے وعدوں سے نہیں، زور بازو سے
 کھلتا ہے۔

(خیمہ قلعہ پر گرد آفرید دکھائی دیتی ہے)

رستم سہراب

سہراب : (ہومان و بارمان سے) وہ دیکھو۔ اُدھر دیکھو، اور اپنے قیاس کی ناقواں بنی
یہ نام ہو۔

کہتے تھے تم کہ مرہم زخمِ نظر نہیں
دنیاۓ انتظار میں شب ہے، سحر نہیں
ہر ذرہ چشمِ شوق ہے، ارمانِ دید میں
پھیلا ہوا ہے نورِ فضاۓ اُمید میں

(چٹا بانہ دیوارِ قلعہ کے نزدیک جا کر) پیاری آفرید۔ روح سے قریب ہو کر
اب اس قدر دور کیوں ہو؟ فصیلِ قلعہ سے جلوں کی بارش ہو رہی ہے، لیکن
اس سے تشہِ تماشاؤں کی تسکین نہیں ہو سکتی۔

(ہومان اور بارمان کی طرف اشارہ کر کے)

بکلی گرا دے ان کے خیال اور یقین پر
آ۔ میرے دل کے چاند، اتر آ زمین پر

مُرد آفرید: زمین کی لعنت! دنیا قلمِ فروشی کا بازار، غلام سازی کا کارخانہ، وقارِ انسانیت
کی قتل گاہ، عزتِ نفس کا مذبح نہیں ہے۔ ہوا، پانی روشنی کی طرح خدا کی
عطا کردہ بے شمار نعمتوں میں سے آزادی بھی ایک نعمت ہے۔ ہر خطہٴ دنیا
اسے قدرتی ورثہ اور ہر انسان اسے اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ ایرانی قوم نے
تیرے ملک کی آزادی، دولت، صنعت، حرفت، تجارت، دنیا کی برکتوں میں
سے کون سی برکت اور زندگی کی مسرتوں میں سے کون سی مسرت چھین لی
تھی۔ جو تو بلا اشتعال، بلا سبب، بلا جرم اس کا تمدنی و معاشرتی نظام غارت
کرنے اور اس کے دل کا اطمینان اور ملک کی متاعِ نشاط لوٹنے آیا ہے؟
— تو بہادر نہیں رہزن ہے۔ جا۔ واپس جا۔ بہشت کے آستانے پر اہرمن
کے کارندے کا اور قلعہ سفید کے دروازے پر ایک تنگِ انسانیت ڈاکو کا خیر
مقدم نہیں ہو سکتا۔

سہراب : پیاری آفرید۔ یہ اہل وفا کی زبان اور محبت کا لہجہ نہیں ہے۔ تم اس طرح غیر شناسا بن کر گفتگو کر رہی ہو۔ گویا ہماری ملاقات اس دنیا کے بدلے خواب و خیال کی دنیا میں ہوئی تھی۔ کیا اتنی دور سے پہچان نہیں سکتیں؟ غور سے دیکھو۔ میں سہراب ہوں۔ وہی سہراب، جس کے احساس و تحلیل میں تم نے انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ وہی سہراب، جو حُسن کی پرستش کو عشق کا مذہب اور تمہارے تصور رنگیں کو اپنی روح کی بہشت سمجھتا ہے۔

گرو آفرید : خبردار۔ ان سامعہ خراش لفظوں سے میرے تقدیس حُسن کی توہین نہ کر — مغرور۔ اپنی اتفاقی کامیابیوں کو وقت کی سفلہ نوازی اور قسمت کی غلط بخشی سمجھنے کے بدلے، یہ سمجھ رہا ہے کہ تو جہاں پر جاہلانہ حکومت کرنے کے لیے، اور یہ جہاں مجبور تیل کی طرح اپنے زخمی کندھوں پر اطاعت کا جوا رکھ کر تیرے دائرہ حکم میں گردش کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے — لیکن ارض ایران کی وسعت، قلعہ سفید کی چار دیواری میں محدود نہیں ہے۔ ہماری موت کے بعد بھی ایران اپنی قوت و شوکت کے ساتھ زندہ رہے گا۔ اور ثابت کر دے گا کہ سہراب وقت کے کھیلنے کا کھلونا اور اتفاقات کی ہوا میں قسمت کی لہروں پر ناچتے ہوئے بلبلے کا تماشا ہے۔

سہراب : پیاری آفرید۔ عورت دنیا کی سب سے زیادہ حسین و محبوب شے ہے۔ جذبات اس کا نام سنتے ہی ناچ اٹھتے، روح اس کے تصور سے روشن ہو جاتی، اور عشق اپنی تمام نیاز مندوں کے ساتھ اس کے قدموں پر سجدے میں گر پڑتا ہے۔ تمہاری اس محبت آزار گفتگو سے اس کی رفعت و محبوبیت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ عورت کی تعمیر پذیر فطرت کے بارے میں کتابوں کے ورق اور انسان کے تجربوں نے جو رائے دی ہے کیا تم اس غلط رائے کو آج صحیح ثابت کرنا چاہتی ہو؟۔

کیوں کیا مخمور و بے خود بادۂ سر جوش سے
کیوں دیا پیغام الفت زمرے سے نوش سے

رستم سہراب

ایک فتنہ اور بالائے زمیں پیدا کیا
کیوں میرے دل میں محبت کا یقین پیدا کیا

مُرد آفرید: محبت کا یقین دلائے بغیر تیری قید سے رہا ہونا ناممکن تھا۔ بے وقوف سُن۔
اپنے اہل وطن کی روح میں نامردانہ زندگی کی حقارت اور شجاعانہ موت کا
احرام پیدا کرنے اور پیدا شدہ جذبے کو آخری سانس تک قائم و شعلہ فشاں
رکھنے کے لیے مجھے زندہ رہنے کی ضرورت تھی۔ شکر ہے کہ میں زندہ ہوں۔
لیکن سہراب کے لیے نہیں، اپنے ملک کے لیے۔ محبت کے لیے نہیں وطن کی
خدمت کے لیے۔ تو ہمارے گھروں اور بے کفن لاشوں پر قبضہ کر سکتا ہے۔
لیکن ہماری زندگی میں ہمارے قلعے اور ہماری آزادی پر قبضہ نہیں کر سکتا۔

سہراب: (انتہائی حیرت سے) مُرد آفرید! مُرد آفرید!!

مُرد آفرید: رعوت کے پتلے! یہ ایران و توران کی کشاکش نہیں، مصافحہ حیات میں
خود غرضی و ظلم سے ایثار و قربانی کی آویزش ہے۔ یہ جنگ جاہلوں کے لیے،
سرمایہ لعنت اور ستم رسیدوں کے لیے تلقین خودداری و درسِ حریت ہے۔ اگر
قسمت کی شرکت و اعانت سے تو کامیاب بھی ہوا، تو تیری فتح شکست سے
زیادہ ذلیل اور وقت کی ناساعدت سے ہم پر انداز بھی ہوئے، تو ہماری
شکست فتح سے زیادہ شان دار ہوگی — تاریک سائے میں ڈوبتے ہوئے
شام کے آفتاب کی طرح دنیا نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اب صرف
دو چیزیں دھویں کے کانڈ پر لکھے ہوئے آگ کے حرفوں کی طرح دکھائی
دے رہی ہیں۔ معزز زندگی یا معزز موت۔

(مُرد آفرید چلی جاتی ہے)

سہراب: حسین جسم میں دعا باز روح! صندل میں سوزش!! چاندنی میں دوپہر کی دھوپ
کی تپش!!! (ہومان۔ بارمان سے) تم سچ کہتے تھے۔ حسن نے کبھی وفادار
دل کی قدر نہیں کی۔ حملہ کرو۔ حملہ کرو۔ اس قلعہ سفید، اس حصار عظیم کی
ہستی، عورت کے وعدے سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ اُف۔ کتنا فریب۔

کلیات آغا حشر کاشمیری - جلد چہارم

عورت!۔ عورت!! تو صرف ایک خوبصورت دھوکا ہے!!!۔

(تورانی لشکر حملہ کرتا ہے۔ فصیل قلعہ سے کھولتے ہوئے تیل،
گراں وزن پتھروں اور تیروں کی خونیں بارش ہوتی ہے۔ طویل و
مہیب جنگ کے بعد سہراب کے گرز سے قلعے کا دروازہ ٹوٹ کر
گر پڑتا ہے۔ اور حملہ آور فوج قلعے میں فاتحانہ جوش کے ساتھ
داخل ہو جاتی ہے۔)

دوسرا ایکٹ - چھٹا سین

قلعہ سفید کا اندرونی حصہ

(حملہ آوروں کا شور۔ زخمیوں کی چیخیں۔ ہتھیاروں کی جھنکار۔ مارو۔
بھاگو کا غل بہرام منگمانہ جذبات و شریانہ مسرت کے ساتھ داخل
ہوتا ہے)

بہرام : گناہ اور سزا دونوں اعتقاد کے فریب ہیں۔ نیکی و بدی کی تھمیل بلند پرواز
عقل کی ترقی مکھوس ہے۔ — آج سے پیشتر اپنی شمشیر و تدبیر سے ملک کے
دشمنوں کی امداد کرنا میں ایک شرمناک گمراہی، ایک بیت ناک گناہ، ایک
پروردہ لعنت جرم سمجھتا تھا۔ مگر اب؟۔ اب نہیں۔ موت، آگ، بربادی نے
شہر کے ہر حصے کو گھیر لیا ہے۔ کئے ہوئے سر، خون کی لہروں پر بلبلوں کی
طرح تیر رہے ہیں۔ ایک دریدہ دہن، محروم فراست چھوکری کو 'مقتل کل' اور
اس کی احمقانہ رائے کو دنیا کی دانش مندی کا خلاصہ سمجھنے والوں کی یہی سزا
ہے۔ میری تردید و توہین کا یہی انعام ہے۔ ایران کی تاریخ میں میرا نام،
قاجار قوم میں لکھا جائے گا۔ — لکھا جائے — دنیا مجھے دشمن وطن کہے
گی۔ کہنے دو — عاقبت خراب ہوگی — ہونے دو — مجھے قوم، وطن،
عاقبت کچھ نہیں چاہیے — انتقام، صرف انتقام چاہیے — بہرام چل۔ دست
بدست جنگ میں دوبارہ سہراب کی رہنمائی کر۔ سہراب کی فتح ہی تیرے
انتقام کی فتح ہے۔

(بہرام کی روانگی۔ خوں چکاں تلوار لیے ہوئے گرد آفرید کا داخلہ)

مُرد آفرید: موت ایک تقصیرِ بیست۔ ایک تبدیلیِ لباس، ایک نقلِ مکانی، ایک جدید آغازِ عمل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ سُر حیات میں مسافر کا پیکر خاکی و مقصد سُر بدل جاتا ہے، لیکن منزل نہیں بدلتی۔ موجودہ زندگی کی انتہا، نئی زندگی کی ابتدا ہے۔ یعنی ہم موت کے دروازے سے معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا میں داخل ہوتے ہیں، یہی زندگی کا راز ہے۔ اور یہ راز صرف شہیدانِ حق و حریت کو معلوم ہے — شہاباش۔ ایران کے فدائی، شمعِ ملت کے پروانو۔ شہاباش۔ تمہارے خون کا ہر قطرہ صبحِ عزت کا نو طلوعِ آفتاب اور تمہاری جگہ آزادی کا ہر لمحہ سعادتِ جاودانی کا سرمایہ دار ہے۔ سرفروشانہ موت کے بعد بھی تم مستقبل کے غیر فانی حافظے اور بقائے دوام کی لازوال دنیا میں زندہ رہو گے۔ تمہاری حیرت آفریں قربانیوں نے مغرورِ سہراب..... (سہراب کا نام زباں پر آتے ہی دل میں محبت کا خوابیدہ جذبہ بیدار ہو جاتا ہے) آہ، کتنا شجاع! کیسا شریف!! اس کے تجلی بار چہرے کی طرف دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اسی چہرے کے نور سے آفتاب و ماہتاب کی آفرینش ہوئی ہے۔ سہراب میری روح کو محبت کی روشنی سے منور کرنے والے سہراب، تم توران میں کیوں پیدا ہوئے؟ اگر تم مادرِ ایران کے فرزند ہوتے تو میں کثیر بن کر تمہاری خدمت کو کامرانیِ نشاط اور تمہاری پرستش کو وسیلہِ نجات سمجھتی۔ اور..... (خیال بدلتا ہے) بے وقوفِ عورت۔ کیا عشق کی بجلیوں کی چمک کو جذبہٴ جگہ کی تڑپ بنا کر ملک و قوم کے اعتبار کو دھوکا دے رہی ہے۔ کیا تو دل سے نہیں صرف زبان و نکوار سے سہراب کی مزاحمت کر رہی ہے؟ ہشیار ہو جا۔ تیرا گنہ گار خیال تجھے جرم کی مہیب دنیا میں کھینچنے لیے جا رہا ہے — اُسی دنیا میں، جہاں لعنت ہے رحمت نہیں۔ سزا ہے، کفارہ نہیں۔ نفرت کر، سہراب سے نفرت کر۔ دل سے بھی اور روح سے بھی..... (شعلہٴ محبت پھر بھڑکتا ہے) لیکن میں نفرت نہیں کرتی۔ اور نہیں کر سکتی۔ تو باعثِ تعجب کیوں ہے؟ دنیا میں کون عورت ہے جو اپنے شہادتِ بیکر، وقارِ کردار، شریفِ رجم، جمیل کو اپنا دل اور اپنا مقدر سپرد نہ کر دے گی! اسے دیکھنے کے بعد اس

رستم سہراب

حسن و جاذبیت سے معمور دنیا کی کسی شے کی طرف دیکھنے کی تمنا باقی نہیں رہتی۔ وہ صانع فطرت کی نظر افروز صنعت اور مصور قدرت کا حسین ترین شاہکار ہے.... (خیال کی رو پھر بدلتی ہے) دور ہو۔ اے عورت کی فطری کمزوری دور ہو۔ محبت کی باغیانہ شورش، فرض کی آواز اور ضمیر کی پکار کو مغلوب نہیں کر سکتی۔ جس قدر کمینہ شرافت سے غدار اپنے ملک سے، بزدل عزت کی موت سے نفرت کرتا ہے، میں بھی، ہاں میں بھی، اسی قدر سہراب سے نفرت کروں گی۔ اس کے چہرے کی نظر فریبی، صرف ایک حسین لعنت ہے — وطن کا دشمن۔ ارض وطن کی طرح خوبصورت، نعرۂ آزادی کی طرح پُر جلال، محبت قومی کی طرح قابل پرستش ہو۔ تب بھی وہ دنیا کی بدترین ہستی ہے۔

(خوف و اضطراب کی حالت میں کسجم کا داخلہ)

کسجم : اودہ۔ وہم بھی نہ تھا کہ انسان، جس کو جن کائنات کا مگل سرسبز، قدرت کا نقش آخر، آفرینش کا خلاصہ، کتاب تخلیق کا حتمہ کہا جاتا ہے، وہ بھیڑیے سے زیادہ خونخوار اور کتے سے زیادہ رذیل ثابت ہوگا۔ — اے خدا۔ تو نے اس بد نہاد شخص، اس متحرک لعنت کے ڈھیر کو کیوں پیدا کیا! کیا اس تک ہستی کے بغیر تیرے بے عیب و مکمل نظام عالم کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی؟

مُرد آفرید : تمہارے ہر لفظ خطرے کا اعلان کر رہا ہے۔ کیا ہوا؟

کسجم : دعا۔ شرم ناک دعا۔

مُرد آفرید : دعا دی۔ کس نے؟ غیرت نے؟ ہمت نے؟ قسمت نے؟

کسجم : ایرانی ماں کے دودھ سے پلے ہوئے سانپ نے۔ قوم کش، خائن ملت بہرام نے۔

مُرد آفرید : طعون۔ دوزخی۔

کسجم : اس نے سہراب کے پاس اپنا ایمان اور دوزخ کے پاس اپنی روح فروخت کر دی۔ اُس کی جفاکشی و بے حسیتی دیکھ کر مجھے تعجب ہو رہا ہے۔

گُرد آفرید: تعجب کیوں کرتے ہو؟ ہمیشہ ملک کے نمک حراموں ہی نے غلامی کے طوق سے اپنے ملک کی گردن کی زینت افزائی کی ہے — غداری کی تاریخ پڑھو۔ بہرام کی وطن دشمنی، دنیا کا پہلا عجیب واقعہ نہیں ہے۔ کسہم: اس کی امداد و رہنمائی سے سہراب کی فوج نے قلعہ کے محفوظ مقامات اور سامان جنگ کے ذخروں پر قبضہ کر لیا۔ عنقریب قسمت جنگ کی کمان سے اپنے ترکش کا آخری تیر چلانا چاہتی ہے۔ اب ہمارے لیے کوئی امید باقی نہیں رہی۔

گُرد آفرید: (تڑپ کر) کیوں باقی نہیں رہی؟ جب تک غلامی سے نفرت باقی ہے۔ غیرت باقی ہے۔ جسم میں ایک بھی سانس اور قلعے میں ایک بھی جانباڑ باقی ہے، اُمید بھی باقی رہے گی۔ ہم فانی دنیا میں لازوال زندگی لے کر نہیں آئے ہیں۔ جب مدت حیات محدود، فنا لازمی، اجل یقینی ہے، تو عزت و شرافت کے ساتھ مرو۔ بہادروں کی طرح مرو۔ بوڑھے، اپانچ ناکارہ ہو کر بیماری کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے بدلے، قوم پر قربان ہو کر، مادر وطن کی آغوشِ محبت میں مرو — نا اُمیدی سامنے سے دور ہو — آؤ بس فتح یا — موت۔

(گُرد آفرید تصویرِ غضبِ بنی کسہم کے ساتھ جاتی ہے۔ سہراب کا بہرام اور سپاہیوں کے ساتھ داخلہ)

سہراب: گُرد آفرید۔ میری روح کی تمنا اور میرے خواب تمنا کی تعبیر ہے۔ اسے زندہ گرفتار کرو۔ خبردار، اس کے سر کے ایک بال اور پاؤں کے ایک ناخن کو بھی صدمہ نہ پہنچے۔

بہرام: لیکن گُرد آفرید ہی نے ایرانیوں کی مردہ ہمتوں میں دوبارہ حرکت حیات، قوت عمل پیدا کی تھی۔

سہراب: اس لیے؟

بہرام: وہ رحم کی مستحق نہیں ہے۔

رستم سہراب

سہراب : عشق کی اتنی مجال نہیں کہ حسن کو اس کے جرم کی سزا دے سکے — جاؤ۔

(بہرام کا سپاہیوں کے ساتھ جانا)

ناز سراپا غرور اور نیاز ہمہ تن شکر ہوتا ہے۔ میں اس بے دید، بے مہر سے
صرف یہ پوچھتا چاہتا ہوں کہ خوبصورتی اور بے وفائی کا آپس میں کون سا
رشتہ ہے؟ چہرہ حسین، دل بہادر، آنکھیں بے مروت، میں نے دنیا میں ایسی
عجیب خوبصورتی اور ایسی عجیب عورت نہیں دیکھی۔

(مُرد آفرید کی تلاش میں جاتا ہے)

--

دوسرا ایکٹ - ساتواں سین

اندرون قلعہ کا دوسرا حصہ

(دور کشف و خون کا ہنگامہ بہ گیر و بہ زن کا شور۔ آگ اور
دھوئیں سے محصور گھروں کا نظارہ۔۔۔ گرد آفرید ٹکان سے
بڑھال، زخموں سے چور، لہو میں شرابور، لڑکھڑاتی ہوئی داخل
ہوتی ہے)

گرد آفرید: آزادی کا آفتاب تلواروں کی فضا میں خون سے رنگین افق پر آخری بار چمک
کر غروب ہو گیا۔ دغا و خیانت نے قلعہ سفید کی قسمت کو غدار بہرام کا تیار
کردہ سیاہ کفن پہنا دیا۔ (تلوار کو مخاطب کر کے) تلوار! پیاری تلوار!! میں
غارت شدہ حیات قومی کا بقیہ، آتش افسردہ کا دھواں، کاروان رفتہ کا پس
ماندہ غبار، ہنگامہ تباہی کی آخری گونج ہوں۔ اس جسم سے روح کی علیحدگی کا
وقت بھی قریب آ پہنچا ہے۔ جب تک موت ان دونوں کو جدا نہ کر دے،
میری جوانی کا سنگسار، میرے ہاتھوں کا زیور، میری زندگی کی وفادار سبیلی، تو
مجھ سے جدا نہ ہوتا — ایک بار سہراب کے خون میں.... (جذبہ محبت سے
مغلوب ہو کر) آہ کیسا خوب صورت نام۔ کتنا شیریں نام!! اس نام کو سنتے
ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کی دنیا میں محبت کے زخموں کی بارش ہو رہی
ہے۔ (خیال میں تبدیلی) محبت! کس کی محبت!! سہراب کی محبت؟ —
خبردار۔ دل۔ خبردار۔ اگر تو نے تصور کے آئینے میں ملک و قوم کے دشمن کی
محبت کا عکس بھی پڑنے دیا۔ تو میں تجھے سینے سے نکال کر بھروسے سے مل کر،

رستم سہراب

ذلت کی ٹھوکر مار کر بھوکے کتوں کے آگے پھینک دوں گی — آہ کیا تھا اور کیا ہو گیا!! انسانی اُمید اور انسانی زندگی کتنی بے حقیقت چیزیں ہیں۔ وقت کی گردش نے ثابت کر دیا کہ اُمید، تاریک فضا میں آسمان سے ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی عارضی روشنی اور زندگی ہوئی لہروں میں بہتے ہوئے پرندے کے متحرک پروں کا زمین پر بھاگتا ہوا سایہ ہے۔

(تورانی سپاہیوں کے ساتھ بہرام کا داخلہ)

بہرام : تلاش کا سیلاب ہوئی۔ گرفتار کر لو۔ گرد آفرید۔ میرے مشورے پر ہنسنے اور میری لہانت پر اظہار پسندیدگی کرنے والوں کی قسمت کا انقلاب دیکھا؟ — کہاں ہیں آزادی ملت کے فدائی؟ کہاں ہے تیرا قومی غرور؟ کہاں ہیں تیرے گرجتے ہوئے دعوے؟

دیکھ آئینے میں چہرہ زخم بھی ہے، خاک بھی
خون میں ڈوبا ہے دل بھی، جسم بھی، پوشاک بھی
گر رہے ہیں آنکھ سے آنسو تن صد پاش پر
رو رہی ہے کیوں کھڑی ہو کر وطن کی لاش پر

گرد آفرید : کیا تیری روح اہرن کے دل کی تاریکی سے پیدا ہوئی ہے؟ کیا تیری پرورش ایرانی ماں کے دودھ کے عوض درندے کے خون سے کی گئی ہے؟ موذی، جلاد۔ اگر تیرے ایمان کی طرح، تیری بصارت و سماعت بھی غارت نہیں ہو چکی، تو دشمن کی ٹھوکروں کی ضرب سے زخمی ملک کی دردناک حالت دیکھ، اور ڈوب مر بندگی اور بے چارگی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مادر وطن کی شرر بار فریاد سُن، اور شرم کر — اس خانماں ویرانی کا باعث، اس سیلاب ذلت کا منبع، اس طوفانِ ہلاکت کا مخرج، اس ناقابلِ نحو و ناقابلِ کفارہ جرمِ عظیم کا مجرم کون ہے؟ — تو — یہ جگر شکاف ماتی آوازیں کسے ازل و ابدی طہون کہہ رہی ہیں؟ — تجھے — جن بہادروں نے حفاظت ملت کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک قربان کر دیا، کیا وہ تیرے قومی

ہوئی نہ تھے؟ جن شریف عورتوں نے فرض کی قربان گاہ میں اپنے شوہروں،
بھائیوں، بچوں کی جانیں ٹار کر دیں، کیا وہ ملکی بینیں نہ تھیں؟ — اپنے
بھائیوں کی زندگیاں، اپنی بہنوں کا سکون و آرام، اپنے مرزبوم کی سلطنت و
قہرمانیت، لٹا کر عداوت کے زخم سے مر جانے کے بدلے خوش ہو رہا ہے؟
ٹوٹے ہوئے دلوں، ذبح کی ہوئی اُمیدوں، خونِ جگر سے بھیگی ہوئی آہوں،
سوختہ قسمتِ قلعہ سفید کی خاکسترِ برباد پر آنسو بہانے کے عوض دوزخ کے
موکل کی طرح بے رحمی سے ہنس رہا ہے۔

بہرام : عداوت کے بازار کا سودا اتنے ہی گراں داموں پر بکتا ہے۔ تو نے مجھ سے
میری نفرت مول لی تھی۔ یہ برگشتہ سختی اسی خرید کردہ نفرت کی قیمت ہے۔
یہ زبوں حالی میری جنس انتقام کا معاوضہ ہے۔

مُرد آفرید : اگر تیرا دل مجھ سے انتقام لینے کے لیے بے قرار تھا، تو شریف دشمن کی
طرح تلوار لے کر میرا مقابلہ کرتا۔ مقابلے کی جرأت نہ تھی تو کھانے میں
زہر ملا دیتا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا تو سوتے میں چھری بھونک دیتا۔ لیکن غریب
ملک نے تیرا کیا قصور کیا تھا، جس قصور کی پاداش میں تو نے اس کے ہر گھر
کو انسانوں کا ذبح اور ہر ذرے کو عظمت و عزت کا ماتم کدہ بنا دیا۔ تو
سہراب کی نوازش کے سائے میں تباہ شدہ وطن کی خاک اور قوم کے زخمی
دل کے خون سے اپنی دنیاوی جنت بنانا چاہتا ہے۔ لیکن اس جنت کا ہر
پھول تیرے مجرم ضمیر کو سانپ بن کر ڈستا، اور یہ معصیت آباد ہمیشہ نفرت و
لعنت کے زلزلوں سے کانپتا رہے گا۔ یاد رکھ، جرم کی زندگی اطمینانِ قلب کی
موت اور گمناہ کی بہار، روح کی خزاں ہے۔

راحت عصیاں سے بڑھ کر رنجِ عالم میں نہیں

وہ جلن اس آگ میں ہے، جو جہنم میں نہیں

بہرام : (بھراہیوں سے) کیا دیکھتے ہو؟ — گرفتار کرو — یا قتل کر دو۔

(سپاہی چاروں طرف سے پورش کرتے ہیں۔ مُرد آفرید ہٹا کر چلا گیا)

رستم سہراب

کی برہمیوں کے حلقے میں محصور شیرنی کی طرح ہر ایک کے حلقے
کا جواب دیتی ہے)

میرے گرسنہ انتقام کا آخری نوالہ۔

(پچھے سے گرد آفرید کی پیٹھ میں خنجر بھونک دیتا ہے)

گرد آفرید: آہ — دغا باز — مار آستین۔ (گرتے گرتے پلٹ کر دہنوں ہاتھوں سے
بہرام کا گلا پکڑ لیتی ہے) اتنے گناہ کر چکا تھا۔ یہ آخری گناہ نہ کرتا تو کیا
دوزخ کے دروازے تیرے لیے بند ہو جاتے؟ کئے، تجھے زندہ رکھنا کمینہ پن
کی عمر میں اضافہ کرتا ہے۔ تیرا ایمان مر چکا۔ انسانیت مر چکی۔ تو بھی مر.....
(غصے میں جان لینے کے ارادے سے گلا دباتی۔ پھر رک جاتی ہے) مگر نہیں
— تو بد فطرت ہے۔ نمک لحام ہے۔ سنگ دل ہے۔ قاتل ہے۔ دنیا کی
بدترین مخلوق ہے۔ سب کچھ ہے، پھر بھی میرا ہم وطن ہے — (گلا چھوڑ
دیتی ہے) جا — قوم پرستوں کے مذہب میں بدی کا بدلہ بدی نہیں ہے۔
میں اپنے وطن کی عزت کے صدقے میں تجھے اپنا خون معاف کرتی ہوں۔

(گرد آفرید زمین پر گرتی ہے۔ سہراب کا داخلہ)

سہراب: یا خدا — میں کیا نظارہ دیکھ رہا ہوں! نفس خاکی کی رنگیں نوا فاختہ، چکر
شجاعت کی حسین روح، شعلہ حسن کی جلی، خون میں ٹوپی ہوئی ہے!!۔ افسانہ
عزت کا عنوان، مجیدہ حریت کا سرنامہ، جرأت نسوانی کی تاریخ کا ورق زریں
خاک پر پڑا ہوا ہے!!! (گرد آفرید کا سر زانو پر رکھ کر) آفرید — پیاری
آفرید — آنکھیں کھولو — میں تمہیں بے وفائی کا الزام دینے کے لیے نہیں
اپنی وفاداری کا یقین دلانے آیا ہوں۔ تمہارا تبسم ناز میری پرستش کا صلہ
ہے۔ کیا ناکام محبت کو اپنے لب نازک سے تسکین نہ دوگی؟ — کیا اپنی
مسکراہٹ سے میرے دل کی تاریکیوں میں امید کی صبح پیدا نہ کر دوگی؟
گرد آفرید: (آنکھیں بند کیے ہوئے نیم بیہوشی کے عالم میں) کس کی آواز! — ستاروں

کا گایا ہوا نغمہ آسانی — زمین پر — کون گارہا ہے؟

سہراب : تمہارا شیدائی، تمہارا پرستار سہراب۔

مُرد آفرید : (آکھیں کھول کر) تم — تم — اوہ — مرنا بھی مشکل ہو گیا — (جوش
محبت سے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے اور گر پڑتی ہے) آؤ — پیارے سہراب،
آؤ — حصیں دیکھ کر دل میں زعمہ رہنے کی تمنا پیدا ہو گئی۔ لیکن اب تمنا
کا وقت نہیں رہا۔ عدم کے مسافر کا سامان بندھ چکا ہے — زندگی کے
نظارے اسے ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہے ہیں — میرے دل کے مالک
— میرے فرض نے مجھے بے مروت بننے کے لیے مجبور کر دیا تھا — حق
وطن کا مرتبہ عشق سے بلند تر ہے — اس لیے مجھے معاف کرو — اور جو
ہوا — اُسے بھول جاؤ — موت کے دروازے پر دنیا کی دوستی و دشمنی ختم
ہو جاتی ہے۔

سہراب : پیاری آفرید، تم نے دنیائے فرض کی ایک جدید حقیقت اور عورت کے دل
کی عظمت کا ایک عظیم الشان راز ظاہر کر کے وہ بوجھ دور کر دیا جس سے
میری روح پاش پاش ہوئی جا رہی تھی — میرا خیال تھا کہ تم مجھے اپنی
محبت کا مستحق نہیں سمجھتیں، اس لیے اس قدر جوش مخالفت کے ساتھ جنگ
کر رہی ہو۔

مُرد آفرید : آہ حصیں کیا معلوم کہ عشق و فرض کی کشمکش میں میری روح نے کتنے عذاب
برداشت کیے ہیں — کتنے طوفان، کتنے زلزلوں سے تنہا وقف پیکار رہی
ہے۔ صدمہ نہ کرو — دوست اور دشمن ہم نام ہیں۔ اس لیے ہمیں دھوکا ہوا
— میں نے اپنے پیارے سہراب سے نہیں، اپنے ملک کے مخالف سے
جنگ کی ہے۔

سہراب : آہ۔ ان نظموں میں کتنا ترنم اور کتنی امید نوازی ہے — قسمت کی ستم ظریفی
دیکھو۔ تسکین کے پیارے کو راحت کا آب حیات بھی پلا رہی ہے اور جدائی
کا زہر بھی۔

رستم سہراب

(ایک جوش غضب میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

(سہرابوں سے) کیا میری زبان کے واضح الفاظ معنی و مفہم سے تہی دست تھے — میرے کلمے سے بے پردا ہو کر دنیا کی یہ سب سے زیادہ قیمتی زندگی کس نے برباد کی؟

بہرام : (غریہ لہجے میں) میں نے —

سہراب : تو نے! — ایک ایرانی نے!! — گرد آفرید کے ہم قوم و ہم وطن نے!!! کس لیے؟

بہرام : اس لیے کہ یہ میرا خیر خواہانہ فرض تھا۔ اس لیے کہ وہ تورانیوں کی دشمن تھی اور میں توران کا دوست ہوں۔

سہراب : تو کتنا بے حیا، کتنا بدمصل، کتنا قابل نفرت ہے — مرقع شجاعت کی جس تصویر فدائیت نے ملک و قوم کی آبرو پر اپنی محبت، راحت، امید، زندگی کی ہر بیش بہا شے قربان کر دی۔ اس کے سینے میں — اس سینے میں — جو عشق وطن سے معمور ہو رہا تھا، خنجر بھونکتے وقت تیرے دل نے تجھ پر لعنت نہ کی؟ تیرا ہاتھ قبضے تک پہنچنے سے پیشتر مفلوج نہ ہو گیا؟ — سب دنیا! تیرے جسم کے ہر ذرے نے جس ایران کے نمک سے پرورش پائی ہے، جب تو نے اس محسن ایران سے وفاداری نہ کی۔ تو تو توران کا کب دوست ہو سکتا ہے — جس منہ سے اپنے کو تورانیوں کا دوست کہتا ہے — میں اُس ذلیل منہ پر تھوکتا ہوں — تیرے رہنے کی جگہ — دنیا نہیں — دوزخ ہے —

(بہرام کے سینے میں خنجر بھونک دیتا ہے)

بہرام : دنیا کے لیے عاقبت خراب کی تھی۔ لیکن گناہ نے فریب دے کر عاقبت بھی تباہ کی اور دنیا بھی۔ (مر جاتا ہے)

گرد آفرید : فرشتے روشنی کی چادر میں لپٹے۔ پھول اور نغمے بکیرتے ہوئے آہستہ آہستہ زمین پر اتر رہے ہیں — دنیا عالم نور سے بدل رہی ہے — مرکز اصلی کی

طرف مائل پرواز روح کے لیے — آسمان کا دروازہ کھل گیا ہے — کس نے پکارا؟ — زندگی کے دروازے پر کون دستک دے رہا ہے؟ — موت — تو ہے؟ میں نہیں سمجھتی تھی کہ تو اتنی خوبصورت ہوگی — الوداع پیارے وطن — الوداع پیارے سہراب۔ الوداع۔

نہیں معلوم راز مرگ دنیا کے طبیبوں کو
اگر فرصت ملے تو یاد کرنا بد نصیبوں کو

(آخری پگلی لے کر دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے)

سہراب : ٹھہر — اے حسین مسافر و ٹھہر — تو کارگاہ تمنا کو خرابہ یاس۔ ایوان نشاط کو ماتم سرا، جلوہ زار ہستی کو مسکنِ ظلمت بنا کر کہاں جا رہی ہے؟ واپس آ — اے نامعلوم منزل کی رہرو، واپس آ۔ تیرے جانے کے بعد دنیا میں حرف فریاد اور آنسوؤں کی آبادی رہ جائے گی۔ آفتاب و مہتاب، آسمان کے دل کے داغ، تارے رات کے جگر کے آبلے اور رنگین پھول زمین کے جسم کے زخم معلوم ہوں گے۔ (دیوانہ وار پکارتا ہے) آفرید — آفرید — آفرید — اے جمالِ مطلق۔ اے حسن گویا۔ تو کیوں خاموش ہو گیا۔ تو کیوں بے کسی کی پکار کا جواب نہیں دیتا۔ کیا میرے لیے اب تیرے پاس محبت کی ایک مسکراہٹ، تسکین کا ایک حرف بھی نہیں ہے؟ — ہائے کون جواب دے؟ پھول ہے، خوشبو نہیں۔ مکان ہے، کبیس نہیں۔ سلطنت ہے ملک نہیں — (گُرد آفرید کی لاش سے مخاطب ہو کر) قدرت نے کائنات سے اپنا عطیہ عظمت واپس لے لیا۔ دنیا کا حسنِ بہشت کے اضافہ جمال کے لیے بلا لیا گیا۔ زمین کے چہرہ فخر کا جلال، تاریکی عدم کو مطلع نور بنانے کے لیے چلا گیا — اے ملکہ جمال تو نے فرض پر عشق کو اور ملک پر زندگی کو قربان کر کے حیاتِ ابدی حاصل کر لی۔ ایران کی آئندہ سلیس تیرے ثبات و استقلال کے حیرت آفریں کارناموں پر فخر کریں گی — ایران کی لڑکیاں تیری بہادری کے گیتوں سے اپنی زندگیوں کو مبارک بنائیں گی — ایران کی تاریخ

رستم سہراب

ایثار کے حرف تیرے پُر جبروت نام کی تجلی سے صلیبِ دنیا پر آفتابِ ماہتاب
بن کر چمکتے رہیں گے — اے پژمرده بہارِ آفرینش، اے افسردہ فعلیہ وطن
پرستی، اے خوابیدہ طوفانِ شجاعت، میں تیرے قدموں کو الوداعی بوسہ دیتا ہوں
— یہی اولین — اور یہی آخری بوسہ محبت ہے۔

(ردتا ہوا گردِ آفرید کے پیروں پر گر پڑتا ہے)۱

(پردہ)

۱ ”محسن و فرض“ کے نام سے کیا گیا ڈراما یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ (مرتبین)

تیسرا ایکٹ - پہلا سین

سہراب کے لشکر کی چھاوٹی

(ہومان، بارمان، تورانی سردار اور سپاہی اپنی کامیابیوں کا جشن منا رہے ہیں)

ہومان : بادل کے محل میں سنہری پوشا ز بہن کر بجلی ناچ رہی ہے۔

بارمان : کل تلوار کی تان پر موت کا ناچ بھی شروع ہو جائے گا۔

سردار ۱ : صرف ناچ؟

ہومان : گانا بھی۔

سردار ۲ : کون گائے گا؟

ہومان : زندگی۔

سردار ۳ : کیا گائے گی؟

ہومان : فنا کا گیت۔

سردار ۱ : زندگی تو غم اور خوشی کے سروں سے بنا ہوا خود ایک دلچسپ گیت ہے۔

سردار ۲ : ٹھیک کہا۔ اور یہ گیت حرا اس وقت دیتا ہے جب اسے شراب کا پیالہ ہاتھ میں لے کر گایا جائے۔

سردار ۳ : (پیالہ بڑھا کر) لیجیے۔ ہونٹوں کی معراب سے روح کے ستار میں زندگی کی راگنی بجائیے۔

سردار ۱ : اہا ہا۔۔

رستم سہراب

شراب ناب کے جلووں سے ساغر میں اُجالا ہے
ہزاروں چودھویں کے چاند ہیں اور ایک ہالا ہے

سردار: ۲۔ ۱۔

یہ وہ شے ہے گرے تو خاک سے اکیر پیدا ہو
ہر اک قطرہ سے اک اک حُسن کی تصویر پیدا ہو

تیسرا ایکٹ - دوسرا سین

کیکائوس کا دربار

(کیکائوس تخت پر بیٹھا ہے۔ غصے سے چہرہ خوفناک اور آنکھیں لال ہو رہی ہیں)

کیکائوس : جس کیکائوس کے ابرو پر شکن دیکھ کر دنیا گنہگار غلام کی طرح کانپ کر سجدے میں گر جاتی ہے۔ جس کے قہر کے حضور میں طوفان سے زیادہ طاقت ور اور زلزلے سے زیادہ خوفناک انسان دو زانو ہو کر رحم کی بھیک طلب کرتے ہیں۔ اس کے غضب سے یہ بے پروائی!۔ اُس کے حکم سے یہ سرتابی!!۔ کوئی وہ فرماں بردار نہیں فرماں روا ہے۔ ایران کا خادم نہیں ایران کا آقا ہے۔ رستم۔ مغرور رستم، تیری روح میں بغاوت کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ میرا شاعری مرتبہ یہ جرات اور گستاخی کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

گودرز : جہاں پناہ۔ خانہ زاد کی جاں بخشی ہو۔ آپ غصے میں غلط رائے قائم کر رہے ہیں۔ رستم سے اس وقت تک کوئی ایسا قصور سرزد نہیں ہوا کہ اس کی بے داغ جاں نثاری پر شبہ کیا جائے۔ دنیا میں دو چیزیں ہمیشہ اپنی روشنی سے چمکتی رہیں گی۔ آسمان پر آفتاب اور زمین پر رستم کی وفاداری۔

کیکائوس : دھوکا نہ کھاؤ۔ تم اوپر کا طمع دیکھ کر پیتل کو سونا سمجھ رہے ہو۔ گودرز : غلام کی یہ گزارش ہے کہ تورانی لشکر ہمارے قلعوں، شہروں، صوبوں کو فتح کرتا اور حریف طاقتوں کو روندتا ہوا شاعری پایہ تخت کے سامنے پہنچ کر بھوکے شیروں کے جھنڈ کی طرح گرج رہا ہے۔ سہراب جیسے خوفناک دشمن کے

رستم سہراب

مقابلے میں اس وقت ایران کو رستم کے مشورے، مدد اور تلوار کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے اسے ناراض کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر وہ آنے کے بعد رنج و غصہ سے واپس چلا گیا تو ایران اپنے سب سے بڑے خیر خواہ اور سب سے بڑے سپاہی کی خدمت سے محروم ہو جائے گا۔

طوس : جلالت مآب۔ رستم کا نعرہ جنگ سننے ہی مردہ ہستیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ ۔

ڈر نہیں کچھ بھی اگر ہو سارا عالم اک طرف
لاکھ لشکر اک طرف ہوں اور رستم اک طرف
سلطنت کی آبرو ہے، ملک کا اقبال ہے
وہ ہمارے بازوؤں کا زور سر کی ڈھال ہے

کیاؤس : جنگ میں شرکت ہی کے لیے میں نے خط لکھ کر اسے طلب کیا تھا۔ لیکن اس کا زابل سے ایران نہ آنا، کیا ثابت کر رہا ہے؟ — یہی کہ تمہاری خوشامد اور تعریفوں نے اسے مغرور بنا دیا ہے۔ وہ تم سب کی ہستیوں کو، میری مہربانوں کو اور اپنی حقیقت کو فراموش کر چکا ہے۔ ۔

سمجھتا ہے کہ مجھ سکتا نہیں ہرگز چراغ اس کا
اسی سے بڑھتا جاتا ہے غرور اس کا دماغ اس کا

(رستم کا داخلہ)

رستم : ۔

اے تاج بخش، باج ستاں، شاہ کامگار
اے ملک گیر، قلعہ شکن، شیر کارراز
تو حسن کائنات ہے، تو فخر روزگار
قسمت ہو زیر حکم، ظفر زیر اختیار
جب تک فلک پر جلوہ شمس و قمر رہے
اس تاج کی ضیا سے جہاں میں سحر رہے

(کیکائوس غصے سے دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہے)

کیکائوس : (اپنے آپ میں) جھوٹا — ریا کار۔

رستم : خاقان عالم، غلام حاضر ہے۔

جب تک خدا کے نور سے روشن ہیں صبح و شام
برتر ہو آسمان سے اس تخت کا مقام
ایران کی اطاعت و خدمت کے واسطے
حاضر ہے دست بستہ شہنشاہ کا غلام

کیکائوس : تو صرف ہونٹوں سے اپنے کو غلام کہہ کر میرے غصے اور میرے اختیار کا منہ
چڑھاتا ہے۔ طلبی کا خط ملنے کے بعد بھی فوراً حاضر ہونے کے بدلے میرے
حکم سے بے پروائی برتا، کیا یہی فرض شناس غلاموں کا طریقہ ہے؟ یہ غلامی
نہیں نمک حرامی ہے۔

رستم : رستم اور نمک حرام!۔ خداوند نعت، میرے کانوں نے آج تک ایسے ذلیل لفظ
نہیں سنے۔ جو رستم ایران کی اطاعت کو اپنا فرض، ایران کی خدمت کو اپنا
مذہب اور ایران کی محبت کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ اُسے نمک حرام کہہ کر آپ
اپنی مردم شناسی اور قدر دانی کا ثبوت دے رہے ہیں؟

صلہ اچھا ملا مجھ کو مری خدمت گزاری کا
یہی انعام ہے کیا عمر بھر کی جاں نثاری کا

کیکائوس : اب تک میری آنکھوں پر تیری بناوٹی وفاداریوں نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ آج
وہ پردہ ہٹ گیا۔ اب میں تجھے تیری اصل شکل میں دیکھ رہا ہوں۔

عیاں ہر حرف ہے مجھ پر ترے دل کے نوشتے کا
مجھے دھوکا نہ دے تو روپ بھر کر اک فرشتے کا

رستم : بس۔ جہاں پناہ۔ بس۔ کیا حضور نے سر بازار مجھے ذلیل کرنے کے لیے زائل
سے ایران میں طلب کیا ہے؟ ادب اور برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔

میں بھی اپنے سینے میں رکھتا ہوں دل انسان کا
دھیان رکھیے اپنے رتبے اور اپنی شان کا
کیا کہوں۔ دیتا ابھی پتھر سے پتھر کا جواب
شرم آتی ہے کہ کھایا ہے نمک ایران کا

کیکاؤس: تیری بے خوفی اور سرکشی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایران میں دو بادشاہ
حکومت کر رہے ہیں۔ آج تیرے غرور کی تجھے سزا دے کر ثابت کروں گا کہ
ایران کا بادشاہ رستم نہیں، کیکاؤس ہے۔

رستم: تب میں بھی یہ کہنے کے لیے مجبور ہوں کہ کیکاؤس کی سلطنت اور کیکاؤس کا
تاج رستم ہی کی تلوار اور بازو کی مدد سے ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔
اگر اس دل میں بادشاہ بننے کی خواہش ہوتی، تو آج ایران کا تاج کیکاؤس
کے سر پر نہیں، رستم کے سر پر دکھائی دیتا۔ لیکن میرا کام بادشاہ بننا نہیں
بادشاہ بنانا ہے۔ میں تاج پہنتا نہیں، تاج بخشا ہوں۔

ٹکا کرتے ہیں میری مہربانی کی نگاہوں کو
میں وہ ہوں، بھیک میں دیتا ہوں تاج و تخت شاہوں کو

کیکاؤس: یہ سلطنت کا مجرم ہے — گرفتار کر لو — خاموش کھڑے ہو! — کیا میرا حکم
نہیں سنا؟ — قید کرو۔

رستم: ناعاقبت اندیش کیکاؤس، اپنی عقل کی تاریکی سے کیانی تاج کی چمک کم نہ
کرو۔ آج مجھے معلوم ہو گیا کہ جس تخت پر کیومرث، ہوشنگ، طہمورث، جشید،
فریدون، منوچہر، نوذر، کیقباد جیسے دانا و بینا بادشاہ بیٹھ کر دنیا میں ایران کا نام
روشن کر چکے ہیں، تم اس مسند عزت، اس شاهی تخت پر ہرگز بیٹھنے کے لائق
نہیں ہو۔

سلطنت ایران کی پائی، سمجھ پائی نہیں
ایک بچے کے برابر تم میں دانائی نہیں
راستہ کوئی دکھا سکتا نہیں بدبخت کو
لو چلا میں۔ اب بچاؤ، اپنے تاج و تخت کو

(رستم غصے میں چلا جاتا ہے)

گودرز : اعلیٰ حضرت۔ جہاں سہراب کی شکل میں دروازے پر موجود ہے۔ ہمیں کو واپس بلائیے۔

کیاؤس : کبھی نہیں۔ رستم ایران سے چلا گیا، تو کیا ایران کی زمین غلہ نہ اگائے گی۔ ایران کا آسمان پانی کے بدلے زہر برسائے گا۔ ایران میں آفتاب و ماہتاب طلوع نہ ہوں گے۔ ایرانی تاج کے تائبک الماس، چمکتے ہوئے ہیرے نکھر، سنگ ریزے، پتھر بن جائیں گے۔ میں رستم کو کوئی چیز نہیں سمجھتا۔ رستم کی عزت ایران سے ہے۔ ایران کی عزت رستم سے نہیں ہے۔

طوس : ایک بار پھر غور کیجیے۔

کیاؤس : ضرور نہیں۔

طوس : افسوس۔ آپ نے آدمی دنیا فتح کر لی۔ لیکن اپنے غصے کو فتح نہ کر سکے۔ کیاؤس : بس۔ خاموش۔

(غصے میں خنجر لے کر تخت سے اتر آتا ہے۔ طوس سر جھکا دیتا)

ہے۔ گودرز کیاؤس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ درباری حیرت سے دیکھتے

رہ جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ - تیسرا سین

جہادنی

(رات کا وقت۔ دور ایرانی اور تورانی لشکروں کے خیمے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہومان، بارمان اور ہجیر کے ساتھ سہراب کا داخلہ)

سہراب : ہجیر۔ تم میری قید سے رہائی چاہتے ہو؟
ہجیر : چاہتا ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے۔ ایران میرا وطن ہے، میں آپ کا شریک ہو کر ایران کے خلاف تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔

سہراب : قوم کی جاں نثار گرد آفرید کی طرح جس ایرانی کے دل میں وطن کی محبت نہیں ہے، میں خود اسے دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھتا ہوں — اچھا تو میں تمہیں رہائی دوں گا۔ عزت، دولت، عہدہ اور جاگیر بخشوں گا — اور آج سے اپنا عزیز ترین بھائی سمجھوں گا۔ صرف اتنا بتا دو..... (ہجیر کو سوچ میں ڈوبے دیکھ کر) سنتے ہو؟

ہجیر : (چونک کر) سن رہا ہوں۔
سہراب : کیا واقعی رستم اس لشکر میں نہیں ہے؟
ہجیر : میں نے ایرانی لشکر کا ایک ایک کونہ، ایک ایک خیمہ، ایک ایک سردار کا چہرہ آپ کو دکھا دیا اور ان سرداروں کے نام، رتبے اور عہدے سے بھی واقف کر دیا۔ تعجب ہے کہ پھر بھی آپ میری سچائی پر شک کر رہے ہیں۔
سہراب : بے شک میں نے ہمیں بدل کر رات کی تاریکی میں تمہارے ساتھ ایرانی فوج کا پوری طرح جائزہ لیا۔ لیکن میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ ضرور

موجود ہے۔ ہجیر۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ رستم کو پہچاننے میں تمہاری آنکھوں نے غلطی کی ہو؟

ہجیر : میں رستم کو ایک بار نہیں سینکڑوں بار دیکھ چکا ہوں — میری نظر ابھی اتنی کمزور نہیں ہے کہ دیکھی ہوئی صورت کو بھی نہ پہچان سکوں۔

سہراب : تو پھر حلیم کرلوں کہ وہ زابل سے ایران کی مدد کے لیے نہیں آیا؟
ہومان : مجھے جاسوس سے اطلاع ملی ہے کہ رستم اس جنگ میں کیاؤس کی مدد کے لیے آیا تھا۔ لیکن کیاؤس نے سردار اس کی بے عزتی کی اور وہ بے انتہا ناراضی اور غصے کے ساتھ اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

سہراب : ایک طرف ان کی آواز اور ایک طرف دل کی آواز۔ کس آواز کو سچائی کی آواز سمجھوں!!

ہجیر : (اپنے آپ سے) اگر سہراب نے رستم کی جان کو نقصان پہنچایا تو میرے ایران کی کون حفاظت کرے گا؟ — نہیں۔ سچائی کو اندھیرے سے روشنی میں نہ آنے دوں گا۔

سہراب : دیکھ ہجیر۔ جس طرح رات کے وقت شکار کی تاک میں بیٹھے ہوئے بھیڑیے کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں۔ اسی طرح مجھے تیری نگاہوں میں بھی ایک عجیب و خوفناک چمک دکھائی دیتی ہے۔ ”رستم نہیں ہے“ یہ کہتے وقت ہوا سے ہلے ہوئے ہنکے کی طرح تیرے ہونٹ کانپ اٹھتے ہیں اور پیلے پتے کی طرح تیرا چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔ (گریبان پکڑ کر) خبردار مجھے دھوکا نہ دینا۔ ورنہ قسم ہے تلواری کی کہ تیرے خون کو موری میں بہتے ہوئے پانی سے بھی زیادہ حقیر سمجھوں گا۔ آگے بڑھ — اب دنیا میں تیرے لیے دو ہی چیزیں رہ گئی ہیں، سچا ثابت ہو گیا تو رہائی — اور جھوٹا ثابت ہوا تو موت۔

(ہجیر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لے جاتا ہے)

بارمان : جب سہراب رستم کے خیمے کے پاس پہنچ کر نہایت غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا، اس وقت مجھے اندیشہ ہوا کہ ضرور خون کا جوش خون کو پہچان

رستم سہراب

لے گا۔ لیکن شاباش ہے ہجیر کو۔ کہ اُس کے ایک جھوٹ نے باپ بیٹے کے
چچ میں سینکڑوں پردے حائل کر دیے۔

ہومان : لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کیاؤس کے دوبار سے خفا ہو کر چلے آنے
کے بعد، رستم دوبارہ کیاؤس کی اعانت کے لیے کس طرح رضامند ہو گیا۔

بارمان : کیاؤس نہایت غصہ ور اور جلد باز بادشاہ ہے۔ جوش کم ہونے کے بعد اسے
اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ آخر اس کے اظہار ندامت اور طوس و گودرز کے
سمجھانے سے رستم اپنا ارادہ بدل دینے کے لیے مجبور ہو گیا۔

ہومان : اپنے بادشاہ افراسیاب کی آرزو پوری کرنے کے لیے کوشش کرو کہ اس جنگ
کے آخر تک باپ بیٹے ایک دوسرے کو نہ پہچان سکیں۔ توران کی سلامتی کے
لیے رستم اور سہراب دونوں کو — اور دونوں نہیں تو ایک کو مرنا ہی چاہیے۔
ورنہ یہ مل کر ساری دنیا کو ایران اور کیاؤس کا غلام بنا دیں گے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ - چوتھا سین

میدان جنگ

(اندر سے لڑائی کے باجے اور مارو مارو کا شور سنائی دیتا ہے۔
ایران کے کچھ سپاہی پناہ پناہ کہتے ہوئے بھاگتے نظر آتے ہیں۔
گودرز اور طوس کے ساتھ رستم داخل ہوتا ہے)

رستم : شاباش، سہراب، شاباش۔ آفریں ہے تیری بہادری کو۔ آفریں ہے تیری ماں
کے دودھ کو۔ (طوس و گودرز سے) میدان جنگ میرا وطن اور تلواروں کی
چھاؤں میری آرام گاہ ہے۔ میری ساری زندگی تنجروں کی چمک اور خون کی
بارش میں بسر ہوئی ہے لیکن میں نے آج تک معرکہ کارزار میں اتنی بے
جگری اور اتنی شاعرانہ بے پروائی کے ساتھ کسی انسان کو موت سے کھیلے
ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کی حیرت ناک دلیری اور طریق جنگ دیکھ کر یہ
معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک دوسرا رستم پیدا ہو گیا۔

گودرز : لیکن جس طرح آگ پر پارہ اڑ جاتا ہے۔ اسی طرح مقابلے کے وقت
آپ کا نام سنتے ہی، اس کی طاقت بھی اس کے بازوؤں سے ٹکڑہ ہو
جائے گی۔

رستم : میں نے صرف ایران کی محبت و فرض سے مجبور ہو کر انصاف، دیانت اور
اپنے اصول و شان کی خلاف ایک سولہ برس کے نا تجربہ کار لڑکے کے
مقابلے میں میان سے تلوار کھینچی۔ لیکن میں اس کے سامنے اپنا رعبہ اور
نام ظاہر نہیں کروں گا۔ کیونکہ ایک کم سن بچے سے لڑنا رستم کی آبروریزی، رستم

رستم سہراب

کے نام کی بے عزتی ہے۔

(اندر پھر شور ہوتا ہے)

طوس : وہ دیکھیے۔ وہ دیکھیے۔ پھر ہمارا لشکر سیلاب کی طرح آگے بڑھنے کے بدلے
کنارے سے ٹکرا کر واپس لوٹتی ہوئی لہر کی طرح سٹ کر پیچھے ہٹ رہا
ہے۔

رستم : زندگی کی اتنی محبت!۔ موت کا اتنا خوف!!۔ کیا یہ میدان جنگ میں تلووار و
شپاعت کو ذلیل کرنے آئے تھے!!! — جاؤ — جاؤ — ان سے کہو کہ مایوس
نہ ہوں۔ رستم زندہ ہے۔ اور ایران کا اقبال بھی زندہ رہے گا۔ (گودرز اور
طوس جاتے ہیں۔ اندر دوبارہ شور ہوتا ہے) ان بزدلوں کی روح میں غیرت
کی روشنی بجھ گئی ہے۔ اس لیے انھیں فرض کا راستہ دکھائی نہیں دیتا — یہ
کون ہے؟ سہراب؟ ہاں وہی ہے۔ کتنا بہادر! کتنا خوبصورت!!۔ دیکھنے سے
آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ میرا فرزند ہوتا، تو آسمان کی طرح آج
زمین پر بھی، دو آفتاب و ماہتاب دکھائی دیتے — آہ۔ وہ موت کی تلاش
میں اسی طرف آ رہا ہے۔ واپس جا سہراب۔ اگر تیرے باپ ماں زندہ ہیں
تو ان کے بڑھاپے اور ارمانوں پر رحم کر۔ اور واپس جا۔ نادان۔ تو ایران
میں رستم سے نہیں، اپنی قسمت سے جگ کرنے آیا ہے۔

(سہراب کا داخلہ)

سہراب : چہرہ آگ اور دل برف۔ خوف کی آندھی میں، ریت کے ذروں کی طرح
اڑتے پھر رہے ہیں۔ شاید ان بزدلوں کے عقیدے میں بھاگنے ہی کا نام
بہادری ہے۔ کیاؤس۔ تیری قسمت کے روشن دن کی شام آگئی۔ کل میرے
قدم تیرے تخت پر اور تیرا تاج میرے قدموں میں ہوگا۔

(آگے بڑھتا ہے۔ رستم روکتا ہے)

رستم : ظہر۔ اس جنگ میں خود فتح تیرے منہ کی دھار، اور نصیب تیرے بازوؤں کا

زور بن جائے۔ تو بھی تو کیا دوس تک زندہ نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ اس کا تاج، تیری امید سے اور اس کا تخت تیری ہمت سے بہت زیادہ بلند ہے۔

سہراب : یہ چہرہ! یہ جلال!! — اے ایرانی بزرگ تو کون ہے؟

رستم : ایران کا نمک خوار۔ شہنشاہ کیا دوس کا جاں نثار۔

سہراب : (اپنے آپ سے) میری ماں نے اپنے لفظوں سے میرے دل پر جو رستم کی تصویر کھینچ دی ہے اس جتنی تصویر سے یہ بُر عظمت چہرہ کس قدر مشابہ ہے۔

رستم : میں دنیا کی کوئی عجیب چیز نہیں ہوں۔ تو میرے چہرے کی طرف غور سے کیا دیکھ رہا ہے؟

سہراب : (اپنے آپ سے) —

وہی شوکت عیاں ہے، اس کے تیور اور قرینے سے

اڑے جاتے ہیں نقشِ دشمنی دل کے گلینے سے

نہ جانے کون کہتا ہے کہ بڑھ۔ قدموں پہ سر رکھ دے

بکھی ہے باپ تیرا۔ جا، لپٹ جا۔ اس کے سینے سے

رستم : وہی خاموشی — وہی حیرت — کیا تو کوئی خواب دیکھ رہا ہے؟ —

آنکھیں کیوں پھرا گئیں، بڑھتے قدم کیوں جم گئے

کیا ہوا جو یک بیک آندھی کے جھوکے تھم گئے

ناز مت کر۔ ہاتھ بے قیمت لبو میں رنگ کر

مورقوں سے لڑچکا۔ آ۔ مرد سے اب جنگ کر

سہراب : جنگ دشمن سے ہوتی ہے۔ عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ یہ جنگ

خون ریزی سے شروع ہو کر انگ باری پر ختم نہ ہو۔ اس لیے حملے سے پیشتر،

اے محترم انسان میں تیرے نام اور رتبے سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ —

جس کو دیکھا تھا کبھی اکبرِ تقریر میں

دیکھتا ہوں میں وہی جلوہ تری تصویر میں

رستم : تو جب طرح کی گفتگو کر رہا ہے۔ کیا موت کے خوف سے دیوانہ ہو گیا ہے؟ —

رستم سہراب

پوچھنا نام و نشان، اس جنگ کے انجام سے
لڑنے آیا ہے یہاں مجھ سے، کہ میرے نام سے؟

سہراب : میں نام اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ یہ چہرہ دیکھ کر میرے دل میں دشمنی کی
جگہ تیری عزت پیدا ہو گئی ہے۔

جس کی تلوار سے، توران کے لب پر دم ہے
کیوں چھپایا ہے، یقیناً تو وہی رستم ہے

رستم : رستم شیروں سے، اژدہوں سے، بہادری کے طوفان سے لڑتا ہے۔ اپنی عمر،
رتبے اور شہرت کی توہین کرنے کے لیے جنگ کے میدان کو ماں کی گود
سمجھنے والے ناسمجھ لڑکوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔

سرد ہو جاتے ابھی، یہ جوش کیا، اور شور کیا
سامنے رستم کے تو کیا اور تیرا زور کیا
کانپ اٹھتا۔ دیکھتے ہی موت کی تصویر کو
جنگ میں رستم نہ آیا، دے دعا تقدیر کو

سہراب : بہادر بوڑھے، میرا دل نہیں چاہتا، کہ تجھ پر حملہ کروں — میں منت کرتا ہوں
کہ مجھے غفلت کے اندھیرے میں نہ رکھ — اگر واقعی تو رستم ہے، تو میں
تلوار پھینک کر، ہاتھ جوڑ کر، دو زانو بیٹھ کر تیرے قدموں کو بوسہ دوں گا، اور
عزت و ادب کے ساتھ سر جھکا کر تیری بزرگی کو سلام کروں گا۔

اور کہوں گا کہ خوش اقبال بنا دے مجھ کو
ہاتھ رکھ سر پہ مرے اور دعا دے مجھ کو

رستم : دنیا پر یہ ثابت کرنے کے لیے سہراب نے رستم جیسے بیکٹائے زمانہ دلیر
سے جنگ کی تھی، تو دھوکا دے کر مجھ سے رستم ہونے کا اقرار کرانا
چاہتا ہے۔

کیوں نہیں کہتا کہ مجھ میں جنگ کا اب دم نہیں

ہوش میں آ، کان کھول اور سن کہ میں رستم نہیں
 سہراب : اگر تو رستم نہیں ہے۔ تو آنکھیں بند ہونے سے پہلے، دنیا کو آخری مرتبہ
 حسرت کی نظروں سے دیکھ لے۔

(دونوں پہلے گرز سے، پھر گرز پھینک کر تلواروں سے اور تلواریں
 ٹوٹ جانے کے بعد ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آپس
 میں جگمگ کرتے ہیں۔ آخر میں سہراب رستم کو زمین پر گرا دیتا
 ہے اور چھاتی پر چڑھ کر قتل کے ارادے سے خنجر نکالتا ہے۔ رستم
 سہراب کی کلائی پکڑ لیتا ہے)

رستم : ٹھہر — ایران کے بہادروں کا دستور ہے کہ دشمن کو دو مرتبہ شکست دینے
 کے بعد قتل کرتے ہیں۔ اگر تجھے اپنے بازوؤں کی طاقت پر بھروسہ اور
 تیرے دل میں بہادروں کے دستور کی عزت ہے تو مجھے کل نصیب آزمائی کا
 ایک اور موقع دے۔ کل کا فیصلہ قسمت کا آخری فیصلہ ہوگا۔
 سہراب : کیا اتنی مختصر مدت میں فتح و شکست کا اصول، ہرن اور شیر کی فطرت کا
 قانون بدل جائے گا؟ اگر تجھے یقین ہے کہ رات بھر کی خوشامد سے صبح کو
 قسمت تیری مدد کے لیے آمادہ ہو جائے گی۔ تو اچھا۔ حقائق زندگی کی اس
 آخری کوشش کے لیے تجھے کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔ (سینے سے اٹھ کر)
 مرد کا زیور بہادری اور بہادری کا زیور رحم ہے۔

(خنجر پھینک دیتا ہے)

تیسرا ایکٹ - پانچواں سین

ہومان، بارمان کا خیمہ

ہومان : جس طرح فاتح ظلت، آفتاب کی نو طلوع کرنیں شب کی حدود حکومت میں داخل ہو کر تاریکی کو منتشر و مغلوب کر کے رفتہ رفتہ فضا کی سلطنت پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ اسی طرح ہزیمت خوردہ ایران بھی سہراب کی عسکری طاقت کا اقتدار اور اس کے جہور و بسالت کی جہانگیری تسلیم کر چکا تھا۔ لیکن اس کی طفلانہ حرکت نے حال کی فتوحات اور مستقبل کے توقعات، حاصل شدہ اور غیر حاصل شدہ ہر شے اور ہر امید کو رائیگاں کر دیا۔

بارمان : وہ اس حقیقت سے لاعلم ہے کہ ناپختہ عقل کی خامی سے انسان زندگی کی جس غلطی کو سلی اور ناقابل التفات سمجھتا ہے۔ وہی حقیر غلطی ایک روز ہیبت ناک تباہیوں کا سنگ بنیاد اور عظیم الشان غم انگیز نتائج کی آفرید گار ثابت ہوتی ہے۔

ہومان : جس کا جوش جوان اور تجربہ بچہ ہے — جس کا بازو طاقت ور اور عقل کمزور ہے۔ وہ دنیا کو فتح کر سکتا ہے، دنیا پر حکومت نہیں کر سکتا۔

بارمان : قبضے میں آئے ہوئے شیر کو دوبارہ حملہ کرنے کے لیے آزاد کر دینا، یہ سہراب کی ایسی خونخاک غلطی ہے، کہ اس غلطی پر عقل باختہ دیوانے بھی افسوس کرتے ہوں گے۔

ہومان : اور اس احمقانہ غلطی کو وہ بہادرانہ رحم کہتا ہے۔

بارمان : جنگ کیا ہے؟ قتل، خون، موت کی نمائش — اس لیے جنگ خود ایک بے رحمی ہے — بے رحمی کی سلطنت میں رحم کے قانون پر عمل نہیں ہوتا۔

ہومان : یہ اُس کی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ جو فتح، طاقت اور تلوار سے حاصل نہ ہو سکی وہ رستم نے عقل کے زور اور فریب کے حربے سے حاصل کر لی۔

بارمان : تو اب کیا کرنا چاہیے؟ ہمارے بادشاہ افراسیاب کی آرزو اور ہماری کوشش برباد ہوا چاہتی ہے۔

ہومان : چلو سہراب کو اس غلطی پر شرمندہ کریں۔ اس کی روح میں ایک نئی روح پھونکیں۔ اس کے دل کی نیکی کو عداوت سے اور رحم کے جذبے سے بدل دیں۔ اگر ہمارے جھنجھوڑنے سے سہراب کی سوئی ہوئی سمجھ جاگ اٹھی تو کل کا دن رستم کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔

(دونوں جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ - چھٹا سین

میدان جنگ

(رستم اداس چہرے اور غمگین دل کے ساتھ مایوس نگاہوں سے
آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے)

رستم : پردردگار۔ میں نے کبھی تیرے تہر و غضب کو حقیر نہیں سمجھا۔ کبھی تیری
طاقت کے سامنے اپنی فانی طاقت کا غرور نہیں کیا۔ پھر اس ذلت کی شکل
میں تو نے مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے؟ — اے درد مندوں کی
دوا، اے کمزوروں کی قوت، اے ناامیدوں کی اُمید۔ میں نے کل ساری
رات تیرے حضور میں سجدہ ہائے نیاز کے ساتھ آنسو بہا کر مدد کے لیے
التجا کی ہے۔ اپنے عاجز بندے کی التجا قبول کر۔ اس بڑھاپے میں دنیا کے
سامنے میری شرم رکھ اور ایک بار میری جوانی کا زور و جوش مجھے دوبارہ
واپس دے دے۔

عطا کر دے وہی طاقت جو اک دن تھی مرے بس میں
جوانی کا لبو پھر جوش مارے میری نس نس میں
تری قدرت پلٹ سکتی ہے سارے کارخانے کو
پھر اک دن کے لیے تو بھیج دے پچھلے زمانے کو

(سہراب کا داخلہ)

سہراب : صبح ہوگئی۔ ممکن ہے کہ آج کی صبح اس کی زندگی کی شام ثابت ہو۔ نہ جانے

کیا سبب ہے کہ اس کی موت کا خیال آئے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ (رستم کو دیکھ کر) تو آگیا۔ کیا جنگ کے خارے کی پہلی ہی چوٹ سے تیری نیند ٹوٹ گئی؟

رستم : بہادر اپنا وعدہ نہیں بھولتا۔ میں آدھی رات سے صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

سہراب : آج لڑائی کا دوسرا دن ہے۔ جانتا ہے اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا؟

رستم : ہم دونوں میں سے ایک کی موت۔

سہراب : شیر دل بوڑھے۔ میرا دل تیری موت دیکھنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ ایک

غیبی آواز بار بار مجھے اس جنگ سے روک رہی ہے۔ اگر ایران کی گود بہادر

فرزندوں سے خالی نہیں ہے۔ تو جا۔ واپس جا۔ اور اپنے عوض میں کسی اور

ایرانی دلیر کو بھیج دے۔ میں تجھے زندگی اور سلامتی کے ساتھ لوٹ جانے کی

اجازت دیتا ہوں۔

رستم : کل کی اتفاقی فتح پر غرور نہ کرو۔ ہر نیا دن انسان کے لیے نئے انقلاب

لے کر آتا ہے۔ تقدیر کا پھیپہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں گھومتا ہے۔

گھڑی بھر میں بدلنا ہوگا تجھ کو پھر بن اپنا

منگا کر پاس رکھ لے جنگ سے پہلے کفن اپنا

(جنگ شروع ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سہراب ہاتھ روک

لیتا ہے)

سہراب : ٹھہر۔ آج میں تجھ میں نیا جوش اور نئی قوت دیکھ رہا ہوں۔ جواں ہمت

بوڑھے، مجھے پھر شک ہوتا ہے کہ تو رستم ہے۔ میں تیری عزت کا واسطہ اور

تیری بہادری کی دہائی دے کر ایک بار پھر تیرا نام پوچھتا ہوں زور سے

نہیں، منت سے۔ غرور سے نہیں، عاجزی سے۔

رستم : تو میرا نام ہی جانا چاہتا ہے۔ تو سن۔ میرا نام ہے.....

سہراب : (خوشی کی گھبراہٹ سے) رستم؟

رستم : نہیں سہراب کی موت۔

رستم سہراب

سہراب : افسوس! تو نے میرے رستم کی قدر نہ کی۔

(بھر جگ ہوتی ہے۔ رستم سہراب کو گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے)

رستم : ۔

بس اسی ہمت اسی طاقت پہ تھا اتنا غرور
تو کوئی شیشہ نہ تھا، کیوں ہو گیا پھر چور
کیا ہوا زور جوانی، اٹھ، اجل ہے گھات میں
دیکھ لے اب کس قدر قوت ہے بوڑھے ہاتھ میں

(سہراب کے سینے میں فخر بھونک دیتا ہے)

سہراب : آہ اے آنکھو، تمہارے نصیب میں باپ کا دیدار نہ تھا — کہاں ہو، پیارے
باپ کہاں ہو؟ آؤ۔ آؤ کہ مرنے سے پہلے تمہارا سہراب تمہیں ایک بار دیکھ
لے۔ ۔

کیا خبر تھی کہ بکڑ جائے گی قسمت اپنی
آخری وقت دکھا دو مجھے صورت اپنی

رستم : کیا اپنی جوانی کی موت پر ماتم کرنے کے لیے اپنے باپ کو یاد کر رہا ہے؟
— اب تیرے باپ کی محبت، اس کی دعا، اس کے آنسو، اس کی فریاد، کوئی
تجھے دنیا میں زندہ نہیں رکھ سکتی۔ ۔

مرہم کہاں جو رکھ دے دل پاش پاش پر
آیا بھی وہ تو روئے گا بیٹے کی لاش پر

سہراب : بھاگ جا۔ بھاگ جا۔ اس دنیا سے کسی دوسری دنیا میں بھاگ جا۔ تو نے
سام و نرمیان کے خاندان کا چراغ بجھا دیا ہے — تاریک جنگلوں میں،
پھاڑوں کے غاروں میں سمندر کی تہ میں، تو کہیں بھی جا کر چھپے۔ لیکن
میرے باپ رستم کے انتقام سے نہ بچ سکے گا۔

رستم : (چوک کر کھڑا ہو جاتا ہے) کیا! کیا!!! — تو رستم کا بیٹا ہے؟

سہراب : ہاں۔

رستم : تیری ماں کا نام؟

سہراب : تھیند۔

رستم : تیرے اس دعوے کا ثبوت؟

سہراب : اس بازو پر بندھی ہوئی میرے باپ رستم کی نشانی۔

رستم : جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔ تو دھوکا دے رہا ہے۔ مجھے پاگل بنا کر اپنے قتل کا

انتقام لینا چاہتا ہے۔ (گھبراہٹ کے ساتھ سہراب کے بازو کا کپڑا پھاڑ کر

اپنا دیا ہوا مہرہ دیکھتا ہے) وہی مہرہ۔ وہی نشانی (سر پیٹ کر) کیا کیا!۔ کیا

کیا!!! اندھے، پاگل، جلا، یہ کیا کیا!!! — شیر جیسا خوں خوار، بھیڑیے جیسا

ظالم، رچھ جیسا موذی حیوان بھی اپنی اولاد کی جان نہیں لیتا۔ لیکن تو انسان

ہو کر حیوان سے بھی زیادہ خونی اور جہنم سے بھی زیادہ بے رحم بن گیا۔

خون میں ڈوبا ہے وہ جس سے مزہ جینے میں تھا

دل کے بدلے، کیا کوئی پتھر ترے سینے میں تھا

توڑ ڈالا اپنے ہی ہاتھوں سے، او ظالم اُسے

تیرا نقشہ، تیرا ہی چہرہ جس آئینے میں تھا

سہراب : فتح مند بوڑھے، تو رستم نہیں ہے۔ پھر میری موت پر خوش ہونے کے بدلے

اس طرح کیوں رنج کر رہا ہے؟

رستم : (رو کر) اس دنیا میں رنج اور آنسو، رونے اور چھاتی پینے کے سوا اب اور

کیا، باقی رہ گیا!!! میں نے تیری زندگی تباہ کر کے اپنی زندگی کا ہر ایک عیش

اور اپنی دنیا کی ہر ایک خوشی تباہ کر دی۔ مجھ سے نفرت کر، میرے منہ پر

تھوک، مجھ پر ہزاروں زبانوں سے لعنت بھیج۔

نفاقاں ہوں، حسرت و ماتم ہوں، سر سے پاؤں تک غم ہوں

میں ہی جینے کا قاتل ہوں، میں ہی بد بخت رستم ہوں

رستم سہراب

(سہراب کے پاس ہی زمین پر گرنا ہے۔ سہراب اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چھاتی سے لپٹ جاتا ہے)

سہراب : باپ۔ پیارے باپ۔

رستم : ہائے تو نے الفت سے، نرمی سے، منت سے، کتنی مرتبہ میرا نام پوچھا۔ اس محبت و عاجزی کے ساتھ پوچھنے پر لوہے کے کھڑے میں بھی زبان پیدا ہو جاتی پھر بھی جواب دینے کے لیے مجبور ہو جاتا۔ لیکن اس دو روزہ دنیا کی جھوٹی شہرت اور اس فانی زندگی کے آبی غرور نے میرے ہونٹوں کو لپٹنے کی اجازت نہ دی۔ میرے بچے، میری تہینہ کی نشانی۔

کس جگہ بے رحم اجل سے میں نہاں رکھوں تجھے
آنکھ میں، دل میں، کلیجے میں، کہاں رکھوں تجھے
بس نہیں انسان کا چلتا، فتا و فوت سے
کیا کروں۔ کس طرح تجھ کو چھین لوں میں موت سے

سہراب : ہومان۔ بارمان۔ جیمیر، سب نے مجھے دھوکا دیا۔ باپ نہ رو۔ میری موت کو خدا کی مرضی سمجھ کر صبر کرو۔

مل گئی مجھ کو جو قسمت میں سزا لکھی تھی
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کی قضا لکھی تھی

رستم : جب تیری ناشاد ماں، بال نوجہتی، آنسو بہاتی، چھاتی جھپٹی، ماتم اور فریاد کی تصویر بنی ہوئی سامنے آکر کھڑی ہوگی۔ اور پوچھے گی کہ میرا لاڈلا سہراب، میرا بہادر بچہ، میری ککھ سے پیدا ہونے والا شیر کہاں ہے؟ تو اپنا ذلیل منہ، دونوں ہاتھوں سے چمپا لینے کے سوا، اسے کیا جواب دوں گا۔ کن لفظوں سے اس کے ٹوٹے ہوئے دل اور زخمی کلیجے کو تسلی دوں گا۔

سنوں گا ہائے کیسے؟ ماما کی اس دہائی کو
کہاں سے لاؤں گا، مانگے گی جب اپنی کمائی کو

تھیں کس طرح انہیں گی مجھ قسمت کے بیٹے کی

دکھاؤں گا میں کن ہاتھوں سے ماں کو لاش بیٹے کی

سہراب : پیارے باپ۔ میری بد نصیب ماں سے کہنا کہ انسان سب سے لڑ سکتا ہے۔
قسمت سے جنگ نہیں کر سکتا۔ آہ۔

(رستم کی گود سے زمین پر گر کر آنکھیں بند کر لیتا ہے)

رستم : یہ کیا!۔ یہ کیا!!۔ میرے بیچ، آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ کیا خفا ہو گئے۔
کیا ظالم باپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔۔۔ یہ موت کا گہوارہ، یہ خون
میں ڈوبی ہوئی زمین، پھولوں کا بستر، ماں کی گود، باپ کی چھاتی نہیں ہے۔
پھر تمہیں کس طرح نیند آگئی؟۔

میرے بیچ یوں نہ جا، مجھ کو تڑپتا چھوڑ کے
میرا دل، میرا جگر، میری کمر کو توڑ کے
ہائے کیا کیا آرزو تھی، زندگانی میں تجھے
موت آئی پھولتی پھلتی جوانی میں تجھے

سہراب : ماں۔ خدا۔ تمہیں۔ تسلی دے۔

رستم : اور۔ اور۔ بیٹا بولو، بولو۔ چپ کیوں ہو گئے؟ آہ، آہ۔ اس کا خون
مرد ہو رہا ہے۔ اس کی سانسیں ختم ہو رہی ہیں۔۔۔ اے خدا۔ اے کریم و
رحیم خدا۔ اولاد باپ کی زندگی کا سرمایہ اور ماں کی روح کی دولت ہے۔ یہ
دولت محتاجوں سے نہ چھین۔ اپنی دنیا کا قانون بدل ڈال۔ اس کی موت
مجھے اور میری باقی زندگی اسے بخش دے۔ موت۔ موت۔ تو زال و روداہ
کے گھر کا اجالا، میرے بڑھاپے کی امید، میری تہینہ کا بولتا کھیلتا ہوا کھلونا
کہاں لیے جا رہی ہے؟۔ دیکھ میری طرف دیکھ۔ میں نے بڑے بڑے
بادشاہوں کو تاج و تخت کی بھیک دی ہے، آج ایک فقیر کی طرح تجھ سے
اپنے بیٹے کی زندگی بھیک مانگتا ہوں۔۔

رستم سہراب

پھینک دے جھولی میں تو۔ میرے گل شاداب کو
ہاتھ پھیلائے ہوں میں دے دے مرے سہراب کو

سہراب : (آنکھیں بند کیے ہوئے) دنیا — رخصت — خدا —

(سہراب مرجاتا ہے)

رستم : آہ۔ جوانی کا چراغ آخری پچکی لے کر بجھ گیا — بے رحم موت نے میری
امید کی روشنی لوٹ لی — اب لاکھوں چاند، ہزاروں سورج مل کر بھی میرے
غم کا اندھیرا دور نہیں کر سکتے۔ آسمان ماتم کر، زمین چھاتی پیٹ۔ درختو،
پہاڑو، ستارو ٹکرا کر چور چور ہو جاؤ — آج ہی زندگی کی قیامت ہے۔ آج
ہی دنیا کا آخری دن ہے۔ زندگی! دنیا!! — کہاں ہے زندگی؟ — کہاں ہے
دنیا؟ — زندگی سہراب کے خون میں اور دنیا رستم کے آنسوؤں میں ڈوب
گئی۔ (دیوانوں کی طرح پکارتا ہے) سہراب — سہراب — سہراب —

(غش کھا کر گر پڑتا ہے سین بدل کر بہشت ہو جاتا ہے فرشتے
آسمان سے سہراب کی لاش پر پھول برساتے ہیں)

(پردہ)

— ختم —

